

# بیوٹ

علیم الحق حقّی



PDFBOOKSFREE.PK



## پیش لفظ

”بول“ پیش خدمت ہے۔ امید ہے کہ اسے بھی آپ کی پسندیدگی حاصل ہوگی۔ یہاں یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اسے میں نے Paul Gallico کے ناول The Foolish Immortals سے ماخوذ کیا ہے۔ مگر کردار نگاری اور ماحول نگاری میں جو عرق ریزی برتی گئی ہے، اسے آپ سراہے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔ اصل کہانی میں تبدیلیاں بھی بہت زیادہ کی گئیں ہیں۔ مختصر یہ کہ میں نے اپنے طور پر کہانی کو اصل سے آگے لے جانے کی کوشش کی ہے۔ میرے خیال میں کہانی کو ماخوذ کرنے والے کے لئے یہ کوشش ضروری ہے۔ ورنہ ماخوذ کرنے کا فائدہ؟

آپ سب جانتے ہیں کہ میں نے تراجم بھی بہت کئے ہیں اور بہت محبت سے کئے ہیں۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں جن کا کام ترجمے کے بغیر چلتا بھی نہیں اور جو ترجمے کو باعث شرمندگی بھی سمجھتے ہیں۔ میں نے ترجمے کو ہمیشہ بڑا کام سمجھ کر کیا ہے۔ کوئی انگریزی کہانی جسے پڑھ کر مجھے روحانی خوشی حاصل ہو، میرا جی چاہتا ہے کہ میں اسے بہت اچھے روپ میں اپنے اُن لاکھوں قارئین تک بھی پہنچاؤں، جو ترجمہ نہ ہونے کے باعث اس خوبصورت کہانی سے محروم رہیں گے۔ خاص طور پر وہ مغربی کہانیاں، جن میں مقصدیت اور روح مشرق کی ہو، مجھے ترجمے پر بہت زیادہ اکساتی ہیں۔ پچھلے چار برس سے میں نے ترجمہ بالکل نہیں کیا ہے۔ مگر ارادہ ہے کہ طبع زاد کہانیوں سے فرصت نکال کر کچھ شاہکار مغربی کہانیاں آپ تک پہنچائی جائیں۔

کتاب کے متعلق آپ کی آراء اور مشوروں کا انتظار رہے گا۔ ایک استدعا اور ہے۔ اپنی دعاؤں میں ہمیشہ مجھے یاد رکھیں۔ احسان مند رہوں گا۔

والسلام

آپ کا اپنا  
علیم الحق حق

اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر دس روپے کے اکلوتے نوٹ کو یوں پیار سے چھپھپھایا، جیسے اسے جیب میں رہنے کی تلقین کر رہا ہو۔ اس کا تجربہ تھا کہ پیسے کی بہت سی ٹانگیں ہوتی ہیں اور وہ بہت تیزی سے بھاگتا ہے..... بلکہ شاید اس کے پر ہوتے ہیں اور وہ اڑ جاتا ہے۔ کم از کم اس کی جیب میں آنے کے بعد تو یہی ہوتا تھا۔ ظاہر ہے، ایسے میں اکلوتے نوٹ کی اہمیت اور زیادہ ہو جاتی ہے۔

لمباری کے ہوٹل میں داخل ہو کر وہ آخری میز کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں شور نسبتاً کم ہوتا تھا اور سکون سے بیٹھ کر سوچنے کے امکانات خاصے روشن ہوتے تھے۔ یہ بات نہیں کہ شور میں سوچنا اس کے لیے ناممکن ہو، شور و غل کا تو وہ عادی تھا۔ ہوٹل میں عموماً ہر وقت مچھلی مارکیٹ کی سی کیفیت رہتی تھی۔ باہر ٹریفک کا زبردست شور، اندر کے زبردست تر شور میں خود کو منوانے کی ناکام کوشش کرتا رہتا تھا اور وہ اس کا عادی تھا، اس کے باوجود سوچ سکتا تھا لیکن معاملہ زیادہ سنگین ہوتا تو اسے نسبتاً سکون سے سوچنے کی ضرورت محسوس ہوتی۔ ایسے موقع پر وہ ہوٹل کی آخری میز کا رخ کرتا۔

اس کے بیٹھتے ہی ہوٹل کا بیرا ”شم مس“ لپک کر اس کی طرف آیا۔ نام تو اس کا شمس تھا لیکن ہوٹل کے مالک کی دیکھا دیکھی سب اسے اسی نام سے پکارتے تھے۔ ”جوزف بابو، ناشتا کرے گا؟“ شمس نے پوچھا۔

”نہیں بابا! ہم آدھا ناشتا نہیں کر سکتا۔ توچھ میں سے تین نقطے غائب کر کے مزہ ہی خراب کر دیتا ہے۔“

جواب میں شمس نے مارے حیرت کے بھاڑ سے منہ کھول دیا۔ یہ روزانہ کا معمول تھا۔ اُس نے اب تک آدھے ناشتے کا تصور قبول نہیں کیا تھا اور شمس کی سمجھ میں تین نقطوں کا فرق نہیں آتا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ شمس کا کھلا ہوا منہ از خود بند نہیں ہو گا اور گاڑی بڑھانے کے

لیے اس کا منہ بند ہونا ضروری تھا چنانچہ اس بار اس نے بڑی شائستگی اور وقار سے کہا ”ابھی ڈٹ کر نہ ماری روٹی کھائی ہے میں نے۔ چائے لے آؤ۔“ یہ کہہ کر اس نے پیٹ پر ہاتھ پھیرا جس کے نتیجے میں خالی پیٹ کی آگ اور بھڑک اٹھی۔

”ایک سپاوری“ شمس نے معمول کے مطابق چیخ کر پشادری چائے کا آرڈر دیا اور ایک طرف چلا گیا۔

اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر نوٹ کو پھر پھتہ پھتایا۔ وہ نوٹ اس کی پچھلی کمائی کی آخری یادگار تھا جو اس نے ایک ہفتہ پہلے کی تھی۔ یہ خیال آتے ہی اسے کیترین یاد آگئی..... خوب صورت امریکن لڑکی جس کا وہ زبردستی گائیڈ بن بیٹھا تھا۔

اس کی ناک عموماً بند رہتی تھی۔ ہمانہ نزلے کا تھا۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ بدبودار ماحول میں رہنے والے نزلے کا شکار ہو ہی جاتے ہیں..... بلکہ تمام عمر رہتے ہیں۔ یہ بھی سمجھوتے کی ایک شکل ہے۔ خدا نے انسان کو پانچوں حواس کی شکل میں بہت بڑی نعمت دی ہے۔ اب اگر قوتِ شامہ کے لیے خوشبو میسر نہ ہو تب بھی کوئی بات نہیں کہ انسان طبعاً خوش امید بھی ہوتا ہے لیکن جب قوتِ شامہ کے لیے دھوئیں اور طرح طرح کی بدبوؤں کے سوا کچھ بھی میسر نہ ہو تو ایسے میں قوتِ شامہ سے دست برداری ہی بہتر ہے۔ سو اس کی ناک بھی ہمیشہ بند ہی رہتی تھی۔ مگر کہیں سے پیسہ ملنے کے امکان کی خوشبو آئے تو وہ اسے بہت دور سے سونگھ لیتا تھا۔ اس روز بھی یہی ہوا۔ وہ امریکن لڑکی صدر کے ایک فٹ پاتھ پر سہمی کھڑی تھی۔ انداز سے صاف ظاہر تھا کہ سڑک پار کرنا چاہتی ہے لیکن ٹریفک کا ریلہا رکھنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ وہ بے چاری حیرت سے لوگوں کو سڑک پار کرتے دیکھ رہی تھی۔ کبھی کبھی کسی کی تھلید میں ایک قدم آگے بڑھتی مگر فوراً ہی گھبرا کر پیچھے ہٹ آتی۔ لوگ سڑک پار کرتے رہے اور وہ حیرت اور بے بسی سے انہیں دیکھتی رہی۔

لڑکی کو دیکھتے ہی اس کے نتھنے پھڑکے اور نئے نئے کرارے ڈالروں کی مہک اس کے وجود میں اتر کر اس کے مشام جاں کو معطر کر گئی حالانکہ اس نے کبھی ڈالر کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ لڑکی کے ہینڈ بیگ میں ڈالرز نہیں ہوں گے۔ لیکن یہ تو سیدھی سی بات ہے کہ امریکیوں کے وجود سے ڈالر کی ”انگریزوں کے پاس سے پاؤنڈ کی اور جاپانیوں کے پاس سے یین کی ہی خوشبو آئے گی۔ البتہ ”ملکیوں“ کی بات اور ہے۔ کسی ہم وطن کے وجود سے اس نے روپے کی خوشبو پھوٹی کبھی محسوس نہیں کی

تھی۔ ان کے جسموں سے پسینے اور خون کی بو یا امپورٹڈ سینٹ کی مہک آتی تھی۔ ڈالروں کی خوشبو محسوس کرتے ہی وہ دیوانہ ہو گیا۔ وہ تیزی سے لڑکی کی طرف بڑھا۔ ”ایکس کیوز می“ اس نے بے حد شائستگی سے کہا ”آپ کچھ پریشان معلوم ہو رہی ہیں۔ میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا ہوں؟“

لڑکی نے بے حد حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ خوش قامت اور وجیہہ تھا۔ لباس صاف ستھرا تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ شستہ انگریزی بول رہا تھا۔ ”مجھے سڑک پار کرنی ہے۔“ لڑکی نے کہا۔ اس کے لمبے نے اس کے اندازے کی تصدیق کر دی کہ وہ امریکن ہے ”یہاں کا سسٹم میری سمجھ میں نہیں آتا۔ ٹریفک سنگل تو ہے مگر روشنی نہیں ہے“ لڑکی نے مزید کہا۔

”خراب ہو گیا ہوگا“ اس نے بے پروائی سے کہا ”ہوتا ہی رہتا ہے۔“

”پھر بھی ڈرائیو کرنے والوں کو ہی دوسروں کا خیال کرنا چاہئے۔ اس طرح کوئی حادثہ بھی ہو سکتا ہے۔“

”یہاں دوسروں کا خیال رکھنے کا رواج نہیں۔ یہ دشوار بھی ہے اور پیچیدہ بھی۔ یہاں ہر شخص اپنا خیال خود رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کام چل رہا ہے۔ رکتا نہیں۔ حادثے صرف اس صورت میں ہوتے ہیں کہ کوئی اپنا خیال رکھنے کے بجائے دوسروں کا خیال رکھنے کی حماقت کرے۔“

”اور ٹریفک پولیس بھی کہیں نہیں ہے“ لڑکی نے اعتراض کیا۔

”ایسی بات نہیں“ اس نے جلدی سے صفائی پیش کی ”ٹریفک پولیس کے چند نمائندے اس طرف شکار کی تلاش میں کھڑے ہوں گے۔ وہ ٹریفک قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کی گاڑیاں روک کر ان کا غیر سرکاری چالان کر رہے..... میرا مطلب ہے، ذاتی جرمانہ وصول کر رہے ہوں گے۔ ابھی آپ دیکھئے گا، ان کے گاڑیاں روکنے کی وجہ سے ٹریفک جام ہو جائے گا اور آپ بڑی آسانی سے سڑک پار کر لیں گی۔“

”میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا ہے.....“

”کیسے آسکتا ہے؟ ہم لوگ لکیر کے فقیر نہیں۔ تخلیقی اچھ رکھتے ہیں۔ ہماری پولیس نے عوام کی فلاح و بہبود کے لیے نئے طریقے وضع کئے ہیں۔“

لڑکی نے اسے بہت غم سے دیکھا ”آپ عجیب ہیں..... دلچسپ اور عجیب!“

”ہم سب عجیب ہیں..... دلچسپ اور عجیب!“ اس نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

”آپ مسلم ہیں؟“ لڑکی نے پوچھا۔

وہ پریشان ہو گیا۔ ”پھر آئی مصیبت‘ اس نے سوچا۔ اب کیا جواب دوں؟“ لڑکی نے خود ہی اس کی مشکل حل کر دی ”مجھے مسلم بہت اچھے لگتے ہیں۔“

”میں مسلم ہوں“ اس نے جلدی سے کہا۔

”اوہ! میں کیتھرین میٹرز ہوں۔ امریکا سے آئی ہوں۔“

”اور میں یوسف بن داؤد ہوں۔ انگریزی میں آپ جوزف ڈیوڈسن کہہ لیں۔“

”مجھے آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔ آپ بہت اچھی انگریزی بولتے ہیں۔“

اس کا حوصلہ بڑھ گیا۔ نوٹ کپے ہونے والے تھے ”مجھے بھی خوشی ہوئی آپ سے

مل کر“ اس نے لہجے میں تپاک سموتے ہوئے کہا ”آپ سڑک کے اس طرف کہاں جا رہے ہیں۔“

”کچھ شاپنگ کرنی ہے“ لڑکی نے بوہری بازار کی طرف اشارہ کیا۔

”ارے..... اکیلی تو آپ لٹ جائیں گی۔ ہمارے دکان دار سیاحوں کی کھال

کھینچنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ چلئے میں آپ کو شاپنگ کرا دوں“ اس نے بے جا خلوص سے کہا۔

”تھینک یو مسٹر ڈیوڈسن“ کیتھرین نے کہا۔ پھر چونک کر بولی ”ارے‘ ٹریفک

واقعی جام ہو گیا! آپ نے ٹھیک کیا تھا۔“

اس نے فاتحانہ نظروں سے کیتھرین کو دیکھا ”میں نے کہا تھا نا۔ اب چلئے“ اس نے

نہایت بے تکلفی سے اس کا ہاتھ تھاما اور کاروں کے درمیان دوڑ لگا دی۔ کیتھرین کا ہاتھ تھامتے ہی اس کے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ ڈالروں کی خوشبو اور تیز ہو گئی تھی۔

”اب بتائیے..... میڈم“ سڑک پار کرنے کے بعد اس نے کیتھرین سے پوچھا۔

”اوہ نو‘ میں مس ہوں“ کیتھرین نے جلدی سے کہا۔

”اوکے‘ مس کیتھرین‘ یہ بتائیں کہ آپ کو خریدنا کیا ہے؟“

جواب میں کیتھرین نے جو تفصیلی تقریر کی‘ اس کا حاصل یہ تھا کہ وہ ایسے کڑھال

والے سوٹ خریدنا چاہتی ہے جن میں شیشے بھی جڑے ہوتے ہیں۔ وہ اسے ایک دکان

لے گیا۔ دکان دار ان کے سامنے بچھ گیا۔ اس نے بے شمار سندھی کڑھائی والے سوٹ

کیتھرین کے سامنے ڈال دیے۔ کیتھرین کا چہرہ تمنا نے لگا۔ وہ اس بچے کی طرح مسرت

اور بیجان میں شرابور تھی جسے بہت سارے من پسند کھلونے نظر آ گئے ہوں اور اسے

میں سے کوئی ایک منتخب کرنے کی اجازت ہو۔ وہ بڑی دشواری میں پھنس گئی تھی۔

”ایک آپ پسند کریں“ کیتھرین نے فرمائش کی۔

اس نے جھٹ ایک سوٹ چن لیا۔ ایک سوٹ کیتھرین نے بھی پسند کر لیا ”ہاؤ

چ؟“ کیتھرین نے دونوں سوٹ ایک طرف رکھ کے دکان دار سے پوچھا۔

یوسف نے پہلے ہی مرحلے میں مداخلت سے گریز کیا۔ اپنی اہمیت اور افادیت بھی تو

ثابت کرنا تھی۔ دکان دار نے غور سے اسے دیکھا لیکن وہ اور کپڑوں کی طرف متوجہ تھا

”نو سو روپے“ دکان دار نے دھڑلے سے کہا۔

کیتھرین نے احتجاج کیا کہ قیمت زیادہ ہے۔ دکان دار سوٹوں کی تعریف میں رطب

اللسان ہو گیا۔ آخر میں اس نے پچاس روپے کم کرنے کا مژدہ سنایا۔ کیتھرین بینڈ بیگ کھول

کر رقم نکال رہی تھی کہ یوسف نے اس کا ہاتھ تھام لیا ”چلیں..... کوئی اور دکان

دیکھتے ہیں۔“

دکان دار بوکھلا گیا ”بات تو سنئے سرا“

”یہ میری دوست ہے“ یوسف نے دکان دار سے اردو میں کہا۔ ”تم شاید مجھے

گائیڈ سمجھ رہے ہو۔“

”ٹھیک ہے سرا! چھ سو لگا دوں گا“ آپ کی خاطر۔“

”میں اسی شہر کا رہنے والا ہوں دوست“ اس نے دکان دار کی آنکھوں میں آنکھیں

ڈال کر جھمتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”اچھا صاحب! پانچ سو دے دیجئے۔“

اس نے کیتھرین کا ہاتھ تھام لیا ”چلئے! اس بازار میں درجنوں دکانیں ہیں۔“

”سنئے تو۔“ دکان دار نے بڑی مظلومیت سے پکار ”آپ ہی بتا دیں کیا دیں گے؟“

”ڈھائی سو۔“ اس نے سرد لہجے میں کہا۔

”اتنا تو پڑتا بھی نہیں ہے صاحب۔“

”میں جانتا ہوں کہ اس میں بھی تمہیں 70 روپے بچ رہے ہیں۔“

دکان دار گڑگڑانے لگا۔ بہر حال خاصی جت کے بعد 280 روپے میں سودا پٹ

گیا۔ اس نے کیتھرین سے تین سو روپے لے کر دکان دار کو دیے۔ کیتھرین حیرت سے

اسے دیکھ رہی تھی۔ پھر جب اس نے دکان دار سے بیس روپے لے کر اسے دیے، تو وہ اور

حیران ہوئی۔ وہ تشکر آمیز نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔



”پچاس روپے ہوں گے صاحب۔“

اس بار اس نے حجت نہیں کی۔ ضرورت بھی نہیں تھی حجت کی۔ وہ پچھلے کارکردگی میں اپنا سکہ بجا چکا تھا۔ اب کسی ہم وطن کو بھی کچھ ڈالر مل جائیں گے تو کیا حرج ہے۔

وہ تین گھنٹے گھومتے رہے۔ اس نے سیر کرانے کا حق ادا کر دیا۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر کیتھرن، کیتھی بن چکی تھی۔ یہ اس کا کمال تھا۔ بے تکلف ہونے میں اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ خود کو دنیا کا بہترین سلازمین سمجھتا تھا اور یہ حقیقت تھی کہ وہ اس چیز تک کے دام وصول کرنے کی اہلیت رکھتا تھا، جس کا کوئی وجود نہ ہو۔ زندگی بھی اس کے نزدیک ایک طرح کا کاروبار تھی..... دکھ بیچنا اور آسائش خریدنا!

ان تین گھنٹوں میں اس نے کیتھی کو کلفٹن کا ہر رخ دکھا دیا، مزار پر دم لگاتے ہوئے ملکوں سے میٹھے پانی کے چشمے تک کیتھی بہت متاثر ہوئی۔ خاص طور پر سمندر کے سینے سے ابلنے والے میٹھے پانی کے چشمے سے۔

”اگر کچھ دھوئیں وغیرہ کا شوق ہو تو اس کا بندوبست بھی ہو سکتا ہے“ اس نے بے حد شائستگی سے کہا۔

کیتھی کا چہرہ تھما اٹھا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

واپس آتے ہوئے اس نے کچھ سرمایہ کاری بھی کر ڈالی۔ موٹے کے گجرے خرید کر اس نے اپنے ہاتھوں سے انہیں کیتھی کی بانہوں پر پلیٹ دیا۔ کلائیوں میں موٹے کے کنگن پہنا دیے۔ پھر اس نے کلفٹن بازار سے کوڑیوں اور سسوں کے ہار اور بندے خرید کر کیتھی کو تحفہ پیش کئے۔ کیتھی کی آنکھوں میں چاندنی چمکتے دیکھ کر اسے یقین ہو گیا کہ کچھ دنوں کے لیے زندگی سنور گئی ہے۔

اس رات اگرچہ وہ کم سویا لیکن سکون سے فور اشار ہوٹل کے نرم گرم بستر پر سویا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ امریکی مہمان اس کی میزبانی اور قربت پر مصر تھی۔ مدتوں بعد اسے اچھی شراب بھی ملی۔ جس وقت اس کی آنکھیں بند ہوئیں، وہ ہر طرح کے نشے میں ڈوب کر ابھر چکا تھا۔

صبح کیتھی نے اسے بتایا کہ وہ اس کی وطن واپسی کا دن ہے۔ وہ افسردہ تھی کہ قسمت نے انہیں اتنی دیر سے کیوں ملایا۔ افسوس تو یوسف کو بھی تھا لیکن اس نے حقیقت کو فوراً اور آسانی سے قبول کرنے کا نکتہ بہت پہلے سمجھ لیا تھا۔ کیتھی نے اسے پانچ سو

وہ بازار سے نکل آئے۔ ”اب کیا ارادہ ہے؟“ اس نے کیتھرن سے پوچھا۔

”ہوٹل واپس جاؤں گی۔“

وہ دل ہی دل میں ہنس دیا۔ ”یہ کیسے ممکن ہے کہ شکار ہاتھ سے نکل جائے۔ چاری! کتنے وثوق سے کہہ رہی ہے۔ نہیں جانتی کہ ایسا نہیں ہو گا۔“

وہ ہوٹل مہران کی طرف جانے والی سڑک پر چل دیے۔ راستے میں اس کیتھرن سے پوچھا ”آپ نے یہاں سیر بھی کی؟“

”ہاں۔“ وہ پھر ایکسائینڈ ہو گئی۔

”کلفٹن دیکھا آپ نے؟“

”جی ہاں۔“

”نہیں۔ آپ نے کلفٹن نہیں، سمندر دیکھا ہو گا۔ بابا عبداللہ شاہ غازی“ کے

پر گئی تھیں؟“

وہ نفی میں سر ہلانے لگی۔

”چلئے..... میں سیر کراؤں گا آپ کو۔ مجھ سے بہتر گائیڈ آپ کو اس شہر میں

مل سکتا۔ اس نے زور دے کر کہا۔ یہ جتنا بہت ضروری تھا ورنہ وہ یہ بھی سمجھ سکتی کہ وہ یہ زحمت برائے خلوص کر رہا ہے۔

کیتھرن نے الجھن بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

”گھبرا گئیں؟“ ارے جو آپ کا جی چاہے، دے دیجئے گا میں تو زبردستی کا

ہوں“ اس نے بے حد سچائی میں کہا۔

”نہیں، یہ بات نہیں“ کیتھرن نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”آپ گائیڈ لگتے نہیں

ڈرنے کی کیا بات ہے، آپ نے تو میرے ساڑھے پانچ سو روپے بچائے ہیں۔“

”خیر، چھوڑیے ان باتوں کو۔ ٹیکسی روکتے ہیں۔“

ٹیکسی والے نے پہلے کیتھرن کو اور پھر اسے بغور دیکھا ”اولڈ کلفٹن جا۔

صاب؟“

وہ مسکرا دیا۔ اتنی خوب صورت میم کے ساتھ جانا تو وہیں چاہئے تھا لیکن ڈالر

کی مہک کیتھرن کے وجود کی مہک سے زیادہ مسحور کن تھی اور وہ بھوک کی تشفی پر کا

ترجیح دینے کا قائل تھا۔ پہلے ڈالر..... بعد میں کچھ اور ”نہیں، کلفٹن چلنا ہے

اس نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔

ہے اور جب کسی وجہ سے ادھر ادھر سے پانی میسر آنا موقوف ہو جائے تو یہ جھاڑیاں زمین کے سینے کی انتہائی گہرائی سے اپنے لیے نمی..... یعنی زندگی کھینچ لینے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ انہیں زندگی کی طلب اور موت کا خوف اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ وہ اوپر اٹھنے کی بجائے نیچے پھیلنا زیادہ پسند کرتی ہیں تاکہ زمین سے قریب رہیں، جو ان کے لیے تحفظ کی علامت ہے۔ وہ اپنی جڑیں چھپا کر رکھتی ہیں کہ کوئی انہیں کاٹ نہ سکے۔ ان میں کانٹے ہوتے ہیں تاکہ قریب آنے والے گھبرا کر ہٹ جائیں اور دور رہیں۔ ان کے پھل پھول زہریلے ہوتے ہیں۔ ان سے لکڑی بھی حاصل نہیں کی جاسکتی، وہ بے فیض ہوتی ہیں اور بے فیض رہتی ہیں کیونکہ دنیا میں نقصان انہی کو پہنچتا ہے، جو دوسروں کو فیض پہنچائیں۔ وہ سخت بان ہوتی ہیں، انہیں کانٹے کی کتنی ہی کوشش کر لی جائے، وہ عام طور پر فنا نہیں ہوتیں، ہر آگ آتی ہیں کیونکہ ان کی جڑیں مخفی ہوتی ہیں اور ان میں بقاء کی خواہش اور قوت رافعت کی کوئی کمی نہیں ہوتی۔

یوسف پیدائشی طور پر زندگی کا طالب علم تھا۔ اس نے ابتدا ہی میں دیکھ اور سمجھ یا تھا کہ ایک انسان کے نکتہ نظر سے کائنات کا سرچشمہ اس کی اپنی زندگی ہے۔ سورج، پاند، ستارے، پھول اور خوشبو، سب کچھ اس وقت تک اچھا ہے، جب تک وہ خود موجود ہے۔ وہ موجود نہ ہو، تب بھی یہ سب کچھ یونہی رہے گا لیکن اس کے کس کام کا! لہذا نام، رہب، انفرادیت اور اتنا..... زندگی سے زیادہ اہم کچھ بھی نہیں۔ زندگی نہیں تو کچھ میں۔ سب کچھ زندگی سے ہے۔ یہ سب کچھ سمجھنے کے بعد اس نے پانی کی سی فطرت اپنا لی۔ جیسا دیس ویسا بھیں لیکن کبھی کبھی اس کے اندر کہیں خود سری کی ایک تند لہر اٹھتی، وکھتی..... میں میں ہوں لیکن وہ اسے دبا لیتا۔

اس کی یادداشت کے البم میں پہلی تصویر ماں کی تھی۔ وہ بہت دھندلی تصویر تھی۔ قوش واضح نہیں تھے لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ اس کی ماں ہے۔ اس تصویر پر نظر پڑتے ہی اس کے پیٹ میں اینٹھن سی ہونے لگتی۔ ماں کی یاد سے بھوک کی یاد بھی مشروط تھی۔ وہ اس وقت چار ساڑھے چار سال کا رہا ہوگا۔ وہ فٹ پاتھ پر سوتے تھے۔ پھر ماں نے سنتری سے پارک میں سونے کی اجازت لے لی۔ نرم گھاس کا بستر اسے بہت اچھی طرح یاد تھا۔ اس کے بعد اسے فٹ پاتھ پر سونا کبھی اچھا نہیں لگا۔ پارک میں وہ صرف ایک ہفتہ سو سکے تھے۔

ایک رات ماں کی گھٹی گھٹی چیخ سن کر اس کی آنکھ کھلی، مگر اس نے پوری طرح

روپے دیے اور اس نے بغیر ہچکچائے انہیں قبول کر لیا۔ وہ پوری طرح اس رقم کا مستحق بھی تو تھا۔ اس نے کیتھی کے ساتھ ایئر پورٹ جانے سے معذرت کر لی..... یہ کہہ کر کہ اسے کام پر جانا ہے۔ حالانکہ وہ بے کار تھا۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ وہ بے روزگاری کے باوجود وقت ضائع کرنے کا قائل نہیں تھا..... کم از کم دوسروں کے لیے تو ہرگز نہیں۔

اور اب ایک ہفتے بعد اس کی شاہ خرچی کی وجہ سے اس کی جیب میں ان پانچ سو روپوں کی آخری یادگار بچی تھی..... دس کا اکلوتا نوٹ، جسے وہ بار بار ٹوٹاتا تھا۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ شمس نہ جانے کب اس کے سامنے چائے رکھ گیا تھا۔ اس نے پیالی کو چھوا۔ پیالی بالکل سرد تھی۔ اس نے بڑی بدمرگی سے چائے کو دیکھا جس پر جھلی سی تن گئی تھی۔ اس نے حلق پھاڑ کر شمس کو پکارا۔ ”ابے..... یہ ٹھنڈی چائے رکھ گیا یہاں۔“

”نہیں جوزف بابو.....“

”کواس مت کر، ورنہ ابھی اس میں مکھی مار کر ڈال دوں گا۔ اٹھا اسے اور دوسری چائے لا۔“

شمس نے فوراً ہی پیالی اٹھالی۔ جانتا تھا کہ عافیت اسی میں ہے۔

”اور سن!“ یوسف نے سرگوشی میں کہا ”جب ادھر کرچن لوگ نہ ہوں تو جوزف نہ کہا کر مجھے۔ میرا نام یوسف ہے۔ سمجھا؟“

”سمجھ گیا یوسف بابو!“ شمس نے دانت نکال دیے۔



اس کی پوری زندگی کا احاطہ صرف ایک لفظ کر سکتا تھا۔ جنگ! اس نے عمر کے ہر پل اپنی بھاکے لیے، اپنے وجود کو قائم رکھنے کے لیے جنگ لڑی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے زندگی سے سب کچھ سیکھ لیا تھا، سوائے اخلاقی قدروں کے۔ اس کی دانست میں اخلاقی قدریں جینے میں آدمی کی مدد نہیں کر سکتی تھیں۔ البتہ ان کی مدد سے موت بہ آسانی حاصل کی جاسکتی تھی۔

وہ نشیب میں اگنے والی خود رو جھاڑیوں کی طرح تھا، جنہیں ادھر ادھر سے بہہ کر آنے والا پانی زندگی کی توانائی فراہم کرتا ہے..... خواہ وہ پانی صاف ہو یا گندا۔ عام اور نازک پودوں کو جو پانی مر جھا سکتا ہے، وہ ایسی جھاڑیوں کے لیے زندگی کا پیغامبر ثابت ہوتا

وہ جاتے جاتے بار بار اسے پلٹ کر دیکھتی۔ کڑ پر پہنچتی تو آخری بار پلٹ کر اسے دیکھتی اور پھر نظروں سے اوجھل ہو جاتی۔ اس وقت تک فٹ پاتھ پر چل پھل ہو جاتی۔ کچھ دیر بعد سامنے والی دکانیں بھی کھل جاتیں۔ ان میں ایک کھلونوں کی دکان تھی، جس کے شوکیس میں گڑیاں، موٹر کاریں، ریلیں، ہوائی جہاز اور نہ جانے کیا کیا ہوتا۔ وہ سب چیزیں خود بخود چلتی تھیں، مگر اسے کھلونوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تو لپٹائی ہوئی نظروں سے فٹ پاتھ پر بیٹھے، پھل فروشوں کے ٹوکروں کو تنکا رہتا۔ پھل دیکھ کر اس کے منہ میں پانی بھر آتا اور پیٹ میں ایٹھن ہونے لگتی۔

جب شام کو سورج ڈھل جاتا، دھوپ پیچھے والی اونچی بلڈنگ کو پھلانگ کر پار اتر جاتی اور سڑک پر بتیاں جلنے لگتیں تو ماں واپس آتی..... تھکی تھکی، تھکا تھکا، تھکا تھکا..... ”کیسا ہے میرا بیٹا، میرا یوسف؟“ وہ اس کے رخسار چوم کر پوچھتی۔

”مجھے بھوک لگی ہے ماں۔“ وہ بسور کر کہتا۔

وہ کہتی ”تو نے سلام تو کیا ہی نہیں۔“

اس وقت تک پیٹ کی سرکشی انتہا کو پہنچ چکی ہوتی۔ ”ماں! مجھے کھانا دو۔“ وہ سرکشی سے کہتا۔

”اچھے بچے پہلے سلام کرتے ہیں..... آتے ہوئے بھی اور جاتے ہوئے بھی۔“

”میں اچھا بچہ نہیں، بھوکا بچہ ہوں۔“ وہ تند لہجے میں کہتا۔

ماں ہنس دیتی..... ”بھئی بھئی، پھلکی پھلکی ہنسی۔ وہ سڑک پار کر کے سامنے والے ہوٹل سے کھانا لاتی۔ فٹ پاتھ پر چادر بچھا کے وہ دونوں بیٹھ کر کھانا کھاتے لیکن وہ پھر بھی بھوکا رہ جاتا۔ کھانا اس کی بھوک کے مقابلے میں ہمیشہ کم ہوتا۔ کھانا کھانے کے بعد ماں اسے سلام کے متعلق یاد دلاتی۔ وہ بڑی گرم جوشی سے سلام کرتا۔ اسے پتا ہی نہیں تھا وہ ماں کو نہیں، پیٹ بھرنے والے پاتھ کو سلام کر رہا ہے۔

بھوک مستقل طور پر اس کے ساتھ رہتی۔ صرف اتنی دیر سکون رہتا، جب وہ کھانا کھا رہا ہوتا۔ اس کے فوراً بعد پھر وہی بھوک، جو اس وقت تک اسے کھاتی رہتی، جب تک اسے کھانے کی کوئی چیز نہ ملتی۔ اس نے اپنے طور پر پیٹ کے اندر موجود بھوک کے عفریت کی تصویر بنائی تھی..... نامکمل تصویر! یہ بات طے تھی کہ بھوک کے تیز اور نکیلے بچے بھی ہوتے ہیں اور پیٹ چیر دینے والے دانت بھی۔ وہ یہ کبھی نہ طے کر سکا کہ ان بچوں اور دانتوں کی تعداد کیا ہے۔

انکھیں نہیں کھولیں بلکہ کن انکھیوں سے اس طرف دیکھا۔ ایک شخص ماں سے لڑ رہا تھا۔ اسے مار رہا تھا، ماں ہاتھ پاؤں چلا رہی تھی، چیخنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اس شخص نے ایک ہاتھ سے ماں کا منہ دبوچ رکھا تھا۔

اس کے وجود میں غصے کی لہر اٹھی۔ اس کا جی چاہا کہ اس شخص کا منہ نوچ لے، اسے مارے لیکن وہ جانتا تھا کہ نقصان اسی کا ہو گا۔ وہ شخص اس سے بڑا بھی تھا اور طاقتور بھی چنانچہ وہ بے خبر سا بنا اپنی جگہ لیٹا رہا۔ ماں کی دبی دبی چیخیں بھی دم توڑ گئیں۔ اس شخص کے جانے کے بعد چند لمحے سناٹا رہا۔ پھر ماں دبی دبی، دردناک آواز میں رونے لگی۔ اس کا جی چاہا کہ ماں سے پلٹ جائے، اسے پیار کرے لیکن کسی نامعلوم حس نے اسے بتا دیا کہ بے خبر بنے رہنا ہی ٹھیک ہے۔

اگلی رات ماں نے پھر فٹ پاتھ پر چادر بچھائی۔ اسے بہت برا لگا۔ ”ماں! آج باغ میں نہیں چلیں گے؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں یوسف! ہم یہیں سوئیں گے۔“ ماں نے جواب دیا پھر کچھ توقف کے بعد بولی ”مجھے تو یہاں بھی ڈر لگ رہا ہے۔“

وہ کچھ نہ بولا۔ اسے ماں کے ڈر کی نوعیت کا پوری طرح علم نہیں تھا مگر وہ اس سے کسی حد تک واقف ضرور تھا۔

”کاش! کاش تو جلدی سے بڑا ہو جائے۔“ کچھ دیر بعد ماں نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

اس نے اس لمحے فیصلہ کیا کہ وہ جلد از جلد بڑا ہونے کی کوشش کرے گا۔ بڑا بھی اور طاقت ور بھی۔

ان دنوں وہ ایک ہی چیز سے واقف تھا اور وہ مستقل تھی..... بھوک! ماں صبح سویرے سامنے والے ہوٹل سے چائے لیتی اور کبھی اس میں کڑک ڈبل روٹی اور کبھی پاپے بھگو کر اسے کھلاتی۔ تھوڑا سا خود بھی کھا لیتی۔ کبھی ڈبل روٹی اور پاپے کے لیے پیسے نہ ہوتے تو صرف چائے ہوتی اور کبھی چائے بھی گول ہو جاتی۔ جس روز ایسا ہوتا، ماں اسے بانہوں میں بھینچ بھینچ کر پیار کرتی، اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہوتے۔ اسے ماں کی وہ بے موقع محبت بہت بری لگتی لیکن وہ منہ سے کچھ نہ کہتا۔

ماں ہر صبح اسے ناشتا کرانے اور ناشتا میا نہ ہونے کی صورت میں پیار کر کے کہیں چلی جاتی۔ ماں کی ہدایت تھی کہ وہ اس فٹ پاتھ سے آگے نہ جائے، سڑک پار نہ کرے۔



کبھی کبھی رات کا کھانا بھی غائب ہو جاتا اور اس کے نتیجے میں صبح کی چائے بھی۔ ایسے میں اسے سلام یاد نہ آتا بلکہ ماں پر ایک ناقابل فہم سا غصہ آتا رہتا لیکن جب بھی ایسا ہوتا، ماں دوپہر کو آتی اور اسے کھانا کھلاتی۔ اس روز وہ اسے پیار بھی بہت زیادہ کرتی۔ ہر آنے والے دن اس کی بھوک میں اضافہ ہو جاتا۔

اس نے باپ نام کی کوئی شے کبھی نہیں دیکھی تھی اور یہ اچھا ہی تھا کیونکہ اسے یقین تھا کہ باپ اچھا نہیں ہوتا۔ وہ جب بھی بھوکے ہوتے اور ماں پریشان ہوتی، وہ اس کے باپ کو برا بھلا کہتی، ایسے جیسے وہ اس کے سامنے موجود ہو۔ ”یوسف کے ابا! تم تو سکون سے مر گئے اور اپنی ذمہ داری مجھ پر لا د گئے۔ اب بتاؤ، میں کیا کروں؟ میں تو مر بھی نہیں سکتی اس یوسف کی وجہ سے۔“

یوسف کی سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آتا لیکن اسے اپنے آن دیکھے باپ پر بے تحاشا غصہ آتا۔

ایسے ہی ایک دن، جب رات کا کھانا بھی نہیں ملا تھا، اس نے ماں سے کہا ”مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ کھانا دو مجھے۔“

”تو مجھے کھالے۔“ ماں نے چڑ کر کہا۔

اس نے ماں کو غور سے دیکھا اور سنجیدگی سے سوچنے لگا۔ اتنی بڑی ماں..... اسے کیسے کھایا جاسکتا ہے؟ لیکن ماں کی پیش کش کا یہ نتیجہ نکلا کہ اس کی بات بڑھانے کی ہمت نہیں ہوئی البتہ اس نے مایوسی سے پوچھا۔ ”ماں! ہمیں کھانا کیوں نہیں ملتا؟“

ماں کے چہرے پر نرمی بکھر گئی۔ اس نے بڑی محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پیار سے اسے سمجھایا۔ ”دیکھ یوسف! ہم غریب اور بے سارا ہیں۔ ہمارے سر پر خدا کے سوا کسی کا ہاتھ نہیں۔“

یوسف نے سراٹھا کر دیکھا۔ اوپر کوئی بھی نہیں تھا۔ نہ خدا، نہ خدا کا ہاتھ۔ ”خدا کا ہاتھ کہاں ہے ماں؟“ اس نے پوچھا۔

”پنگے وہ نظر تھوڑی آتا ہے۔“

”لیکن مجھے بھوک لگی ہے ماں، پھر خدا ہمیں کھانے کو کیوں نہیں دیتا؟“

”دیتا ہے بد بخت“ ماں کو ایک دم غصہ آگیا۔ ”نہ دیتا تو تو اتنا بڑا کیسے ہو جاتا؟“ پھر وہ نرم لہجے میں بولی۔ ”ہر حال میں اس کا شکر کیا کر۔ دن میں ایک بار سسی مل تو جاتا ہے کھانے کو“

وہ خاموش ہو گیا لیکن سوچتا رہا کہ یہ شکر کیا ہے..... کیسے کیا جاتا ہے؟ ماں کھانا دیتی ہے تو میں اسے سلام کرتا ہوں۔ خدا کہاں ہے اور اس کا ہاتھ کہاں ہے اور میں بھوکا کیوں ہوں؟ وہ سوچتا اور چڑتا رہتا۔ اسے خدا پر غصہ آنے لگا۔ وہ اسے شکر کا موقع کیوں نہیں دیتا؟ پھر اسے ماں پر غصہ آیا کہ وہ اسے سلام کا موقع نہیں دے رہی تھی۔

اس صبح بھی اسے ماں کو سلام کرنے کا موقع نہیں ملا۔ ماں اسے پیار کر کے چلی گئی۔ وہ دیر تک بیٹھا سڑک کی چمپل پھل میں دھیان بنانے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن پیٹ کی اینٹھیں شدید تر ہوتی گئی۔ بالآخر اس سے رہا نہ گیا۔ اس نے سوچا کہ خدا کو تلاش کرے، اس سے کھانا مانگے لیکن پھر خیال آیا، ماں نے بتایا تھا کہ خدا اور اس کا ہاتھ نظر نہیں آتا۔ وہ ٹھنکا پھر اس نے سوچا، یہ کیسے ممکن ہے؟ اس نے اپنے سر کے اوپر ہاتھ سے ٹٹولا۔ خدا کا ہاتھ نظر نہیں آتا مگر اس کے اور ماں کے سر پر ہے تو محسوس تو ہو گا لیکن کچھ بھی محسوس نہیں ہوا۔ تنگ آکر وہ سڑک کی کٹڑ کی طرف چل دیا۔

اس نے پہلی بار ماں کی ہدایت کو نظر انداز کیا تھا۔ اسے لمحے وہ صرف اتنا جانتا تھا کہ بھوک کے بچوں اور دانتوں سے ادھڑتا ہوا پیٹ سب سے بڑا ہے۔ موز مڑ کر وہ فٹ پاتھ پر چلتا رہا۔ فٹ پاتھ ختم ہوا تو سڑک آئی۔ اس نے سڑک پار کی اور سامنے والے فٹ پاتھ پر چل دیا۔ سامنے ایک خوبصورت عمارت تھی۔ دروازے پر سفید پتھر کا کراس تھا اور کراس پر ایک بندھے ہوئے آدمی کی شبیہ ابھری ہوئی تھی۔ وہ چلتے چلتے ٹھک گیا۔ فٹ پاتھ پر ایک آدمی بیٹھ کیلے کھا رہا تھا۔ اس کی ٹانگیں گھٹنوں کے اوپر سے کئی ہوئی تھیں۔

اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ وہ لپٹائی ہوئی نظروں سے کیلوں کو دیکھنے لگا۔ اس شخص نے کیلا چھیلنے ہوئے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور مسکرایا۔ ”بھوکا ہے تم؟“ اس نے پوچھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ جواب دینے کے لئے منہ کھولا تو پانی نکل پڑا۔ اس نے وہ پانی حلق سے اتار لیا۔ بھوک اور بڑھ گئی۔

”میں یہ کیلا نہیں ڈے گا۔ میں غڈ بوٹھ بھوکا.....“ اس شخص نے کیلا منہ میں رکھ لیا۔

وہ بے بسی سے اسے دیکھتا رہا۔

”اس ڈور پر ناک کرو.....“ اس شخص نے ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا

اور پھر اشارے سے ناک کا مفہوم سمجھایا۔ وہ اس دروازے کی طرف بڑھا۔

”رکو۔“ اس شخص نے ٹوک۔ ”پہلے اپنا نام بتاؤ؟“

”یوسف۔“ اس نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

”نئیں چلے گا۔ اچھا تم بھوکا کیوں ہے؟“

”خدا ہم کو کھانا دیتا ہے لیکن کل بھی بھول گیا اور آج بھی.....“

”امارا گاؤ..... ہولی فادر کبھی نہیں بھولتا۔ ہولی کرائٹ کی میرانی ہے۔ ام کبھی

بھوکا نہیں رہتا.....“

”مجھے ان سے ملاؤ۔ میں بھوکا ہوں۔“

”اوکے بوائے۔ تم کو کراس بناانا آتا؟“

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

لنگڑے آدمی نے کراس بنا کر دکھایا۔ ”ایسا.....“ اس نے ہنستے ہوئے کہا ”ابی

تم بتاؤ۔“

اس نے سینے پر کراس بنایا۔

”گڈ! ابی گور سے سنو۔ یہ ڈروازہ ناک کرو۔ ایک لیڈی ڈروازہ کھولے گا۔ تم

روئے گا اور اس سے بولے گا۔ میڈم! ام بھوکا ہائے۔ ہولی فادر! ہولی کرائٹ کا نام پر

کھانا مانگنا! یا ڈر ہے گا؟ بول کر دکھاؤ۔“

نئے یوسف نے زندگی کا پہلا آموختہ دہرایا۔

لنگڑے فقیر کی بتیسی نکل پڑی۔ ”گڈ! تم انٹیلی جنٹ ہے۔ کبھی بھوکا نہیں رہے

گا۔ ون منٹ۔ تمارا نام کیا ہے؟“

”یوسف۔“

”نئیں۔ بڑا لیڈی پوچھے گا۔ تم کہنا۔ امارا نام جوزف ہے۔ اس کو کراس بنا کر

دکھانا۔“

اس نے سر کو تھپسی جنبش دی اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ زندگی کا پہلا

امتحان پاس کرنے جا رہا تھا۔

ایک گھنٹے بعد وہ باہر نکلا تو بے حد آسودہ تھا۔ اس کے ہاتھ میں دو کیلے تھے۔ اس

نے بڑھی عورت سے لفظ بہ لفظ وہی گفتگو کی تھی جو لنگڑے فقیر نے اسے سکھائی تھی۔

بڑھی عورت نے اس کا ہاتھ منہ دھلایا، اسے کھانا کھلایا اور دو کیلے دیے۔ وہ اسے اپنے

پاس رکھنا چاہتی تھی لیکن یوسف کو پیٹ بھرتے ہی ماں اور اس کی ہدایت یاد آگئی تھی۔ وہ جلدی سے باہر نکل آیا۔

لنگڑا فقیر دیوار سے ٹیک لگائے، آنکھیں موندے بیٹھا تھا۔ قدموں کی چاپ سنتے

ہی اس نے آنکھیں کھول دیں اور مسکرا کر اسے دیکھا۔ ”ہیلو! جوزف! اب تم بھوکا تو

نہیں اے!“ اس نے پوچھا۔

یوسف نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”اے ون منٹ؟“

یوسف نے پلٹ کر دیکھا۔

”ایک کیلا ام کو ڈو۔ ام تمارا بچہ اے۔“

یوسف نے کیلے سینے سے لگائے اور اندھا دھند بھاگ لیا۔ وہ اپنے ٹھکانے پر پہنچا تو

ماں بولائی ہوئی ادھر ادھر اسے ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی وہ لپک کر آئی اور

اسے اپنے سینے سے بچھین لیا۔ اسے اپنی ماں کا دل ہمیشہ سے زیادہ تیز دھڑکتا محسوس ہوا۔

ماں نے فوراً ہی اسے پیچھے ہٹایا اور گھور کر دیکھا۔ ”کہاں چلا گیا تھا تو؟“

”وہ ادھر.....“ اس نے موڑ کی طرف اشارہ کیا۔

”کیوں گیا تھا؟“ ماں کا لہجہ سخت تھا۔

”بھوک لگی تھی۔“

تب ماں کی نظر ان کیلوں پر پڑی۔ ”یہ کیا؟ چوری کی ہے تو نے؟“

”نہیں ماں!“

تب اس نے ماں کے پوچھنے پر پوری کہانی سنادی۔ ٹوٹی پھوٹی لفظوں میں، بوڑھی

عورت سے اپنے مکالے اس نے اس بار بھی اینگلو اردو میں ادا کئے تھے۔ ماں حیرت سے

سنتی رہی اور نہ جانے کہاں سے اس کے زرد چہرے پر سرخی اٹھ آئی۔

”ماں! ہولی فادر اور ہولی کرائٹ کھانا دیتا نہیں بھولتے۔“ اس نے آخر میں بتایا۔

اسی وقت ماں کا ہاتھ پوری قوت سے اس کے رخسار پر پڑا۔ وہ سن کر ہو کر رہ گیا۔

وہ پہلا موقع تھا کہ ماں نے اسے مارا تھا۔ اس کی آنکھیں خود بخود بھر آئیں اور سب کچھ

دھندلا کر رہ گیا۔ اس نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ ماں رو رہی ہے اور اس نے منہ اٹھا کر

آسمان کی طرف یوں دیکھا ہے، جیسے دینے والے ہاتھ کو تلاش کر رہی ہے اور اس کی

آنکھوں میں ایک تند مگر خاموش شکایت چمک رہی ہے۔

”یہ تیری سمجھ میں نہیں آئے گا اور تیری خاطر کا مطلب یہ ہے کہ میں نہیں چاہتی تو بھوکا رہے اور بھوک کی وجہ سے جوزف بن جائے، کرشان بن جائے۔ تو مسلمان ہے۔“

”میں مسلمان ہوں ماں تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ میں یوسف ہوں یا جوزف؟ رہوں گا تو میں مسلمان ہی۔“ نہ جانے کہاں سے یہ دلیل اس کے ذہن میں ابھری۔

”بکواس نہ کر۔“ ماں نے رونا دھونا موقوف کیا اور برہم ہو گئی۔ وہ خاموش ہو گیا لیکن اس کے ذہن میں ان گنت سوال ابھرنے لگے۔ بھوک لگے تو روٹی چاہئے، روٹی یوسف کے نام کو ملے تو یوسف میں کوئی برائی نہیں اور جوزف کو ملے تو جوزف میں بھی کوئی خرابی نہیں۔ نام سے کیا ہوتا ہے۔ میں یوسف ہوں یا جوزف؟ رہوں گا تو ماں کا بیٹا ہی۔ پھر ماں کو اس کی فکر کیوں ہے اور وہ خود کو کیوں سچ رہی ہے..... کیسے سچ رہی ہے؟ یہ سب کیا ہے؟ خدا کا ہاتھ نظر کیوں نہیں آتا؟ کیا اس لیے کہ کہیں کوئی اسے پکڑ کر اس سے پوچھ نہ بیٹھے کہ وہ کھانا کیوں نہیں دیتا جبکہ سامنے والے ہوٹل میں بہت سارا کھانا خراب ہونے کے بعد پھینک دیا جاتا ہے۔

یہی سب کچھ سوچتے سوچتے وہ سو گیا۔ صبح اس کی ماں مر گئی۔ وہ اس وقت موت کا منہ منہ نہیں سمجھتا تھا۔ اس نے تو بس یہ دیکھا کہ اس کی ماں ناشتا لے کر سڑک پار کر رہی تھی کہ اچانک وہ ایک گاڑی کی لپٹ میں آئی اور اس کی زوردار چیخ فضا میں گونجی۔ چائے کا مک اور کڑک ڈبل روٹی اچھل کر ایک طرف گری اور گاڑی کا پیرا اس کے سر پر سے گزر گیا۔ گاڑی رکی ہی نہیں بلکہ اس کی رفتار بڑھی اور وہ پلک جھپکتے میں موڑ کاٹ کر او جھل ہو گئی۔

وہ پہلے تو چند لمحے سحر زدہ سا سڑک پر بکھری ہوئی ماں کو دیکھتا رہا۔ پھر تیزی سے اس کی طرف پلکا۔ سامنے والے ہوٹل سے بہت سے لوگ نکلے۔ اس نے اپنی ماں کو دیکھا، جس کا سر چپک گیا تھا اور مغز اور خون سڑک پر بکھر گیا تھا۔ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھا۔ ماں بالکل ساکت تھی۔ نہ جانے کیسے اسے احساس ہو گیا کہ اب ماں میاں سے خود نہیں اٹھے گی، کبھی نہیں بولے گی۔ اسے وہ منظر اچھا نہیں لگا۔ اس نے ڈبل روٹی کو دیکھا، وہ بھی چپک گئی تھی۔ مک میں چائے کا ایک قطرہ بھی نہیں رہا تھا۔

”ماں! اب میں ناشتا کیسے کروں گا؟“ اس نے ماں سے پوچھا حالانکہ اسے یقین نہیں تھا کہ ماں کوئی جواب دے گی۔ اسے یہ فکر بھی نہیں تھی کہ اب ہر روز بھوک

اگلے ہی لمحے ماں نے اسے گود میں بھر لیا اور بے تابانہ اس کی رخسار پر ابھرے ہوئے اپنی انگلیوں کے نشان کو چومتی رہی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بے جا رہے تھے۔ یوسف کی آنکھیں خشک ہو گئی تھیں اور وہ حیرت سے ماں کو دیکھ رہا تھا۔

”ٹھیک ہے۔ اب تو کبھی بھوکا نہیں رہے گا۔“ ماں نے بڑے عزم سے کہا۔ ”میں اب تجھے بھوکا نہیں رہنے دوں گی لیکن تو بھی سن لے بد بخت! تجھے یوسف ہی رہنا ہے۔ تو جوزف نہیں ہے۔ تجھے کرشان نہیں بنتا۔ سمجھا؟“

وہ کچھ سمجھا اور بہت کچھ نہ سمجھا لیکن کسی چیز نے اسے سمجھا دیا کہ اسے کیا جواب دینا ہے۔ ”میں یوسف ہوں ماں۔“

”اور خردار..... اب کبھی اس فٹ پاتھ سے آگے نہ جانا۔ اب میں دن میں کئی بار واپس آکر تجھے دیکھا کروں گی۔ اگر اب تو کبھی ادھر گیا تو یاد رکھنا، میں تیرا گلا گھونٹ دوں گی۔“

ماں کے لمحے میں نہ جانے کیا بات تھی کہ وہ سسم کر رہ گیا۔ اس نے سر ہلا دیا۔ اس دن کے بعد ایک انقلاب آگیا۔ اس دن کے بعد وہ ایک بار بھی رات کے کھانے اور صبح کی چائے اور پاپے سے محروم نہیں ہوا۔ یہ بھی سچ تھا کہ ماں دن میں کئی بار آتی اور اسے دیکھ کر جاتی۔ اسے دن میں بھوک لگتی اس کا جی چاہتا کہ فٹ پاتھ کا موڑ مڑے، سڑک پار کرے اور جوزف بن جائے لیکن پھر اسے ماں کے تیور یاد آتے اور وہ ہولی فادر اور ہولی کرائسٹ کو بھول کر بھوک سے سمجھوتا کر لیتا۔

ایک تبدیلی اور ہوئی۔ اب وہ اکثر رات کو سوتے سوتے اٹھ جاتا..... ماں کے رونے کی وجہ سے۔ ماں بہت خاموشی سے روتی لیکن پھر اس کی ہچکیاں بندھ جاتیں اور پورا بدن لرزنے لگتا۔ تقریباً ہر رات ایسا ہوتا۔ وہ جاگتا اور پھر سوچتے سوچتے سو جاتا کہ ماں کیوں رو رہی ہے؟ پوچھنے کی ہمت نہ ہوتی۔

ایک رات اس سے نہ رہا گیا اور وہ پوچھ بیٹھا ”ماں تو کیوں روتی ہے؟“

”اپنی قسمت کو روتی ہوں۔“

یہ بات اس کے حلق سے نہ اتری چنانچہ اس نے اپنا سوال دہرایا۔ ”تو کیوں روتی ہے ماں؟“

”تیری خاطر خود کو سچ جو رہی ہوں۔ روؤں نہیں تو اور کیا کروں؟“

”میری خاطر؟ اور بیچنا کیا ہوتا ہے ماں؟“

کے اندر پہلی بار آیا تھا۔ کچھ دیر بعد پیرا اس کے لیے ایک پیس اور ملائی لے آیا۔ اس نے ایک پیس کو چھو کر دیکھا۔ ڈبل روٹی اور پاپے کے برعکس وہ بے حد نرم تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے دباؤ ڈالا۔ ایک پیس کا چھوٹا سا ٹکڑا ٹوٹ گیا۔ اس نے اسے ملائی میں گھما کر منہ میں رکھا، مزہ آگیا۔ ایسی کوئی چیز اس نے پہلے کبھی نہیں کھائی تھی۔ وہ مزے میں سب کچھ چٹ کر گیا۔

”اور لاؤں؟“ پیرے نے اس سے پوچھا

ماں نے اس سے کبھی یہ بات نہیں پوچھی تھی۔ اس نے جلدی سے اقرار میں سر ہلا دیا۔ پیرا اور ایک پیس اور ملائی لے آیا۔ اس بار وہ پلیٹ صاف کر سکا اور نہ ہی ایک پیس ختم کر سکا۔ زندگی میں پہلی بار اسے پیٹ بھرنے کا احساس ہوا۔ اسے نیند آنے لگی۔

”بس؟“ پیرے نے پوچھا۔

”بس۔“ اس نے جواب دیا۔

نیند بہت زور کی آرہی تھی۔ وہ آنکھیں کھلی رکھنے کی کوشش کرتا رہا مگر کچھ دیر بعد اس کا سر میز پر ڈھلک گیا۔ پیرا چائے لے کر آیا تو وہ بے خبر سو رہا تھا۔ پیرے نے سوائے نگاہوں سے ہوٹل کے مالک کو دیکھا۔

”سوئے دے بے چارے کو۔“ ہوٹل کے مالک نے کہا ”اٹھ جائے تو چائے پلا دیتا۔“

یوں اسے پتا ہی نہ چل سکا کہ اس کی ماں کی تدفین کیسے ہوئی اور کہاں ہوئی۔ نہ ہی وہ کبھی اس کی قبر دیکھ سکا۔ خیر، اس وقت تو اسے قبر کا شعور بھی نہیں تھا۔ اس کے جاتے ہی پیرے نے اسے ملائی والی چائے دی۔ چائے پیتے ہوئے اسے ہوٹل کے مالک کی بات یاد آئی، تمہاری ماں مر گئی۔ اچھی عورت تھی بے چاری، پھر اسے ناشتایا دیا جو اسے زندگی میں کبھی نصیب نہیں ہوا تھا اور اب یہ ملائی والی چائے؟ اس نے ان تینوں کڑیوں کو ملایا تو یہی نتیجہ نکلا کہ ماں کا مرنا اچھا ہے لیکن نہ جانے کیوں، پیٹ بھرا ہونے کے باوجود اندر کوئی چیز اسے کاٹ رہی تھی اور وہ بھوک نہیں، کوئی اور چیز تھی، جسے وہ سمجھ نہیں سکتا تھا۔ گلے میں کوئی چیز انگ سی رہی تھی۔

وہ چائے پی کر باہر کی طرف چلا۔ ہوٹل کے مالک نے اسے پکارا۔ وہ کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا۔

ہوٹل کے مالک کے ہونٹ لرزے۔ چند لمبے وہ خاموش رہا۔ پھر اس نے پوچھا۔

مٹانے کا سامان کون کرے گا۔ وہ اس لمبے فردا کے دکھ سے ناواقف تھا۔ اسے تو صرف ناشتے کی فکر تھی..... اس وقت کی فکر!

لوگ وہاں جمع ہو گئے تھے۔ ایک آدمی جس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں اور جس نے مردہ عورت سے اس کا سوال سن لیا تھا۔ اسے کھینچ کر ہوٹل میں لے گیا۔ اس نے بوڑھی کریشان عورت کی طرح اسے کرسی پر بٹھایا اور ہوٹل کے مالک سے بولا ”اس بچے کو ناشتہ کراؤ۔ جو یہ مانگے اسے دو لیکن اسے باہر نہ آنے دیتا۔ بے چارہ بچہ!“ یہ کہہ کر وہ باہر چلا گیا۔

ہوٹل کا مالک کاؤنٹر کے پیچھے سے نکلا۔ اس نے دروازے پر جا کر باہر کا جائزہ لیا اور پھر اس کے پاس آگیا۔ ”تمہاری ماں مر گئی؟ اچھی عورت تھی بے چاری۔“

”ماں مر گئی؟“ اس نے عجیب سے لہجے میں دہرایا۔ ”اب مجھے ناشتہ کون کرائے گا؟“

”میں کراؤں گا ناشتہ“ یہ کہہ کر ہوٹل کے مالک نے پیرے کو پکارا۔ ”اسے ناشتہ دے لڑکے۔“ پھر اس نے یوسف سے پوچھا۔ ”نام کیا ہے تمہارا؟“

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ یوسف بتائے یا جوزف؟ خدا پر انحصار کرے یا ہولی فادر اور ہولی کرائسٹ پر؟ اس کے نزدیک خدا اور ہولی فادر آپس میں حریف تھے۔

”کیا کھاؤ گے؟“ ہوٹل کے مالک نے پوچھا۔ اس نے نام پر زور نہیں دیا۔ اس کے خیال میں بچہ ماں کی موت کے صدمے سے دو چار تھا۔

”چائے، کڑک ڈبل روٹی اور پاپا۔“ اس نے سادگی سے کہا اور پھر کچھ سوچ کر اضافہ کیا۔ ”بہت سارا۔“

پیرا بھی وہیں آکھڑا ہوا تھا۔ ”اور کچھ نہیں؟“ ہوٹل کے مالک نے پوچھا۔ اس کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”میں روزی کی کھاتا ہوں۔“

ہوٹل کے مالک نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا اور بھرائی ہوئی آواز میں پیرے سے کہا

”ہمے ملائی کے ساتھ ایک پیس لا کر دے..... جتنے یہ کہے۔ پھر اس کے بعد اسے چائے پلاؤ۔“ یہ کہہ کر وہ پھر کاؤنٹر کے پیچھے چلا گیا اور رومال سے بار بار اپنی آنکھیں پونچھتا رہا۔ پیرا کچن کی طرف چلا گیا تھا۔

اس نے گردن پیش کا جائزہ لیا۔ وہ اس ہوٹل کو کب سے دیکھ رہا تھا لیکن ہوٹل

”تمہارا نام کیا ہے؟“

”اس نے پیٹ کے سکون کو محسوس کرتے ہوئے بلا جھجک جواب دیا۔ ”یوسف۔

میرا نام ہے یوسف، میں مسلمان ہوں۔“

ہوٹل کے مالک کا چہرہ کچھ عجیب سا ہو گیا۔ ”یوسف! تم کہاں جا رہے ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”ادھر فٹ پاتھ پر۔“ اس نے جواب دیا۔ ”ماں کے پاس۔“

”تمہاری ماں مر گئی، اب کبھی نہیں آئے گی۔ خیر تم جاؤ۔ بھوک لگے تو ادھر ہی آ

جانا۔“

وہ باہر نکل آیا اور اس نے بہت دیکھ بھال کر سڑک پار کی۔ سڑک بالکل صاف

تھی۔ وہ جگہ بھی، جہاں صبح ماں گری تھی، جہاں صبح ماں کا خون اور مغز بکھرا ہوا تھا۔ فٹ

پاتھ پر وہ چادر اب بھی رکھی تھی، جس پر وہ ماں کے ساتھ سوتا تھا، وہ چادر پر بیٹھ گیا۔

کیلے کی چھابڑی والا، جو پہلے کبھی اس کی طرف نہیں دیکھتا تھا، اب بہت غور سے

اسے دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر وہ یونی دیکھتا رہا، پھر اس نے پکارا۔ ”یہاں آ جا بیٹے! میرے پاس

بیٹھ۔“

اس کا جی تو نہیں چاہ رہا تھا۔ پھر بھی وہ چھابڑی والے کے پاس چلا گیا۔

”نام کیا ہے تیرا؟“

”یوسف۔“ اس نے بلا جھجک بتایا۔

”یوسف! کیلے کھائے گا؟“ چھابڑی والے نے مہربان لہجے میں پوچھا۔

وہ دن ہی شاید اس کے لیے تبدیلیوں کا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اس نے کھانے کی

کسی چیز سے انکار کیا۔ اس کا پیٹ بھرا ہوا تھا۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”اب تو کہاں رہے گا یوسف؟“

”یہیں رہوں گا۔ یہ میری چادر ہے۔“ اس نے فخریہ لہجے میں بتایا۔

”یہاں نہیں رہ سکتا اب تو۔“ چھابڑی والے نے کہا۔ ”ماں کے بغیر اکیلا تو یہاں

کیسے رہے گا؟“

”ہوٹل والا کہہ رہا تھا، میری ماں مر گئی ہے۔ اب کبھی نہیں آئے گی۔“ اس کے

لہجے میں الجھن تھی۔

”ہاں بیٹا، وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ ہم ابھی تیری ماں کو چھوڑ کر آئے ہیں۔“

”کہاں؟“

”اللہ تعالیٰ کے ہاں۔ وہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔“

”تو تم مجھے بھی وہیں چھوڑ آؤ۔“

”وہاں اللہ تعالیٰ کی مرضی کے بغیر کوئی نہیں جاتا۔“ چھابڑی والے نے بھرائی ہوئی

آواز میں کہا۔ پھر کچھ توقف کے بعد بولا ”تو میرے ساتھ میرے گھر چل۔ میرا بیٹا بن کر

رہنا۔ میرے اپنے بچے بھی ہیں۔ بول..... چلے گا نا؟“

وہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ اس کی سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا تھا، البتہ جبلت اس کی

رہنمائی کر رہی تھی۔ ماں مر گئی ہے، اب کبھی واپس نہیں آئے گی۔ پہلے اسے ڈر لگتا تھا تو

وہ ماں سے لپٹ جاتا تھا۔ اب وہ اکیلا ہو گا، اب ڈر لگے گا تو کیا ہو گا؟ کچھ سوچ کر اس نے

اثبات میں سر ہلا دیا۔

دوپہر کا کھانا چھابڑی والے نے اسے اپنے ساتھ کھلایا۔ شام کو وہ اسے گھر لے گیا۔

چھوٹا سا، گندا سا وہ گھر اسے اچھا لگا۔ شاید اس لیے کہ اس سے پہلے اس نے کبھی گھر نہیں

دیکھا تھا۔ اس گھر میں بہت سے بچے تھے۔ وہ سب اسے یوں دیکھ رہے تھے، جیسے وہ کوئی

عجوبہ ہو۔ خود وہ انہیں دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اتنے بہت سے بچے یک جا نہیں

دیکھے تھے۔

چھابڑی والے کی بیوی بے حد تک چڑھی عورت ثابت ہوئی۔ ”یہ کیا بلا اٹھالائے

تم؟“ اس نے بہت خراب لہجے میں اپنے شوہر سے پوچھا۔

چھابڑی والے نے پوری تفصیل سنا دی۔

”سارے جہاں کا درد تمہارے جگر میں ہے۔“ اس کی بیوی ہاتھ نچا کر بولی۔ ”میں

کہتی ہوں، یہ اپنے ہی کیا کم تھے کہ تم ایک اور اٹھالائے۔“

”نیک بخت! اسی لیے تو لے آیا ہوں کہ جہاں اتنے ہیں، وہاں ایک اور سہی۔ اللہ

رزق دینے والا ہے۔“ چھابڑی والے نے بڑے تحمل سے کہا۔

”میں کچھ نہیں جانتی، اسے جہاں سے لائے ہو، وہیں چھوڑ آؤ۔“

چھابڑی والا خاموش ہو گیا لیکن یوسف کو احساس ہو گیا کہ اسے یہ گھر اس نہیں

آئے گا۔ اس سے ٹھیک طرح سے کھانا بھی نہیں کھایا گیا کیونکہ چھابڑی والے کی بیوی

سلسل اسے گھور رہی تھی۔ وہ پوری طرح پیٹ بھرے بغیر ہی اٹھ گیا۔

رات کو اسے بچوں کے ساتھ سلایا گیا، جن کی تعداد دس تھی لیکن وہ ٹھیک سے سو



ہوئے ہم نیکی کا کوئی کام بھی تو نہیں کر سکتے۔“ چھابڑی والے نے خود کلابی کی۔  
شام کو چھابڑی والا اسے اپنے گھر کے بجائے مولوی نعمت علی کے یتیم خانے لے  
گیا۔ اس نے مولوی صاحب کو یوسف کے متعلق جو جانتا تھا بتایا، اپنا پتا لکھوایا اور  
یوسف کو وہاں چھوڑ کر باہر نکل آیا۔

یوسف کے لیے وہ ایک بالکل نئی دنیا تھی۔ وہاں سینکڑوں بچے تھے، ہر عمر اور ہر  
ساتز کے۔ ان میں لڑکیاں بھی تھیں۔ بڑا سا کمپاؤنڈ تھا۔ وہاں بہت سے بچے کھیل رہے  
تھے۔ انہوں نے شور مچا رکھا تھا۔ یوسف حیرت سے انہیں دیکھتا رہا۔

یتیم خانے کا ایک گھراں تھا، کالا بھنگ، منہ پر چپک کے داغ اور چھوٹی چھوٹی  
آنکھیں۔ اس کا نام رشید تھا۔ رات ہوئی تو اس نے سب بچوں کو جمع کیا اور انہیں میدان  
میں بٹھا کر کھانا دیا۔ تپتی، بد مزہ دال اور ایک ایک چپاتی۔

یتیم خانے میں پانچ کمرے تھے۔ دو مولوی صاحب کے استعمال میں رہتے تھے۔  
ایک میں رشید رہتا تھا۔ باقی دو کمرے بہت بڑے بڑے تھے۔ ان میں دریاں بکھی ہوئی  
تھیں۔ ایک میں لڑکیاں سوتی تھیں اور دوسرے میں لڑکے۔ کھانے کے بعد انہیں کمروں  
میں دھکیل دیا گیا۔ بڑے لڑکے کھڑکیوں کے قریب سوتے تھے تاکہ ہوا آتی رہے۔ یوسف  
کو جہاں جگہ ملی وہاں تھوں کا تکیہ بنا کر، ماں کی چادر اوڑھ کر لیٹ گیا۔

یتیم خانہ یوسف کے لیے زندگی کی پہلی تربیت گاہ ثابت ہوا۔

صبح تمام بچے جلدی اٹھتے اور نماز پڑھتے۔ اس کے بعد مولوی صاحب انہیں کلام  
پاک پڑھاتے، پھر ناشتا ہوتا، ناشتے کے کچھ دیر بعد مولوی صاحب اردو پڑھاتے۔ دوپہر کے  
کھانے کے بعد بچوں کو سونے کی ہدایت کی جاتی لیکن بیشتر بچے کھیلتے اور اودھم مچاتے  
رہتے۔

یوسف نے بہت جلد قانونِ ہذا کے بیشتر اصول سمجھ لیے۔ یتیم خانے پر بڑے بچوں  
کی حکمرانی تھی لیکن نہیں۔ یہ کتنا تو غلط ہو گا کیونکہ وہاں طاقت کی حکمرانی تھی۔ بڑے بچے  
بزدل باز، چھوٹے بچوں کو کھانے سے محروم کر دیتے تھے۔ یوسف نے بھی ہاتھ پیر چلانے  
شروع کر دیے

مولوی صاحب تمام بچوں سے نہایت شفقت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ یوسف کے  
ساتھ ان کا برتاؤ خصوصی تھا کیونکہ وہ سوال بہت کرتا تھا۔ عجیب عجیب سوال۔ بالخصوص  
مذہب کے بارے میں۔ وہ اسے سمجھاتے وہ بہت حساس اور ذی فہم بچہ تھا۔ اپنی عمر سے

نہیں سکا۔ چھابی والے کی بیوی مسلسل اپنی شوہر سے لڑتی رہی۔

چھابڑی والا پڑھا لکھا تو نہیں تھا مگر دور اندیش تھا۔ اس نے یہ حقیقت فوراً  
قبول کر لی کہ ننھا یوسف اس کے گھر میں اس کے بچوں کی طرح نہیں رہ سکے گا۔ اسے  
بیوی پر غصہ آرہا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ اس نے فوراً نئی فیصلہ  
بھی کر لیا۔ ”ٹھیک ہے۔ میں صبح کو اسے لے جاؤں گا۔ اب چین سے مجھے سونے دے۔  
زیادہ بک بک مت کر۔“ اس نے بیوی کو جھڑک دیا۔

صبح ہوئی تو اس نے بڑی نرمی سے یوسف کو جگایا اور اس کا ہاتھ منہ دھلا کر اچانک  
چھابڑی سنبھالی اور اس کا ہاتھ تھام کر دروازے کی طرف چل دیا۔

”ناشتا تو کر لو۔“ بیوی نے اسے پکارا۔

”مجھے نہیں کرنا ناشتا واشتا، تو خود ہی ٹھونس لے۔ میں جا رہا ہوں۔“ چھابڑی

والے نے کہا اور گھر سے نکل گیا۔ یوسف اس کے ساتھ تھا۔

چھابڑی والے کی بیوی بہت دانا تھی۔ جانتی تھی کہ شوہر کا غصہ وقتی ہے۔ اس  
وقت چپ رہنا ہی بہتر ہے۔ نئی بلا سے بھی پیچھا چھوٹ جائے گا۔

چھابڑی والے نے ناشتا اپنے ٹھیلے پر پہنچ کر یوسف کو ساتھ بٹھا کر کیا۔ چائے یا  
بھگو کر کڑک ڈبل روٹی کھاتے ہوئے نہ جانے کیوں یوسف کی آنکھوں میں آنسو آ گئے  
شاید اس لیے کہ ماں کے بغیر ناشتا کرنے کا اس کے لیے پہلا موقع تھا یا شاید اس لیے کہ  
سمجھتا تھا اب اس طرح کا ناشتا اسے کبھی نہیں ملے گا۔ وہ ماں کی میلی چادر لپیٹے فٹ پاتھ  
بیٹھا رہا۔ جذباتی وابستگی کا تو وہ مفہوم نہیں سمجھتا تھا۔ بس اس لمحے اس نے جان لیا تھا  
اب وہ اس چادر سے کبھی دست بردار نہیں ہو گا۔

چھابڑی والا دن بھر کسی سوچ میں گم رہا۔ اس نے یوسف سے بھی بس یونہی  
بات کی البتہ دوپہر کا کھانا دونوں نے ساتھ کھایا۔ اس کے بعد چھابڑی والا پھر اپنی سوچ  
میں گم ہو گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے سر اٹھایا اور یوسف سے بولا ”یوسف! آج میں تمہیں  
ایک نئے گھر لے کر چلوں گا۔ وہاں تم جیسے بہت سارے بچے ہوں گے۔ تم ہمیشہ  
رہنا ٹھیک ہے؟“

”یوسف نے سر کو اثباتی جنبش دی۔ وہ جانتا تھا کہ چھابڑی والے کے گھر وہ  
نہیں سکے گا۔

”خدا میری بیوی کو نیک ہدایت دے، خدا ہماری غربت دور کرے“ اس کے ہاں

بڑا، غیر جذباتی انداز میں سوچنے والا اور حقیقت پسند۔

یتیم خانے کے اخراجات مخیر حضرات کی امداد کے ذریعے پورے ہوتے تھے۔ عموماً روکھی سوکھی سے کام چلتا۔ کبھی کبھار کسی دعوت سے بچے ہوئے کھانے کی کوئی دیگ آجاتی تو بچوں کے عیش ہو جاتے۔ رمضان، عید اور بقر عید کے موقعوں پر چیلٹی کے خواہش مند لوگ میدان خیر میں اترتے اور بچوں کے دن پھر جاتے۔ اخبارات میں مخیر حضرات کی تصویریں شائع ہوتیں۔ کچھ بچے بھی نمایاں نظر آتے۔ چنانچہ عید بقر عید پر بچوں کو ایک آدھ جوڑا میسر آتی جاتا لیکن کبھی کبھار فاقوں کی نوبت بھی آجاتی۔ جب بھی ایسا ہوتا، کئی بڑے لڑکے باہر نکل جاتے۔ یوسف کو بعد میں پتہ چلا کہ وہ بھیکے مانگتے ہیں۔ اسی طرح پانچ سال گزر گئے۔ مولوی صاحب کی شفقت و محبت اور ان سے انیسیت کے باوجود یوسف خود کو وہاں قیدی محسوس کرتا البتہ اب اس کے ہاتھ خوب کھل گئے تھے۔ قد بھی وہ اچھا نکال رہا تھا۔ دوسرے تمام لڑکے اس سے دب کر رہنے لگے۔

یتیم خانے میں بچے آتے بھی رہتے اور جاتے بھی رہتے۔ جانے والوں کو خوش نصیب سمجھا جاتا تھا۔ عام طور پر بے اولاد لوگ یتیم خانے آتے اور اپنے لیے کوئی بچہ پسند کر کے لے جاتے اور اسے بیٹے یا بیٹی کی حیثیت دے کر پالتے۔ یوسف کا کبھی جی نہ چاہا کہ کوئی اس طرح اسے لے جائے۔ اسی لیے ایسے موقعوں پر وہ غائب رہا کرتا۔

پھر اچانک مولوی نعمت علی کا انتقال ہو گیا۔ اب یوسف اچھا خاصا بڑا تھا۔ اس موت کے حوالے سے اسے اپنی ماں کی موت بھی یاد آئی۔ دوسری طرف مولوی صاحب کی موت کے بعد یتیم خانے کے حالات بھی ابتر ہو گئے۔ یوسف کے لئے اب وہاں کوئی کشش نہ رہی تھی چنانچہ ایک دن اس نے ماں کی چادر لی اور یتیم خانے سے نکل آیا۔ اسے ماں کی کمی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ پھر بھی نہ جانے کیوں اس نے صدر کا رخ کیا۔ وہ اس فٹ پاتھ پر گیا، جہاں کبھی وہ ماں کے ساتھ سوتا تھا، جس کے سامنے اس کی ماں گاڑی کے نیچے آئی تھی لیکن اب وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ دنیا ہی بدل گئی تھی۔ سامنے والا ہوٹل غائب تھا۔ وہاں ایک نئی عمارت بن گئی تھی اور اب ایک جدید طرز کا ریستورنٹ کھل گیا تھا۔

اس رات اس نے فٹ پاتھ پر چادر بچھائی اور بھوکا ہی سو گیا۔ صبح وہ دیر سے جاگ۔ فٹ پاتھ پر چمچل پھل اور ٹریفک کا شور اسے نہ اٹھاتا تو شاید وہ سوتا ہی رہتا۔ اٹھنے کے بعد وہ بلا ارادہ موٹر کی طرف چل دیا۔ موٹر مڑ کر وہ فٹ پاتھ کے ساتھ چلتا رہا۔ پھر اس نے

مڑک پار کر لی۔ اس کے ذہن میں یہ بات تھی کہ اسے کام ڈھونڈنا ہے۔ یہ بھی طے تھا کہ وہ صرف گھریلو کام کاج ہی کر سکتا ہے۔

وہ چلتا رہا۔ پھر اس نے بغیر سوچے سمجھے ایک دروازے پر دستک دی۔ چند لمحے بعد ایک خاتون نے دروازہ کھولا ”کیا بات ہائے؟“ خاتون نے نرم لہجے میں پوچھا۔ یوسف کو ایک بھولی بھری بات یاد آگئی..... کرسی پر بیٹھ کر کیا گیا پہلا ناشتا اور دو کیلے۔ وہ تو زندگی کا پہلا سبق تھا۔ ”ام کام کرنا مانگنا۔“ اس نے بے ساختہ کہا۔ ”گھر کا سارا کام کرے گا، جو آپ بولے گا۔ ہولی کرائسٹ کے نام پر ام کو کام دو۔“ خاتون نے سینے پر کراس کا نشان بنایا۔ اس نے جلدی سے خاتون کی تقلید کی۔ ”نمارا نام کیا ہائے؟“ خاتون نے پوچھا۔

”جوزف.....“

”ڈیوڈ..... جلدی آؤ۔ کم آن ڈیر۔ میٹر از اے بوائے..... جسٹ لائک ٹونی۔“ خاتون نے کسی کو پکارا۔

چند لمحے بعد دروازے پر ایک مرد نمودار ہوا۔ اس کی عمر پچاس سے اوپر ہو گی۔ اس نے یوسف کو سر تپا دیکھا اور بولا ”یو آر رائٹ میگی۔ ہی از جسٹ لائک ہم۔ وہاں از ہر نیم؟“ اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

”ہی از جوزف۔ کام مانگنا ہائے۔“ خاتون نے کہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

”انڈر لاؤ اسے“ مرد نے کہا۔

خاتون نے جلدی سے ایک طرف ہٹ کر یوسف کو راستہ دیا۔

”کم ان..... انڈر آجاؤ۔“

وہ اندر چلا گیا۔ وہ دو کمروں کا فلیٹ تھا۔ وہاں اس نے پہلی بار بیوی دیکھا۔ خاتون نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گیا۔

”کام نہیں ملتا تم امارا بیٹا بنیں گا؟“ خاتون نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

یوسف کو فوراً احساس ہوا کہ کام بن گیا ہے۔ یہ اسے جوزف ڈیوڈ بننے کے بعد پتا چلا کہ بوڑھی میگی کا اکلوتا بیٹا ٹونی چھ ماہ پہلے ایک حادثے میں ہلاک ہو گیا تھا۔ یعنی موت ایک بار پھر اس کے کام آئی۔ مولوی صاحب کی موت نے اسے یتیم خانے سے نکالا اور ٹونی کی موت نے اسے ایک گھر فراہم کر دیا۔

میسر نہ ہو تو ایک پیالی چائے پی لو، بھوک سے کم از کم ایک گھنٹے کی نجات۔  
”ہٹاؤ! قیامت کے بورے سینٹا چاہتی ہے۔ کتنی ہے“ میں ہمیشہ زندہ رہنا چاہتی  
ہوں۔“ برابر کی میز سے بڑا ہٹ کی آواز ابھری۔

اس نے چونک کر دیکھا۔ برابر والی میز پر ایک بڑے میاں براجمان تھے۔ ان کے  
ہاتھ میں اخبار کا اندرونی حصہ تھا۔ اس میں غالباً کوئی انٹرویو چھپا تھا۔ ایک عورت کی خاصی  
بڑی تصویر تھی۔ اس نے تصویر کے نیچے چھپی ہوئی عبارت پر مطلق دھیان نہ دیا۔  
بڑے میاں اسے اپنی طرف متوجہ دیکھ کر خوش ہو گئے۔ چمک کر بولے ”یہ ہے  
پیپے کا کھیل میاں صاحب! جنہیں اللہ نے بے حساب دیا ہے، انہیں زندگی مختصر لگتی ہے  
اور ایک ہم ہیں کہ مرنے کے لیے مرے جارہے ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ ہنسے۔ ”اور وہ جینے  
کے لیے مری جا رہی ہے۔“

اس نے چائے کا ایک اور گھونٹ لیا اور بے دھیانی سے بولا۔ ”جی ہاں۔ درست  
فرما رہے ہیں آپ۔“ حالانکہ اس نے بڑے میاں کی بات پوری طرح سنی ہی نہیں تھی۔  
وہ تو اپنے مسائل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

”اس نے اب تک ہر جنگ جیتی ہے“ سرمائے کے زور پر۔“ بڑے میاں نے مزید  
کہا۔ ”لیکن وہ یہ جنگ نہیں جیت سکتی حالانکہ اس کے نزدیک سب سے اہم جنگ یہی  
ہے۔ یہ خدائی انصاف ہے میاں!“

”جی ہاں۔ یہ حقیقت ہے۔“ اس نے خود کو کار انداز میں کہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ  
اب سنجیدگی سے کوئی کلام تلاش کرنے کا وقت آگیا ہے۔ المیہ یہ تھا کہ اس کی ساکھ بے  
حد خراب ہو چکی تھی اور اس سے بڑا المیہ یہ تھا کہ کج رو اور بددیانت لوگ اسے  
اظہاریات کا درس دیتے تھے۔

”دیکھو میاں! ہر آدمی کو ایک نہ ایک دن رخصت ہونا ہے۔ موت آدمی کا بینک  
بیلنس نہیں دیکھتی اور نہ ہی اس کی شہرت اور پوزیشن کو خاطر میں لاتی ہے۔ یہ وہ چیز ہے  
جو سب کے لیے ہے۔ موت کا ایک دن معین ہے اور جب وہ دن آئے گا تو اسے بھی جانا  
پڑے گا۔“ بڑے میاں نے تیسری قسط پیش کی۔

”جی ہاں۔ یہ تو ہے“ اس نے کہا لیکن بدستور اپنی سوچوں میں گم رہا۔ جب اب  
جواب دینے والی تھی اور اسے ضرورت تھی ایک آئیڈیے کی..... زبردست دھانسی  
آئیڈیے کی۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب کوئی چھوٹا ہاتھ نہیں مارے گا بلکہ اس بار

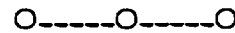
اس گھر میں بڑا آرام تھا۔ ڈیوڈ سن اور میگ اسے اپنے بیٹے کی طرح چاہتے تھے  
انہوں نے اسے انگلش اسکول میں داخل کرا دیا۔ اسے تمام آسانکشات میسر تھیں۔ مولو  
صاحب کی تعلیم پر چرچ کی تعلیم کی تہہ چڑھنے لگی۔ وہ سب کچھ قبول کرتا گیا۔ سمجھوتا  
تو اس نے بہت پہلے سیکھ لیا تھا۔

تعلیم کے معاملے میں وہ ہونمار ثابت ہوا۔ ذہانت کی اس میں کوئی کمی نہیں تھی  
وہ اسکول میں چھا گیا۔ پڑھائی میں بھی اور کھیل کے میدان میں بھی۔ وہ بہت اچھا کرا  
تھا..... بے رحم باؤلر۔ میچ کے دوران جو ٹیس مین اسے اپنی ٹیم کے لیے خطرہ محسوس  
ہوتا۔ اسے یوسف کے باؤلرز کے سامنے مدافعتیہ انداز اختیار کرنا پڑتا۔ دوسری صورت  
میں اسکو ربک میں اس کے نام کے آگے ریٹائرڈ ہٹ لکھا جاتا۔

وہ انگریزی بہت روانی سے بولتا۔ اس پر اس کی وجاہت! قد بھی اس نے خور  
نکالا تھا۔

اس نے میٹرک کا امتحان دیا تھا کہ میگ اور مسٹر ڈیوڈ سن کا خدا کے ہاں بلاوا آگیا  
ان دونوں کی موت بھی ایک حادثے میں ہوئی۔ اس بار موت نے اسے کچھ دیا اور کچھ  
چھینا۔ مسٹر ڈیوڈ سن کا وارث ہونے کی حیثیت سے اسے تین ہزار روپے ملے لیکن وہ۔  
گھر بھی ہو گیا۔ وہ بدستور اس فلیٹ میں رہ سکتا تھا مگر حقیقت پسندی نے اسے بتا دیا کہ  
اس کے فلیٹ میں رہائش کا تمہل نہیں ہو سکتا۔ اسے عملی زندگی میں قدم رکھنا تھا چنانچہ  
اس نے فلیٹ کا بیشتر سامان فروخت کر دیا اور قریب ہی ایک کمرے کا ڈربے نما فلیٹ خر  
لیا۔ ماں کی چادر اب بھی اس کے پاس تھی۔ کئی برس پہلے اس نے اسے دھلو کر احتی  
اسے رکھ لیا تھا۔ استعمال میں بھی نہیں لاتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ چادر پھٹے۔ کب  
تنہائی محسوس ہوتی تو چادر کو سینے پر رکھ کر آنکھیں بند کر لیتا۔

تدفین کے بعد وہ مسٹر ڈیوڈ سن اور میگ کی قبر پر ایک بار بھی نہیں گیا۔ اسے اپ  
ماں کی قبر کا علم تک نہیں تھا۔ ایسے میں قبروں کی کیا اہمیت رہ جاتی ہے۔ اب اس بات  
بارہ سال گزر چکے تھے۔ اب وہ ۳۲ سال کا تھا۔ اس دوران وہ ہر طرح کی ملازمتیں کرچ  
تھا۔



اس نے چائے کا ایک طویل گھونٹ لیا۔ چائے کی کڑواہٹ کے ڈر سے پیٹ می  
چلتی بھوک سم کر بیٹھ گئی تھی۔ چائے کا یہ فائدہ سب سے بڑا تھا کہ بھوک لگے اور کھا

مل کر کرتے تھے۔ جدوجہد کی ان تین ستوں میں ایک مثبت تھی، پہلی اور دوسری دونوں منفی تھیں۔ گویا ہر شخص کم از کم دو تہائی منفی تھا اور ایک تہائی مثبت اور مثبت بھی وہ صرف اپنے لیے تھا۔

وہ بقا کی جدوجہد نہیں تھی کیونکہ بقا کی جدوجہد سے وہ بخوبی واقف تھا۔ وہ تو کامیابی کی بلند ترین چوٹی تک پہنچنے کی جدوجہد تھی۔ اور اس میں ہر شخص خود تک پہنچنے والے کو دھکیل کر نیچے گرانے کے درپے تھا۔ یہ سفاکی تھی، غیر انسانی حد کو پہنچی ہوئی خود غرضی تھی کیونکہ معمولی خود غرضی تو انسان کی بقا کے لیے ضروری ہے۔ اس کا اپنا مسئلہ صرف بقا کا تھا۔ وہ صرف ان لحوں میں خود غرض اور سفاک ہوتا تھا، جہاں اس کی بقا داؤ پر لگ جائے یا مفادات متصادم ہوں۔ اس نے اپنی بے اصولی کو بھی اصول کی چار دیواری میں رکھا تھا لیکن دنیا میں، کاروباری لوگوں کے نزدیک اسارٹ ہونا ناقابل قبول تھا۔ ایسے شخص کو فوراً ملازمت سے علیحدہ کرنا ضروری تھا اور اسارٹ کون ہوتا ہے؟ جو ذہن ہو، بہت جلدی ہر بات کی تہہ تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتا ہو اور جس میں آگے بڑھنے کی خواہش شدید ہو۔

اور وہ اسارٹ آدمی تھا۔ اسی لیے وہ کہیں تک کر کام نہیں کر سکتا تھا۔ اس خواری میں اس نے ایک مکتہ سمجھ لیا تھا۔ وہ یہ کہ خود کو اس حد تک دوسرے کی ضرورت بنا دو کہ تمہارا مقابل اسے میسر نہ رہے۔ انسانوں کے اس جنگل میں قانون بقا کی پہلی شق یہی ہے۔

اسے انٹر اسکول کرکٹ ٹورنامنٹ کا میچ یاد آگیا۔ وہ سبھی فاسٹ کھیل رہے تھے اور مخالف ٹیم نے پہلے بیٹنگ کی تھی، ۳۷ رنز پر ان کے آٹھ کھلاڑی آؤٹ ہو چکے تھے۔ لیکن دسویں نمبر پر آنے والا بیٹس مین، جو درحقیقت فاسٹ باؤلر تھا، سیٹ ہو گیا تھا۔ سکور ۷۰ ہو گیا تھا اور بظاہر ۶۰ رن پر بیٹھ جانے والی ٹیم پھر سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ میچ ان کے ہوم گراؤنڈ پر ہو رہا تھا۔

۷۰ کے اسکور پر وائر ٹائم ہوا۔ اس کے کلاس ٹیچر، جو ٹیم کے کوچ بھی تھے، اسے ایک طرف لے گئے۔ ”یہ کیا کر رہے ہو تم؟ میچ پر اچھی بھلی ہماری گرفت تھی۔ اب ڈھیلی پڑ رہی ہے۔ یاد رکھو، ڈھسے جانے والی ٹیم جب اٹھ کھڑی ہو تو اس کا مورال کہیں کا کہیں پہنچ جاتا ہے۔ اگر انہوں نے سو رنز بھی بنا لیے تو یقین کرو، وہ فیلڈنگ اور باننگ میں جان لڑا دیں گے“ ان کے لہجے میں برہمی تھی۔

ہوگی ایک لوہار کی۔ سوچنا صرف اتنا تھا کہ کس سمت میں ہاتھ مارا جائے۔ اسے اپنی ذہانت پر اعتماد تھا۔ وہ عام سی صورت حال سے اچھا اور بڑا موقع تراشنے کی اہلیت رکھتا تھا۔

وہ اس شہر کی سڑکوں پر برسوں سے جوتے چٹا رہا تھا۔ وہ کچھ کرنا چاہتا تھا۔ ایسا کام جس کے بعد زندگی فراغت سے گزرے۔ ایسا کام، جو جلدی سے تکمیل پا جائے۔ ایسا کام جس میں دشواری ہو نہ محنت کرنی پڑے۔ وہ زندگی کے سمندر میں..... آخری سرے تک پہنچ گیا تھا۔ اسے فوری طور پر سہارا تلاش کرنا تھا ورنہ غرقابی یقینی تھی لیکن ایسا لگتا تھا کہ دنیا میں توانائی اور ذہانت سے لبریز کسی نوجوان کے لئے کوئی مقام نہیں۔ وہ گڑھے میں کھود سکتا تھا، کلر کی نہیں کر سکتا تھا۔ ہاں، وہ انسانوں کو چاند پر پہنچانے کے لئے ٹریولنگ ایجنسی قائم کر سکتا تھا اور اس میں وہ بے حد کامیاب بھی رہتا مگر اس کے لیے سرمائے کی ضرورت تھی۔ نہ جانے کیوں ہر امکان کی تان، مگر اور لیکن ہی پر آکر ٹوٹتی تھی۔

اس نے ہر کاروبار کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ ہر دکان پر سیلز مین، دکان کے مالک کے لیے کمائی کر رہے تھے۔ اس کے عوض انہیں زندگی کے لیے تھوڑا سا زور راہ مل جاتا تھا۔ ہر کاروبار سستا خریدو اور مہنگا بیچو کی بنیاد پر چل رہا تھا۔ تجوریاں بھر رہی تھیں اور اشیائے ضرورت مہنگی ہوتی جا رہی تھیں۔ پہلے انسان انسان کو کھلم کھلا خرید کر غلام بناتا تھا، اب اس نے ڈیپو میسی سیکھ لی تھی اور اتنے نت نئے حربے استعمال کرتا تھا کہ غلام آزادی کے وہم میں مبتلا رہتا تھا لیکن اسے اس کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا کہ غلامی کی غیر مرئی زنجیر نے اس کی آزادی کو ایک دائرے تک محدود کر دیا ہے۔

نوکری ملنا بھی کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اچھے ملازم کی تعریف یہ تھی کہ وہ بے وقوف ہو، اس میں اپنے حال پر قانع رہنے کی صلاحیت ہو، کاروباری امور کو سمجھنے کی اہلیت سے یکسر محروم ہو اور محنت کے معاملے میں گدھے سے بڑھ کر ہو اور چیونٹی کی طرح بے زبان ہو۔ جو ملازم کاروباری گھر سمجھنے لگے، اسے فوری طور پر ملازمت سے نکال دیا جاتا تھا کہ کہیں کسی برے وقت میں کاروباری حریف بن کر مقابل نہ آکھڑا ہو۔ ہر بڑے کاروباری کو زبردست جدوجہد کرنا پڑتی تھی..... تین جتوں میں۔ ایک تو اپنے کاروبار کو ترقی دینا، دوسرے اپنے کاروباری حریفوں کو ہر طریقے سے زک پہنچانے کی کوشش کرنا اور ان کو دیوالیا کرنے کی کوشش کرنا۔ تیسرے اپنے لیے اور اپنے حریفوں کے لیے مزید کسی حریف کے ابھرنے کے امکان کی روک تھام کرنا۔ یہ تیسرا کام وہ تھا، جو تمام حریف

”لیکن سر! میں تو ہر ممکن کوشش کر رہا ہوں۔“ اس نے احتجاج کیا۔  
 ”خاک کوشش کر رہے ہو!“ کلاس ٹیچر ولیم نے کہا ”پچھلے تین اور زمیں تم نے ایک باؤنسر بھی نہیں کیا۔“

”لیکن سر! وہ ٹیس مین نہیں ہے۔ میں اسے باؤنسر کیسے کر سکتا ہوں؟“  
 ”کیوں نہیں کر سکتے؟“ مسٹر ولیم نے بھنا کر کہا ”نہیں کراؤ گے تو سارے کے کرائے پر پانی پھیر دو گے۔ وکٹ کی حالت دیکھ رہے ہو؟“

”جی ہاں۔ بہت خراب کنڈیشن ہے۔ گڈ لیٹم پر بہت خطرناک اسپاٹ ہے۔“  
 ”ہاں..... اور میرے منصوبے کے عین مطابق ہے۔ اسی لئے ٹاس جیتنا اہم تھا اور اسی لیے ٹاس جیت کر ہم نے انہیں بیٹنگ دی ہے۔“

وہ چکرا گیا ”اور اب ہمیں خراب تر وکٹ پر بیٹنگ کرنا ہوگی۔“ اس نے کہا۔ ”اس طرح تو ہم بیچ شروع ہی میں ہار گئے۔“

”نہیں۔ تم یہ بات نہیں سمجھو گے۔ اگر کوئی ٹیم ۵۰ یا ۶۰ رن پر آؤٹ ہو جائے تو اس کا مورال ڈاؤن ہو جاتا ہے وہ فیلڈ میں اترنے سے پہلے ہی شکست خوردگی قبول کر لیتی ہے اور ایسی ٹیم کبھی نہیں جیت سکتی لیکن اس وکٹ پر انہوں نے سورنر کر لیے تو سمجھو ہم ڈوب گئے۔“

”میں کیا کر سکتا ہوں سر؟“  
 ”اسے باؤنسر کراؤ! حق! یا تو وہ آؤٹ ہو جائے گا یا زخمی ہو جائے گا۔“

”وہ ریگولر ٹیس مین نہیں ہے سر! میں اسے باؤنسر نہیں کر سکتا۔“  
 ”یہ کوئی تحریری قانون نہیں اور تم فرسٹ کلاس کرکٹ نہیں کھیل رہے ہو۔“

مسٹر ولیم نے سخت لہجے میں کہا۔

”پھر بھی سر! غیر تحریری قوانین کا بھی باقاعدہ احترام کیا جانا چاہئے خواہ کسی بھی لیول کی کرکٹ کھیلی جا رہی ہو اور پھر اس کی ضرورت کیا ہے؟“

”میں بتاتا ہوں۔ اگر وہ آؤٹ ہو گیا تو ٹیم کو فائدہ پہنچے گا اور زخمی ہو گیا تو دہرا فائدہ ہو گا۔ مخالف ٹیم اس وکٹ پر ایک فاسٹ بالر سے محروم ہو جائے گی۔ یقین کرو! اس صورت میں ہم بیچ بہ آسانی جیت لیں گے اور اگر وہ زخمی نہ ہوا تو تم جانو! میں اس بار تمہیں دن ڈاؤن بھیج رہا ہوں۔ اس بالر کو فیس بھی تم ہی کرو گے۔“

”لیکن میرا نمبر تو.....“

”ضرورت کے مطابق بیٹنگ آرڈر تبدیل کرنا پڑ رہا ہے۔ اس وکٹ پر ریگولر ٹیس مین سے زیادہ تم جیسے ہٹر کا چانس ہو گا۔ اسکو تھوڑا ہو گا اور تم تین چار چوکوں چھکوں سے پانسا پلٹ دو گے۔“

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ دن ڈاؤن بیٹنگ! اسے اپنے سر کی عایت خطرے میں نظر آنے لگی۔

”اب اگر اس کے بعد تم کرکٹ نہیں کھیلنا چاہتے تو تمہاری مرضی۔“ مسٹر ولیم نے سرد لہجے میں اسے دھمکایا اور پولیٹین کی طرف چلے گئے۔

وہ کھڑا سوچتا رہا۔ یہ بات طے تھی کہ مسٹر ولیم کا حکم نہ ماننے کی صورت میں وہ اسکول کی ٹیم سے ہمیشہ کے لیے خارج ہو جاتا۔ زخمی ہونے کا امکان الگ تھا اور پھر ٹیم فاسل میں بھی نہیں پہنچتی۔ ہر طرف خسارہ ہی خسارہ تھا۔

وائر ٹائم کے بعد پہلا اوور اسی کا تھا۔ سامنے مخالف ٹیم کا وہی فاسٹ بالر تھا جو فساد کی جڑ تھا۔ اس نے پہلی گیند اسٹمپس پر کرائی جسے ٹیس مین نے سکون سے روک کر کھیل دوسری گیند تیز رفتار تھی اور آف اسٹمپ پر پڑ کر باہر کی جانب مود ہوئی۔ ٹیس مین بیٹ ہو ا۔ گیند درحقیقت اس کے بیٹ کے بہت قریب سے گزری تھی۔ تیسری گیند اس نے گڈ لیٹم کے اسپاٹ پر ڈالی۔ ٹیس مین کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اتنی اٹھے گی۔ وہ بڑے سکون سے بیک فٹ پر گیا لیکن گیند بہت تیزی سے اٹھی۔ ٹیس مین نے بے اختیار بلا اوپر اٹھا کر خود کو بچانا چاہا۔ اس نے منہ بھی پھیر لیا مگر گیند اس کے جڑے پر لگی۔ اس کے ہاتھ سے بلا چھوٹ گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا جڑا تھما اور بیٹھتا چلا گیا۔

مخالف ٹیم ۷۰ کے اسکور پر ہی آل آؤٹ ہو گئی اور اس کی ٹیم نے وہ بیچ دس وکٹ سے جیت لیا۔ اس دن کے بعد اس نے خود کو اسکول کرکٹ ٹیم کا لازمی جز ثابت کر دیا۔ مسٹر ولیم کو پھر کبھی اسے کچھ سمجھانے کی ضرورت نہیں پڑی۔

اگلے سال اس نے میچوں پر شریٹس لگانی شروع کر دیں۔ اچھی خاصی آمدنی ہونے لگی۔ ایک بار ٹائڈنسکی میں وہ انٹر اسکول کرکٹ بورڈ کے ایک عمدے دار سے شرط لگا بیٹھا جسے اس کے سلسلے میں پہلے ہی شکایات مل چکی تھیں۔ یوں وہ رنکے ہاتھوں پکڑا گیا اور اس کے کھیلنے پر پابندی لگا دی گئی۔ یہ اس کی حقیقت پسندی تھی کہ وہ آج بھی اس سلسلے میں خود کو ہی قصور وار ٹھہراتا تھا حالانکہ وہ راسنہ اسے مسٹر ولیم ہی نے دکھایا تھا اور



کے لئے سلسلے وار کہانی بھی لکھی تھی۔ اس سلسلے وار کہانی کی چھ قسطوں کے بعد ڈائجسٹ کی اشاعت چھ گنا ہو گئی تھی۔ اس نے پبلشر سے معاوضے میں پچاس فیصد اضافے کا مطالبہ کیا تو وہ اس معاوضے سے بھی گیا، جو اسے مل رہا تھا۔ پبلشر نے اس کے مقابلے میں آدھے معاوضے پر مختلف مصنفین سے قسطیں لکھوانی شروع کر دیں۔ کہانی کیونکہ کردار کے نام سے چھپ رہی تھی، اس لیے وہ اف بھی نہ کر سکا۔ آخری قسط کا معاوضہ اب تک نہیں ملا تھا۔ وہ جب بھی جاتا، جواب ملتا۔ ”بے صبرے نہ بنو، مل جائے گا یا! اس ملک میں کوئی صبر ہی نہیں کرتا۔“ اب اس بات کو ایک سال ہو گیا تھا اور وہ سچ سچ صبر کر بیٹھا تھا جو کہ مدیر صاحب کے بقول اس ملک میں عقاب ہے۔ دوسری طرف اسے یاد تھا کہ ایک بار قسط پہنچنے میں تاخیر ہو گئی تھی تو مدیر صاحب نے اس کے گھر کے بارہ اور پبلشر صاحب نے تین چکر لگائے تھے بلکہ دھرنادے کر بیٹھ گئے تھے، جیسے تخلیق بھی کوئی مشینی کام ہو۔

واقعی، اس ملک میں کوئی صبر نہیں کرتا!

اب اس کی سادھ کا یہ عالم تھا کہ ہر طرف ایک ہی بات کہی جاتی۔ ”ارے، وہ یوسف عالم! آدمی اچھا ہے بھائی، ذہین بھی ہے مگر ضرورت سے بہت زیادہ۔ اس سے کام لیتے ہوئے ہر وقت اس پر نظر رکھنا ہوتی ہے۔ لگتا ہے، کسی بھی وقت ہمیں بے دخل کر کے تمام کاروبار کا مالک بن بیٹھے گا۔“

”مرنا تو سبھی کو بے میاں!“

اس نے پھر چونک کر دیکھا۔ بڑے میاں نے اخبار نہ کر دیا تھا اور اسے ہلا رہے تھے۔

”سب ٹھٹ پڑا رہ جائے گا جب لاڈ چلے گا بھجارا۔“ بڑے میاں نے مزید گل افشانی کی۔ ”میں، تم..... یہاں تک کہ جینا میکم کو بھی مرنا پڑے گا۔ اس کی تمام دولت، اربوں روپے بھی اسے مرنے سے نہیں بچا سکیں گے۔ سب بینک میں دھرے رہ جائیں گے..... بے کار! شادی کر لی ہوتی اس نے تو کم از کم اس کی اولاد ہی اس دولت سے کچھ فیض یاب ہو جاتی۔ سچ ہے، پیسے سے کچھ نہیں ملتا۔ اب کتنی خوف زدہ ہو گئی وہ۔“

اس نے اس پوری تقریر میں صرف ایک لفظ سنا ”دولت“ اور پھر اس دولت کا حساب جو اربوں میں تھا۔ پھر اسے خیال آیا کہ جینا میکم کا نام تو جانا پچھتا ہے۔ ”ذرا یہ

وہ اس کے پارنٹر بھی تھے۔ یہ اس کی حماقت اور نااہلی ہی تو تھی کہ صرف وہ پکڑا گیا! اس وقت سے اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ذہانت کے ہتھیار کو عیاری کے ہاتھوں میں دے کر استعمال کرے گا اور خود کو کسی کے لیے بھی استعمال کی چیز نہیں بننے دے گا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ ہر چیز اور ہر شخص کے لیے دنیا میں اخلاقی ضابطوں کے دو سیر ہوتے ہیں اور دنیا انسانوں کے دو دھڑوں میں بٹی ہوئی ہے..... بے وقوف انسان اور عقل مند انسان۔ عقل مند انسان اس نے بہت دیکھے تھے، جیسے مسٹرولیم، جنہوں نے سیکر فائسل جیتنے کے لیے اس کے ہاتھوں مخالف ٹیم کے باؤلر کو زخمی کرایا تھا۔ جو شرمیں لگا کر اپنی پوزیشن خطرے میں نہیں ڈال سکتے تھے چنانچہ انہوں نے اسے اپنا میڈیم بنا لیا تھا۔ اسے وہ قلفی والا بھی یاد تھا، جس نے سستی قلفی، بنانے کے چکر میں زہریلی قلفی بنا دی تھی، جس کی آمدنی تین روپے ہوتی تھی اور بارہ بچے اس کی قلفی کھا کر اسپتال پہنچ گئے تھے۔ بعد میں ان میں سے دو نے قبرستان کا رخ کیا تھا۔ اس نے وہ سیاست داں بھی دیکھے تھے جو اشتعال پھیلا کر لوگوں کو لڑواتے تھے تاکہ انہیں پریس کانفرنس کا موقع مل جائے اور وہ کوئی زوردار ہمدردانہ بیان دے کر اپنی عوام دوستی کا پرچار کر سکیں۔ وہ سب عقل مند انسان تھے اور ان کے ہاتھوں خسارہ برداشت کرنے والے بے وقوف تھے۔ یہ شمار یاتی حقیقت تھی کہ دنیا میں عقل مند کم تھے اور بے وقوف بہت زیادہ۔ تاریخ بتاتی ہے کہ شاہوں اور ان کی رعایا کے درمیان عددی تناسب کیا ہوتا ہے۔ شہنشاہیت بظاہر ختم ہو گئی تھی لیکن درحقیقت دنیا میں ختم تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ بس انداز، چہرہ اور روپ بدل جاتا ہے۔

اسے بد معاشی پسند نہیں تھی۔ وہ کسی کو تکلیف پہنچانے کا قائل بھی نہیں تھا البتہ شعبہ بازی میں کوئی حرج نہیں تھا۔ سادہ پانی کو آب حیات کہہ کر فروخت کرنے میں تو کسی کا کچھ نہیں بگڑتا۔ امریکی لوگ اس کا آئیڈیل تھے۔ وہ شارٹ کٹ کو اہمیت دیتا تھا اور ریکٹ کی افادیت کا قائل تھا۔ اپنے ملک میں ہونے والے جرائم اس کے نزدیک شرم ناک تھے۔ یہاں ذہانت کی جگہ تشدد تھا۔ اغواء قتل، اچکا پن سب کچھ گھٹیا تھا۔ دماغ استعمال کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی جاتی تھی۔

وہ اب تک ناکام تھا تو اس کی جزوی ذمے داری حالات پر اور باقی اس کی بد قسمتی پر عائد ہوتی تھی۔ اس نے اتنے کام کئے تھے کہ پوری طرح سب کو یاد بھی نہیں کر سکتا تھا۔ سیزمین، رپورٹر، فلمی کہانی نویس، مترجم، کلرک اور ریڈیو اناؤنسر۔ اس نے ایک ڈائجسٹ

ملے میں وہ امریکیوں کو بے وقوف سمجھتا تھا۔ یہ بھی بھلا کوئی ذہانت ہوئی کہ کسی نوجوان نے دولت کی خاطر کسی بڑھیا سے شادی کر لی۔ نہیں بھئی، یہ بات تو بس ناقص العقل ورتوں پر چلتی ہے۔ اور جس عورت نے اپنی جوانی میں کسی مرد کو اپنی دولت میں شریک میں کیا، وہ اب ۷۵ سال کی عمر میں یہ حماقت کیوں کرے گی؟ خواہ کتنی ہی ناقص العقل کیوں نہ ہو۔ پھنسانے سے اس کی مراد کچھ اور تھی..... کسی کمزوری سے فائدہ اٹھانا۔ ہ جانتا تھا کہ جینا میکم کی دولت کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ اس کے ان گنت کارخانے تھے، امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس الگ تھا۔ اس کے پاس سے لاکھوں کہیں نکل جاتے تو سے پتا بھی نہ چلتا۔ سوال یہ تھا کہ اسے کیسے پھنسایا جائے؟ ویسے اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ ان تلوں میں تیل ہے بھی اور نکالا بھی جاسکتا ہے۔ اسے صرف اپنے دار کی مت کا تعین کرنا تھا۔

اس نے پھر اخبار پر نظر ڈالی۔ اخبار میں اس کی سیکریٹری کا بھی تذکرہ تھا۔ راحیلہ میکم ذیشان۔ عجیب نام تھا یہ۔ اسے خواہ مخواہ راحیلہ میکم ذیشان پر رشک آنے لگا۔ وہ جو لڑکی بھی ہوگی، یقیناً کوئی ہشیار اور ذہین عورت ہوگی۔ اس نے جینا میکم کے ذریعے اپنے لیے ایک محفوظ مستقبل کا بندوبست کر لیا تھا۔

اس نے راحیلہ میکم ذیشان کا تصور کیا۔ وہ بھنبے بھنبے ہونٹوں اور سنگی چہرے والی جیڑ عمر و شیرہ ہی ہو سکتی ہے، جس نے اپنے ایام شباب کو بڑھاپے کے تحفظ کی خاطر جینا بلکم کے کنوار پن کی چوکھٹ پر بھینٹ چڑھا دیا ہوگا اور وہ یقیناً جینا کی دور پرے کی رشتہ دار بھی ہوگی۔ اسے یہ یقین بھی ہو گیا کہ جینا کے خیال کے برعکس، محکمہ انکم ٹیکس اور حکومت تو نہیں البتہ اس کی بے رنگ، بے بو اور بے ذائقہ سیکریٹری مس راحیلہ میکم ذیشان اس کی موت کی شدت سے منتظر ہوگی کیونکہ جینا میکم کا کوئی رشتہ دار کبھی سامنے میں آیا تھا۔ اس صورت میں راحیلہ ہی کو اس کی تمام دولت ملنی تھی۔ تمام دولت نہ ہی اس دولت کا ایک حصہ تو اسے ملے گا ہی اور جینا کی دولت کا ایک چھوٹا سا حصہ بھی تین پشتوں کے لیے تو یقیناً کافی ثابت ہوگا اور اس وقت تک مس راحیلہ بھی جینا کی رح تھا، بے رنگ اور خوشیوں سے محروم زندگی سے سمجھوتا کر چکی ہوگی۔

یوسف کو دولت کی طلب بھی تھی۔ وہ دولت کی اہمیت کا منکر بھی نہیں تھا لیکن اس کے نزدیک زندگی کی، اس کی مسرتوں کی اہمیت بھی برابر کی تھی۔ اس کے نزدیک یہ دنیا کی بدترین حماقت تھی کہ آدمی دولت کے بدلے زندگی سے، دنیا کی ہر خوشی سے دست

اخبار دکھائیں مجھے۔“ اس نے بڑے میاں سے متوجہ نہ کیا۔

”ہاں میاں ضرور۔ اخبار ہوٹل کا ہے۔“ یہ کہہ کر بڑے میاں نے اخبار اس کی طرف بڑھا دیا۔

اس نے اخبار کا اندرونی صفحہ کھولا۔ اوپر ملک کی سب سے دولت مند خاتون جینا میکم کی تصویر تھی اور نیچے مختصر سا انٹرویو، جو اس کی ۷۵ ویں سالگرہ کے موقع پر لیا گیا تھا۔ اس نے غور سے جینا میکم کی تصویر کو دیکھا۔ آنکھوں سے سختی اور برہمی جھلک رہی تھی۔ اس کی ناک عقاب کی چونچ سے مشابہ تھی۔ وہ بہت بوڑھی تھی مگر اس کا انداز شاہانہ اور پُر وقار تھا۔ وہ انٹرویو پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔

انٹرویو کے وقت مس جینا میکم کے ساتھ ان کی سیکریٹری راحیلہ میکم ذیشان بھی تھی۔ مس جینا میکم نے حکومت کی سفاک ٹیکس پالیسیوں کی پر زور مذمت کی اور کہا کہ حکومت صنعت کاروں اور سرمایہ داروں کی حوصلہ شکنی کر رہی ہے، جس کی وجہ سے بے روزگاری کا مسئلہ شدت اختیار کر گیا ہے۔ واضح رہے کہ مس جینا اور حکومتوں کے درمیان یہ چپقلش گزشتہ بیس سال سے چل رہی ہے۔ مس جینا نے تلخ لہجے میں کہا۔ یہ لوگ میرے مرنے کے منتظر ہیں تاکہ میری دولت ہتھیا سکیں لیکن یہ کبھی کامیاب نہیں ہوں گے کیونکہ میں انہیں مایوس کر دوں گی۔ موت کی طرح۔ اور یہ سب میری موت کے منتظر ہی اس دنیا سے رخصت ہو جائیں گے۔ میں ان سے پہلے مرنے والی ہرگز نہیں.....“

”کیوں؟ ہے نا بکواس؟ بے تکی باتیں؟“ بڑے میاں بولے۔

اس نے کچھ جواب نہ دیا۔ وہ پڑھ کر اس کے ذہن میں گھٹی سی بجنے لگی۔ پھر اسے یاد آئی گیا۔ جینا ہر سال اپنی سالگرہ کے موقع پر ایسا ہی ایک بیان چھپواتی تھی، جیسے انہیں چڑا رہی ہو..... دیکھ لو، میں اب بھی زندہ ہوں، یہ ایک طرح کا مذاق تھا اس کا۔

”جی ہاں، نری بکواس ہے۔“ بالآخر اس نے جواب دیا۔ ”موت ہی تو ایک ایسی چیز ہے، جس سے بچنا ناممکن ہے۔ اگر وہ سمجھتی ہے کہ انکم ٹیکس والوں کی طرح موت کو بھی چکر دے لے گی تو یہ اس کی بھول ہے۔“

اس کے ذہن میں اس وقت صرف ایک چیز گردش کر رہی تھی اور وہ یہ کہ اگر کوئی چکر چلا کر جینا میکم کو پھنسایا جائے تو اتنی دولت مل سکتی ہے کہ عمر بھر کچھ کرنے کی ضرورت نہ پڑے مگر پھنسانے سے اس کی مراد امریکہ اسٹائل کا پھنسانا ہرگز نہیں تھا۔ اس

سوچ میں اچھوتا پن ہو، آئینڈیا بالکل نیا ہو تاکہ ناکامی کا کوئی سوال نہ رہے.....  
”جی ہاں۔ مجھے یقین ہے کہ بڑھیا کا دماغ چل گیا ہے“ اس نے بڑے میاں سے

کہا۔

”اور کیا۔ بھلا ہمیشہ کوئی زندہ رہ سکتا ہے؟ بلکہ زندگی کا تو ایک لمحے کا بھروسہ بھی نہیں“ بڑے میاں نے نہایت تندہ لہجے میں کہا۔ انداز میں مسرت بھی تھی، جیسے وہ سوچ رہے ہوں کہ اگر میں ہمیشہ نہیں جی سکتا تو کوئی اور بھی نہیں جی سکتا۔ پھر وہ اٹھ کر کاؤنٹر کی طرف چل دیے۔

اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر دس روپے کے آخری نوٹ کو پھر سلایا۔ وہ سوچتا چاہتا تھا اور اس کے لیے چائے اور سگریٹ ضروری تھی۔ جیب میں صرف چھ سگریٹ اور دس روپے..... بلکہ صرف ساڑھے آٹھ روپے تھے۔ ڈیڑھ روپے کی تو وہ چائے پی چکا تھا۔ سگریٹ کے سلسلے میں اس نے نہ جانے کیسے ضبط کیا تھا۔ ورنہ چائے کے بعد تو سگریٹ کی طلب ناقابل برداشت ہوتی تھی۔ کچھ سوچ کر اس نے فیصلہ کیا کہ مزید چائے پی جائے۔ یہ ایک طرح کی انویسٹ منٹ ہے اور ضرورت پڑی تو سگریٹ بھی خریدی جائے گی۔

اس نتیجے پر پہنچتے ہی اس نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ اور ماچس نکالی۔ پیکٹ میں سے سگریٹ نکال کر اس نے ہاتھ بڑھا کر سگریٹ کو جام کی طرح بلند کیا، جیسے جام سے جام نکلا رہا ہو اور زیر لب کہا ”مستقبل کے نام“ پھر اس نے سگریٹ ہونٹوں میں دبا کر دیا دسلٹی جلائی اور سگریٹ سلگائی۔ بے تابانہ گہرا کش لے کر اس نے دھواں نیچے اتارا اور جلتی ہوئی تیلی کو دیکھتا رہا، جو ایک لمحے بعد خود ہی بجھ گئی۔ سگریٹ کا پسلا کش لیتے ہی جیسے وہ تازہ دم ہو گیا۔ دماغ میں جیسے دھوپ کے رخ پر کوئی کھڑکی کھلی، ہر طرف روشنی ہی روشنی ہو گئی۔

”شم مس! اے او شم مس! ایک چائے اور بول دے پشاور!“

کچھ دیر بعد چائے بھی آگئی۔ وہ باری باری چائے کا گھونٹ اور سگریٹ کا کش لیتا رہا۔ اس دوران اس نے اخبار کا وہ حصہ، جس میں جینا میکم کا انٹرویو چھپا تھا، تہہ کر کے مختصر کیا اور اپنی جیب میں رکھ لیا۔ نہ جانے کیوں، اخبار جیب میں رکھتے ہوئے اسے ایسا لگا، جیسے وہ جینا کی دولت کا ایک بڑا حصہ اپنی جیب میں رکھ رہا ہو۔

چائے ختم کر کے اس نے ایک اور سگریٹ سلگائی اور کاؤنٹر پر تین روپے ادا کر

بردار ہو جائے۔ اسے سب سے زیادہ قابل رحم وہ لوگ معلوم ہوتے تھے، جو دولت کمزور میں اتنے مصروف ہو جاتے ہیں کہ ان کے پاس اس دولت سے خوشیاں، آسائشات اور عیش خریدنے کی فرصت ہی نہ رہے۔ اس کا اپنا فلسفہ یہ تھا کہ دونوں چیزیں حاصل ہونی چاہئیں۔ ان میں سے کسی ایک سے دست برداری کا تصور اس کے لیے ناقابل قبول تھا۔ اسے حیرت ہوتی تھی کہ لوگ دولت سے اتنی بری طرح کیسے چٹ جاتے ہیں کہ موت جیسی اٹل حقیقت سے انہیں خوف آنے لگتا ہے۔ خوف تو آنا چاہئے لیکن اسے لیے نہیں کہ ان کی دولت جاتی رہے گی۔ موت سے خوف کی فطری وجہ تو یہ ہے کہ آدمی کو زندگی جیسی چیز سے محرومی کا قلق ہوتا ہے۔ آدمی مر جائے تو پرندے ہر صبح اس کے لیے خوش الحانی نہیں کرتے، سورج کی اولین کرنیں اسے گدگدانے کے لیے نہیں لپکتیں، صبح کی زور ہوا اس کے وجود سے لپٹنے کے لیے نہیں چلتی، تیز دھوپ میں درخت اس کے لیے سائے نہیں بچھاتے، بارش اس کے لیے نہیں ہوتی، پھول اس کے لیے نہیں کھلتے، دھنک اس کے لیے نہیں لہراتی، خوش گوار سرد چاندنی اس کے وجود میں بالکل نہیں چماتی، ستارے اسے دیکھ کر پلکیں نہیں جھپکاتے اور وہ شدید بھوک کے بعد پیٹ بھرنے کی ازلی، ابدی اور آفاقی لذت سے محروم ہو جاتا ہے۔ موت کے خوف کی وجہ زندگی سے محبت ہو تو یہ خوف مثبت ہے اور اگر اس خوف کی وجہ یہ ہے کہ اس کی محنت سے کمائی ہوئی دولت اس سے چھن جائے گی تو یہ منفی ہے۔ وہ جانتا تھا کہ بہت زیادہ دولت مند لوگ بہت زیادہ عملی ہوتے ہیں مگر صرف مڈوائف کے روپ میں..... دولت کے بطن سے مزید دولت پیدا کرانے کے سلسلے میں۔ اس سے ہٹ کر عام طور پر ان کا رویہ بے حد بچکانہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی بے حد ذہین آدمی انہیں بہ آسانی الٹا کر لوٹ سکتا ہے اور ان کی انہیں اس شخص کی خباثت کو سامنے بھی نہیں لانے دیتی کیونکہ اس صورت میں ان کی حماقت بھی تو سامنے آئے گی۔ وہ خود اپنے ہاتھوں بلیک میل ہوتے ہیں۔

اس نے بڑی شدت سے کندھے جھٹکے۔ آخر کھلی آنکھوں سے خواب دیکھنا بھی تو حماقت ہی ہے اور اسے حماقت سخت ناپسند تھی۔ دوسروں میں نہیں، صرف خود میں! کچھ وہ سوچ رہا تھا، جانتا تھا کہ اس سے پہلے بھی بہت لوگ سوچ چکے ہوں گے، بہت سے اس وقت بھی سوچ رہے ہوں گے اور نہ جانے کتنے اس کے بعد بھی سوچیں گے لیکن صرف سوچنے سے تو کام نہیں بنتا۔ بات تو جب ہے کہ جو کچھ سوچا جائے، سو فی صد قابل عمل ہو اور سوچنے والا اس پر بہترین انداز میں عمل پیرا ہونے کی اہلیت بھی رکھتا ہو۔ پھر

کے باہر نکل آیا۔ اب اس کی جیب میں صرف سات روپے تھے.....

○-----○-----○

کافی دیر سوچنے کے بعد یوسف اس نتیجے پر پہنچا کہ پہلا مرحلہ عملی نوعیت کا ہے..... سرمائے کی فراہمی، چنانچہ اس نے مینار ڈائجسٹ کے دفتر کا رخ کیا۔ قسمتی سے پبلشر صاحب موجود تھے اور مزید خوش قسمتی یہ کہ اچھے موڈ میں بھی تھے بھئی یوسف! آؤ۔ میں ابھی تمہیں ہی یاد کر رہا تھا، انہوں نے چمک کر کہا۔

”خ..... خیریت تو ہے جناب؟“ اس نے گڑبڑا کر پوچھا۔

آفندی صاحب نے زور دار قہقہہ لگایا ”یار تم نے فلموں کی کہانیاں لکھیں، بتاؤ اداکاری کیوں نہیں کی؟ خوش شکل بھی ہو اور مین نے دیکھا ہے کہ تم میں اداکار بے پناہ صلاحیتیں بھی ہیں۔“

”بس صاحب! کسی پروڈیوسر کو آپ جیسی نظر ہی نہیں ملی۔ ویسے یہ فرمائیں“ مجھے یاد کیوں کر رہے تھے؟“ اس نے پرتشویش لہجے میں پوچھا۔

”ایک اور پرچا نکال رہا ہوں۔ سوچا، تم سے ایک قسط دار کہانی ہی لکھوا لوں۔“ ”اوہ! لیکن جناب، یہاں تو مالی پریشانیوں کی وجہ سے تخلیقی سوتے ہی خشک ہو ہیں۔ دیکھئے نا، یہ زمین کی زمین بھی عجب ہے۔ آسودگی کی کھاد اور فراغت کا پانی نہ۔“ ”لق و دق صحرا بن جاتی ہے۔“

”واہ بھئی واہ!“ آفندی صاحب پھڑک اٹھے ”تخلیقی سوتے خشک ہونے پر یہ ہے تو جاری ہونے پر کیا کرو گے؟“

”اس کا دور دور تک کوئی امکان نہیں۔“

”دیکھو میاں! ناممکن کچھ بھی نہیں“ انہوں نے کہا اور کچھ دیر سوچتے رہے۔ ”ایسا تھا، جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ آخر کار بولے ”میرا خیال۔ تمہاری آخری قسط کی پے منٹ ابھی تک مکمل طور پر نہیں ہوئی ہے۔“

”جی، پے منٹ تو جزوی طور پر بھی نہیں ہوئی“ اس نے دل کڑا کر کہا۔

”اوہ، ہوں“ وہ پھر سوچ میں پڑ گئے ”ہوں۔ تو پوری قسط کی پے منٹ واجب ہے۔ خیر.....“ ”یہ کہہ کر انہوں نے دراز کھول کر چیک بک نکالی، چیک لکھا اور اس طرف بڑھاتے ہوئے بولے، ”یہ پانچ سو روپے کا چیک لے جاؤ فی الحال۔ باقی رقم نئی کے معاوضے کے ساتھ مل جائے گی۔ ٹھیک ہے؟“

اس نے دل ہی دل میں غی قسط پر لعنت بھیجی لیکن بظاہر مسکراتے ہوئے بولا ”شکریہ“

”تو نئی قسط کب تک دے دو گے؟“ اس بار آفندی صاحب کے لہجے میں تشویش تھی۔

اس بار وہ سوچ میں پڑ گیا حالانکہ سوچنے کی کوئی بات نہیں تھی کیوں کہ اسے قسط لکھنی ہی نہیں تھی۔ پہلے تو اس نے سوچا کہ صاف انکار کر دے مگر اس صوت میں یہ بھی ممکن تھا کہ آفندی صاحب چیک کی پے منٹ رکوا دیتے۔ چنانچہ اس نے بڑے جوش سے کہا ”ٹھیک ایک ہفتے بعد مل جائے گی۔“

”گڈ۔ ویری گڈ“ آفندی صاحب بے حد خوش ہو کر بولے، ”تم نے انشاء اللہ نہیں کہا۔ اس کا مطلب ہے، قسط واقعی ایک ہفتے بعد مل جائے گی۔“

اس نے دانت نکال دیے ”آپ بہت سمجھ دار آدمی ہیں۔“ ”لیکن یار! آئیڈیا زور دار ہونا چاہئے، دھانسو قسم کا۔ پے منٹ کی تم فکر نہ کرو۔ جانتے ہو، ہم اس معاملے میں کتنے کھرے ہیں۔“

اس نے سوچا، مجھ سے زیادہ کون جانتا ہو گا کہ آپ پے منٹ کے معاملے میں کتنے کھرے ہیں..... کھرے اور کھوٹے۔ ”بالکل درست۔ آپ آئیڈیے کی بالکل فکر نہ کریں اور میں پے منٹ کی ذرا بھی فکر نہیں کروں گا“ اس نے بے حد سچائی سے کہا۔ ظاہر ہے، جب اسے لکھنا ہی نہیں تھا، تو دونوں پارٹیوں کے لیے فکر کی کوئی بات نہیں تھی۔

اگلی صبح اس نے چیک کیش کرایا۔ اب وہ بے فکری اور سکون سے سوچ سکتا تھا۔ وہ ہر کام میں ترتیب کا قائل تھا اور معلومات اور جزئیات کو بہت زیادہ اہمیت دیتا چنانچہ سب سے پہلے اس نے جینا میکلم پر تحقیقاتی کام کرنے کا فیصلہ کیا اس سلسلے میں اخبارات اور اخبار نویسوں سے بہت مدد ملتی ہے، اس کا اسے تجربہ تھا۔ اخبار نویسوں کے حلقے میں اس کے اچھے خاصے تعلقات بھی تھے۔

چنانچہ اس نے عمل کے پہلے مرحلے میں قدم رکھ دیا۔

○-----○-----○

جینا میکلم، کمرل رچرڈ میکلم کی بیٹی تھی۔ اس کی پیدائش ہندوستان میں ہوئی تھی۔ اس سے چھوٹا ایک بھائی تھا، چارلس میکلم۔ جس وقت ان کی ماں کا انتقال ہوا، چارلس

ہمت ہی نہ ہو لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسے بھائی سے نفرت ہو گئی ہو۔ وہ اب بھی اس سے محبت کرتی تھی..... اپنے انداز میں۔ اسے معلوم تھا کہ اس کا بھائی معاشی بحالی کا شکار ہے۔ وہ باپ سے چھپ کر بھائی سے ملتی تھی، لیکن مالی طور پر اس کی مدد کرنے کا خیال اس کے ذہن میں کبھی نہیں آیا۔ وہ بھائی کے بچوں کو دیکھ کر خوش ہوتی لیکن اس کی بیوی سے چڑتی۔ اب یہ عجیب بات تھی کہ بھائی کے بچے زیادہ عرصے جیتے میں تھے۔ سات سال میں اس کے بھائی نے پانچ بچے گنوائے۔ اس سلسلے میں بھی وہ چھپکے کا شکار تھی۔ اسے دکھ بھی ہوتا اور خوشی بھی۔

کرئل رچرڈ میکلم کی موت واقع ہوئی تو وہ ۳۵ سال کی تھی۔ باپ کی وصیت پڑھ کر اسے اندازہ ہوا کہ باپ اس کی محبت سے لاعلم نہیں تھا کیونکہ اس نے ہندوستان اور برطانیہ میں اپنی تمام دولت اور جائیداد چھوڑی تو اسی کے نام تھی مگر مشروط طور پر۔ اس نے وصیت نامے میں لکھا تھا کہ اسے یقین ہے، جینا جب بھی شادی کرے گی کسی ہندوستانی مسلمان سے کرے گی چنانچہ وہ اپنی تمام دولت اور جائیداد اس شرط پر اس کے م چھوڑ رہا ہے کہ جینا کبھی شادی نہ کرے اور اس جائیداد میں سے کچھ بھی چارلس کو نہ دے۔ البتہ چارلس کی اولاد کی بات اور ہے۔ دونوں شرطوں میں سے ایک کی بھی خلاف رزی ہوئی تو وہ جائیداد سے محروم ہو جائے گی۔ گویا تمام جائیداد حکومت کی ہو جائے گی۔ یانا کا شادی کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن اسے یہ جان کر دکھ ہوا کہ اس کے باپ نے اس پر تبار نہیں کیا، صرف اس لیے کہ وہ اس کی محبت سے واقف تھا۔

بہر حال، اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ برطانیہ کبھی نہیں جائے گی اس نے برطانیہ کی ام الماک فروخت کر دیں اور ہندوستان میں اپنا کاروبار مستحکم تر کرنے میں لگ ہو گئی۔ ارس سے وہ ہمیشہ کی طرح ملتی رہتی۔ اس کی معاشی بہتری اس کے سامنے تھی لیکن ارس نے اس سے کبھی مدد طلب نہ کی۔ طلب کی ہوتی، تب بھی وہ کبھی اس کی مدد نہ کرتی۔ اس کے نزدیک وہ معاشی، بہتری چارلس کی محبت کی کامیابی اور خواب کی تعبیر کی تھی اور قیمت ادا کئے بغیر تو کچھ بھی نہیں ملے۔ خود اس نے جو بے اندازہ دولت حاصل کی تھی، اس کی بھی قیمت ادا کی تھی۔ اس نے اپنے خواب جلائے تھے۔ اپنے فلوں سے اپنی محبت کا گلا گھونٹا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اسے اپنی دولت سے عشق تھا اور وہ مائیس سے کسی کو ایک دھیلا دینے کی بھی روادار نہیں تھی۔

پھر چارلس کے ہاں راحیلہ پیدا ہوئی۔ آثار و قرائن بتاتے تھے کہ یہ بچی زندہ رہے

تین سال کا اور جینا آٹھ سال کی تھی۔ کرئل رچرڈ میکلم جدی پشتی رئیس تھا۔ اسے اپنی بیٹی سے بہت پیار تھا، جو شروع ہی سے بے حد عملی تھی۔ چارلس آرمسک مزاج کا نرم خول کا تھا۔ کرئل نے ریٹائرمنٹ کے بعد برطانیہ واپس جانا چاہا لیکن جینا اور چارلس ہندوستان چھوڑنے پر رضامند نہ ہوئے چنانچہ کرئل نے ہندوستان میں کاروبار کرنے کا فیصلہ کیا اور وہیں سیٹل ہو گیا۔ اس نے ٹیکسٹائل مل سے شروعات کی تھی۔ جلد ہی اس کا صنعتی کاروبار بہت زیادہ پھیل گیا۔ یہی اسے جینا کی کاروباری سمجھ بوجھ اور بے پناہ انتظامی صلاحیتوں کا علم ہوا۔ اس کے برعکس چارلس کو پینٹنگ کے سوا کسی چیز میں دلچسپی نہیں تھی۔

پھر ہندوستان میں آزادی کی تحریک نے سر اٹھایا انہی دنوں کرئل رچرڈ کو زبردست ذہنی صدمہ اٹھانا پڑا۔ چارلس نے ایک ہندوستانی لڑکی سے شادی کر لی، جو مسلمان تھی۔ صرف یہی نہیں وہ مسلمان بھی ہو گیا..... اور خود کو ڈیٹان میکلم کہلانے پر مصر ہو گیا۔ کرئل میکلم کے لیے یہ سب کچھ ناقابل برداشت تھا۔ اس نے فوری طور پر چارلس کو عاق کر دیا اور صاف کہہ دیا کہ آئندہ وہ اس کی صورت دیکھنا بھی پسند نہیں کرے گا۔ وہ میکلم کا نام بھی استعمال نہیں کر سکتا، چنانچہ ڈیٹان میکلم، ڈیٹان احمد بن گیا۔

اس سانحے کے بعد کرئل کے لیے جینا ہی سب کچھ ہو گئی۔ جینا بھی اس سے بہت محبت کرتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نے باپ کی خاطر بہت بڑی قربانی دی۔ اس نے باپ کو علم ہی نہیں ہونے دیا کہ وہ خود بھی ایک مسلمان نوجوان سے محبت کرتی ہے۔ اس نے اپنی محبت کو قریان کر دیا۔ کچھ تو یوں کہ وہ اتنی بڑی جائیداد اور بے اندازہ دولت سے محروم نہیں ہونا چاہتی تھی اور کچھ اس لیے کہ وہ باپ کو مزید کسی صدمے سے دوچار کرنا نہیں چاہتی تھی۔ جانتی تھی کہ نیا صدمہ باپ کے لیے جان لیوا ثابت ہو گا چنانچہ وہ اپنا کرب سینے میں چھپائے کاروبار کی دنیا میں گم ہو گئی۔ باپ بستر سے لگ چکا تھا۔ اس نے خود کو باپ کی خواہشوں اور امنگوں کے سانچے میں ڈھال لیا۔ اس نے باپ سے ہر کاروباری رمز سمجھا اور اپنے طور پر اضافے بھی کئے لیکن اس انقلاب نے اندر ہی اندر اس کی شخصیت کو بیچ در بیچ بنا دیا۔ ایک بار فیصلہ کرنے کے بعد وہ اپنے محبوب سے کبھی نہیں ملی حالانکہ وہ اس کی خاطر بڑی آسانی سے مذہب تبدیل کر سکتی تھی۔ البتہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ چارلس سے حسد کرنے لگی، جس نے اپنی محبت کے حصول کے لیے کسی بھی چیز کی پروا نہیں کی تھی، اور ہر طرح کی محرومی کو یوں قبول کر لیا تھا جیسے اس کی کوئی



گی۔ چارلس کے معاشی حالات اب بھی ابتر تھے۔ لیکن بچی کو پا کر وہ اور اس کی دونوں خوش تھے۔

پھر حالات بدلے اور ہندوستان کی تقسیم کا مکان سامنے آیا۔ مسلمان اپنی لیے با ملکیت مطالبہ کر رہے تھے۔ دو اندیشہ جینا نے بھانپ لیا کہ ہندوستان بٹ کر رہے گا۔ نے ممکنہ پاکستان میں سرمایہ کاری شروع کر دی۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کا محرک کیا ممکن ہے، اس نے سوچا ہو کہ نئی مملکت میں کاروبار زیادہ سود مند رہے گا۔ بہر حال اسلئے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ تقسیم کی نوعیت کا اسے یقیناً علم رہا ہو وائسرائے سے اس کے بہت قریبی تعلقات تھے۔ اور جب پاکستان بنا تو وہ اپنا تمام تر وہاں منتقل کر چکی تھی۔

دوسری طرف اس کا بھائی بھی ہجرت کر کے پاکستان آگیا تھا۔ یہاں اس کی مو حالت اور ابتر ہو گئی تھی۔ جینا اپنے لیے ایک علیحدہ مملکت تعمیر کرنے میں مصروف ہو تھی۔ اب اسے صرف ایک ہی شوق تھا..... دولت سے دولت پیدا کرنے کا شوق۔ پھر ایک حادثے میں چارلس اور اس کی بیوی ختم ہو گئے راحیلہ اس وقت آ سال کی تھی۔ اس کا دنیا میں جینا کہ سوا کوئی نہیں تھا۔ جینا اسے اپنے ساتھ لے آئی اس نے باقاعدہ منصوبے کے تحت اس کی پرورش اور تربیت کی اور تعلیم دلائی.....

-----○-----○

یوسف ممکنہ طور پر تمام معلومات سے لیس ہو چکا تھا لیکن وہ حیران تھا کہ کام سے شروع کرے۔ وہ صرف اتنا جانتا تھا کہ اسے جینا میکم کے ہاتھوں کیا فروخت کرنا ہے لیکن وہ چیز کہاں سے ملے گی، کیسے ملے گی اور ملے گی بھی یا نہیں، ان تمام سوالوں کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اگر ابدی زندگی کا، ہمیشہ جینے کا کوئی فارمولا ممکن ہے اسے وہ فارمولا جینا میکم کو بیچنا تھا۔ یہ بات ناممکن تھی مگر ناممکن کو ممکن بنانا ہی اس کا تھا۔ وہ دنیا کا بہترین سلیزمن تھا اور ناموجود چیزیں تک فروخت کرنے کی اہلیت رکھتا تھا۔ بس ایک دشواری تھی۔ اس کے سامنے ایک گھاگ کاروباری عورت تھی، جس نے پور زندگی صرف خرید و فروخت میں گزاری تھی۔ اسے بے وقوف بنانا کوئی آسان کام نہیں اور پھر کوئی بنیاد بھی تو ہو!

سو اب وہ بنیاد تلاش کرتا پھر رہا تھا اور اسے یہ علم نہیں تھا کہ وہ کہاں ملے گی اس روز وہ چرچ کے سامنے سے گزر رہا تھا، جہاں کوئی تقریب ہو رہی تھی۔ چرچ

سامنے، میدان میں ٹینٹ لگا تھا، وسیع و عریض ڈانٹ تھا، لوگ بھی اچھی خاصی تعداد میں موجود تھے۔ کوئی تقریر کر رہا تھا، ”آدم علیہ السلام نو سو تیس سال تک جئے، نوح علیہ السلام نے نو سو پانچ سال عمر پائی۔ ان کے متعدد بیٹے اور بیٹیاں ہوئیں.....“

یوسف بہت تھکا ہوا تھا اور بے حد پڑمردہ اور مایوس بھی۔ اب تک کوئی کام کی بات معلوم نہیں ہو سکی تھی۔ ایک اور دن گزر گیا تھا اور وہ بے حد تلخی سے سوچ رہا تھا کہ اس کا کیا بنے گا؟ وہ بہت زیادہ عقل مند بننے کے چکر میں بے وقوف تو نہیں بن رہا ہے؟ اب تو جیب بھی کافی ہلکی ہو گئی تھی۔ پانچ سو روپے کہاں تک ساتھ دے سکتے تھے۔ وہ انہی سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا، چنانچہ ابتدائی الفاظ نہ سن سکا لیکن نو سو پانچ سال کی عمر اس کی سماعت میں گھس آئی۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا مگر پھر وہ بری طرح چونکا۔ بات اس سے شعور تک پہنچ گئی تھی۔

اس وقت تک وہ چرچ کے گیٹ سے آگے نکل آیا تھا۔ وہ پلٹا اور چرچ میں داخل ہو گیا۔ پنڈال کے عقبی حصے میں کرسیاں خالی تھیں۔ وہ ایک کرسی پر الگ تھلگ بیٹھ گیا۔ وہاں غالباً کوئی کنونشن ہو رہا تھا۔ اس نے مقرر کو دیکھا اور اسے پہچان بھی لیا۔ وہ فادر تھامس تھا۔ وہ فادر کو اس وقت سے جانتا تھا، جب وہ جوزف ڈیوڈسن تھا اور کبھی کبھار چرچ آجلیا کرتا تھا۔ یہ بات ملے تھی کہ فادر اسے نہیں پہچان سکے گا۔

اسے تقریروں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، چنانچہ وہ بڑی دلجمعی..... سے بیٹھا، اپنے منصوبے کے متعلق سوچتا رہا جس کا ابھی خاکہ بھی نہیں بنا تھا۔ اس کی چھٹی حس بتا رہی تھی کہ خوش قسمتی نے اسے کامیابی کے دروازے پر لا کھڑا کیا ہے۔ اسے یقین تھا کہ اب وہ جینا میکم کو ابدی زندگی فروخت کر سکے گا۔

وہ بڑی بے چینی سے تقریب ختم ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ تقریب ختم ہوئی۔ اور سامعین تو فوراً ہی رخصت ہو گئے لیکن مقررین مہمان تھے۔ انہیں فادر تھامس نے بڑے احترام سے رخصت کیا۔ وہ آخری مہمان کو رخصت کر کے واپس آ رہے تھے کہ ان کی نظر اس پر پڑی۔ وہ بدستور عقبی حصے کی اس کرسی پر بیٹھا تھا۔

”ہمدرد! میں تمہارے کسی کام آسکتا ہوں؟“ فادر نے مہمان لہجے میں پوچھا۔

”فادر! مجھے آپ سے کچھ پوچھنا ہے۔“

”ضرور پوچھو برادر!“

”آپ اپنی تقریر میں طویل العمری کا تذکرہ کر رہے تھے کہ انبیاء نے کتنی طویل

تھی کہ قرآن حکیم، پیغمبر آخر الزماں پر اترا تھا۔ قرآن حکیم انسان کے لیے خدا کا آخری ہدایت نامہ تھا اور آنحضرت ﷺ ہادی آخر۔ وہ ان تمام باتوں پر ایمان رکھتا تھا۔ اس کا فلسفہ زندگی عجب تھا۔ وہ قانونی ضرورت کا قائل تھا۔ ضرورت کے وقت جوزف ڈیوڈسن بنے میں اسے کوئی عار نہیں لیکن اندر سے وہ یوسف تھا، مسلمان۔ ماں کی آخری بات اسے یاد تھی۔ اسے یوسف ہی رہنا تھا..... مسلمان یوسف۔

وہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ وہ جس چکر میں تھا، وہ کاروباری تھا۔ اخلاقی نکتہ نظر سے وہ جائز اور درست نہیں تھا اور ایسے کسی کام میں قرآن حکیم سے مدد لینا اس کے لیے ناممکن تھا۔ وہ اچھا مسلمان نہیں تھا تو اتنا برا مسلمان بھی نہیں تھا۔

فادر نے کہا تھا، بائبل پڑھو، بائبل میں ہر سوال کا جواب موجود ہے۔ تو ٹھیک ہے۔ بائبل پڑھنے میں حرج ہی کیا ہے۔ اپنا الٹو سیدھا کرنا ہے تو اس میں بائبل ہی کی مدد بہتر رہے گی۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ اپنے سوال کا جواب بائبل ہی سے حاصل کرے گا۔ وہ سلیزین تھا اور سلیزین قرآن پاک کبھی فروخت نہیں کرتے۔ اس کتاب مقدس کی تو قیمت بھی نہیں لی جاتی۔ ہدیہ کہتے ہیں اسے جب کہ بائبل فروخت ہوتی ہے۔

اب ایک دشواری تھی کہ بائبل کہاں سے حاصل کی جائے؟ اس کی زندگی میں ایک بہت بڑی کمی تھی۔ وہ بہت سے لوگوں سے ملا تھا مگر اس نے کبھی کسی کو دوست نہیں بنایا تھا۔ وہ انسانوں پر اعتبار کرنے کا قائل ہی نہیں تھا لیکن ضرورت کے وقت کسی دوست ہی سے تو مدد لی جاسکتی ہے۔ پہلے کبھی مدد کی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔ وہ اپنی مدد آپ کے اصول کا اور اپنے طور پر جینے کا قائل رہا تھا۔ ایک وقت کھانا نہ ملا تو بھوکے رہ لیا۔ دوست بنا کر، اس سے ایک فائدہ حاصل کر کے، بہت سارے نقصانات سمیٹا تو حماقت ہے۔

اب وہ بے چین تھا۔ دولت کی خوشبو نے اسے بھوکی بلی کی طرح مضطرب کر دیا تھا، مگر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بائبل کہاں سے حاصل کرے۔ اچانک اسے طیب کا خیال آ گیا۔ طیب سے اس کا دوستی کا رشتہ نہیں تھا۔ البتہ وہ ملتے رہتے تھے۔ طیب سے اس کی پہلی ملاقات چرچ میں ہوئی تھی۔ وعظ کے بعد وہ باہر آئے تو طیب نے اسے چائے کی دعوت دی۔ دعوت وہ کسی بھی قسم کی ہو، مسترد نہیں کر سکتا تھا، لیکن نہ جانے کیوں اسے احساس ہو رہا تھا کہ طیب وہ نہیں، جو اسے نظر آتا ہے۔ چائے پینے کے دوران اس نے طیب کا نام سن کر اس سے پوچھا ”تم عیسائی تو نہیں معلوم ہوتے؟“

عمرس پائیں۔ میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ ان کی طویل زندگی کا کیا راز تھا؟ زمانے میں سبھی کی عمریں طویل ہوتی تھیں۔ کیوں؟“

فادر کی آنکھوں میں روشنی تھرکنے لگی ”برادر! یہ سب کچھ بائبل میں موجود ہے انہوں نے اپنے ہاتھوں میں موجود بائبل کو لہرایا ”بائبل میں کیا کچھ نہیں ہے! زندگی کائنات کے بارے میں تم جو کچھ بھی جانا چاہو گے، اس کا جواب تمہیں بائبل میں ملے گا خداوند کی اس کتاب میں ہر سوال کا جواب موجود ہے۔ خدا تمہارا نگہبان رہے۔ برادر، بائبل پڑھا کرو۔“

”ٹھیک یو فادر“ اس نے کہا اور پلٹ کر چلے گا۔

”اے برادر“ فادر نے اسے پکارا ”اس رسی کو تھامے رہو۔ یہاں آؤ“ میں تمہیں بہت کچھ بتاؤں گا۔ میں تمہیں بتاؤں گا کہ ہولی فادر تے زمین پر انسان کو کس لیے بھیجا اور کیا کیا نعمتیں.....“

”شکریہ فادر!“ اس نے پلٹے بغیر کہا ”پھر کسی وقت سہی۔ اس وقت تو میں برا مصروف ہوں۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ یہ مصروفیت کا دور ہے۔“

اس نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ فادر کی آنکھوں کی روشنی بجھ گئی ہے اور چہرے پر مایوسی کا تاثر ابھر آیا ہے۔ وہ چرچ سے نکل آیا۔ غیر ارادی طور پر اس کا ہاتھ جیب میں گیا۔ اس نے نرمی سے اس اخبار کو چھوا، جس میں جینا میکم کا انٹرویو چھپا تھا۔

وہ بڑھی جینا کے بارے میں سوچ رہا تھا، جسے خدا نے طویل عمر دی تھی مگر وہ بیش زندہ رہنے کے چکر میں تھی۔ وہ مرنا نہیں چاہتی تھی، پرانے زمانے میں اولاد آدم آٹھ آٹھ سو، نو نو سو سال تک جیتی رہی تھی۔ وہ منطقی انداز میں سوچ رہا تھا کہ اس زمانے میں ایسا ہو سکتا تھا تو اب کیوں نہیں ہو سکتا؟ کم از کم اسے ناممکن تو قرار نہیں دیا جاسکتا اس طویل العمری کا کوئی سبب، کوئی راز تو ہو گا اور فادر نے کہا تھا، برادر، بائبل پڑھو۔ بائبل میں ہر سوال کا جواب موجود ہے۔ یتیم خانے کے مولوی نعمت علی نے بھی یہی کہا تھا کہ کائنات اور زندگی کے بارے میں ہر سوال کا جواب قرآن حکیم میں موجود ہے۔ صرف کہا ہی نہیں تھا، انہوں نے ثابت بھی کیا تھا اور اس دن سے اس بات پر اس کا پختہ ایمان تھا۔ اس کا مطلب ہے، قرآن حکیم میں بھی اس بات کا جواب ہو گا بشرطیکہ یہ حقیقت ہو۔ مولوی صاحب کہتے تھے، پرانی آسمانی کتابوں میں جو کچھ ہے، وہ قرآن حکیم میں بھی ہے اور قرآن حکیم میں جو کچھ ہے، وہ ضروری نہیں کہ پچھلی کتابوں میں موجود ہو۔ اس کی وجہ یہ

صول میرے نزدیک اہم ترین ہے۔ خالی پیٹ کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ میں پہلی بار یساف سے جوزف بنا تو پیٹ ہی کی وجہ سے بنا۔ میں حقیقت پسند ہوں۔ میں نے پہلی بار ایک پس اور ملائی اس روز کھائی، جب میری ماں مری۔ اس کے بعد برسوں، ہر روز، ہر جراثیم کے وقت میں یہ سوچتا رہا کہ انسان زندگی میں صرف ایک بار کیوں مرتا ہے۔ ماں ہر روز مرنے تو مجھے شاندار ناشتا اور کھانا ملتا لیکن وہ تو ایک بار مر گئی اور بس.....

طیب کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر بولا ”کہتے تو تم ٹھیک ہو لیکن یہ بات میرے تجربے میں ہے۔“

”تجربات تو بہت محدود ہوتے ہیں۔ تم ہر چیز کا تجربہ تو نہیں کر سکتے۔ چنانچہ حقائق بنانے کے لیے دوسروں کے تجربات بھی جمع کرنے پڑتے ہیں۔“

”یہ بات بھی ٹھیک ہے“ طیب نے کہا۔ پھر چونک کر پوچھا۔ ”یہ یوسف سے جوزف بننے کا کیا قصہ ہے؟“

وہ پہلا موقع تھا کہ اس نے کسی کو وہ سب کچھ سنایا۔ طیب خاموشی سے سنتا رہا۔

”تم تو بہت خطرناک آدمی ہو“ آخر کار طیب نے کہا۔

”ہرگز نہیں۔ میرا دل محرومیوں اور دکھوں پر کڑھتا ہے، جو ہر طرف بکھرے ہوئے ہیں لیکن ساری دنیا میں اولیت مجھے حاصل ہے۔ جب میں محروم اور دکھی نہیں رہوں گا تب میں دوسروں کی محرومیوں اور دکھوں پر کڑھوں گا لیکن پہلے خود سے فراغت پاؤں۔ میں نے زندگی کا سب سے حقیقی اور کمزور روپ دیکھا ہے۔ یقین کرو میں کسی انسان کو تکلیف نہیں پہنچا سکتا۔ میں نے غریبوں کو قناعت کی نیند میں مددوش اور بے عمل دیکھا ہے۔ اندر کیس گہرائی میں، بہت گہرائی میں شاید میں مذہبی ہوں، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مذہب کے ذریعے دولت مندوں نے غریبوں کو ایکسپلاٹ کیا ہے، ان کا استحصال کیا ہے اور اس کے باوجود انہیں اپنا شکر یہ ادا کرنے پر مجبور کیا ہے..... واعظوں کے ذریعے صبر اور قناعت کا درس دے کر۔ حالانکہ بقا و جدوجہد کی تقاضی ہے۔ جس قسم کی جدوجہد ضروری ہو، انسان کو کرنی چاہئے۔ ایک لاکھ مزدور ایک محل تعمیر کرتے ہیں تو کیا وہ اسے مسمار نہیں کر سکتے؟ سو دوست! میرا پہلا مذہب اپنی بقاء ہے۔ اس کے بعد میں کسی مذہب پر غور کروں گا.....“

”باپ رے باپ! تم ترقی پسند ہو“ طیب بری طرح دہل گیا تھا۔

”میں نعرہ نہیں لگا رہا ہوں، حقیقت بیان کر رہا ہوں۔ میں ترقی پسند ہوں کیونکہ

”میں عیسائی نہیں ہوں، پیدائشی طور پر مسلمان ہوں“ طیب نے بے حد سکون سے جواب دیا۔ پھر اچانک پوچھا ”اب شاید تم مجھے مارو گے۔ مجھ سے لڑو گے۔“

”میں ایسا کیوں کرنے لگا؟“ اس نے حیرت سے کہا ”بھلا چائے پلانے والے کو مارا جاسکتا ہے؟“

”اس بات پر کہ میں مسلمان ہوں اور تمہارے چرچ میں آیا ہوں۔“

”چرچ میرا نہیں۔ مجھے کیا؟“ اس نے بے پروائی سے کہا۔

”تم عجیب آدمی ہو۔ کچھ اپنے ہی قبیل کے معلوم ہوتے ہو۔“

”تمہارا قبیل! یہ کیا بلا ہے؟“

”سوچنے والے لوگوں سے مراد ہے میری۔ میں دراصل سوالات کا آدمی ہوں۔ مذہب کے حوالے سے خود کو اور کائنات کو سمجھنا میرا مقصد ہے۔ شروع ہی سے میرا رجحان مذہب کی طرف رہا ہے۔ میں مدرسے بہت شوق سے جاتا تھا۔ بہت چھوٹا تھا، تبھی سے میرے ذہن میں عجیب و غریب سوالات ابھرتے ہیں۔ میں مولوی صاحب سے دو سوال پوچھتا تو پہلے وہ پیاز سے مجھے خاموش کرا دیتے۔ پھر ڈانٹ ڈپٹ اور اس کی بعد بید بازی کی نوبت آئی لیکن سوالات بڑھتے ہی جا رہے تھے اور جواب ایک کا بھی نہیں ملا تھا۔ یوں میری تفتیشی بڑھتی گئی۔ میں سب کچھ جاننا..... سب کچھ سمجھنا چاہتا تھا۔ بڑا ہوا تو میں نے اس سلسلے میں بڑے علماء سے بات کی لیکن جواب ایک ہی ملتا تھا کہ زیادہ تجسس نہ کرو، گمراہ ہو جاؤ گے۔ میں سوچتا کہ اب بھی تو یہ یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ میں گمراہ نہیں ہوں۔ چنانچہ جیسے جیسے مجھے ٹر خایا گیا، ویسے ویسے طلب علم بڑھتی گئی۔ مجھے باغی اور مرتد قرار دیا گیا، کئی بار زبردست قسم کی مرمت بھی ہوئی۔ اب میں اپنے طور پر تمام اہم مذاہب کو سمجھتا ہوں اور ان کا موازنہ کرتا ہوں۔ مقصد تلاشِ حق ہے۔ ان دنوں عیسائیت کا مطالعہ کر رہا ہوں.....“

”اور کس نتیجے پر پہنچے ہو؟“

”یہاں بھی وہی صورتِ حال ہے۔ اعتراض سننا کسی کو گوارا نہیں۔“

”یہ بات غلط ہے کہ میں تمہارے قبیل کا ہوں۔“ اس نے کہا۔

”وہ کیسے؟“

”ایسے کہ مجھے کوئی جتنو نہیں۔ میرے نزدیک پیٹ سب سے بڑی حقیقت ہے۔ میں صرف زندگی کو سمجھتا..... بلکہ سمجھنا نہیں، گزارنا چاہتا ہوں۔ ضروریاتِ زندگی کا

آگے بڑھنا چاہتا ہوں۔ اصطلاحی معنوں میں نہیں۔ کیونکہ میں کسی غریب آدمی کی مجبور کو ایک پکٹ نہیں کر رہا ہوں۔ میں بنیادی طور پر حقیقت پسند ہوں۔“

”میرا مطلب تھا تمہارے نظریات سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں والے ہیں“ طیب نے مدافعتانہ لہجے میں کہا۔

”ہرگز نہیں۔ میں ہیومنسٹ ہوں“ اس نے بڑی سادگی سے کہا ”تم ہی بتاؤ مذہب بھوکے کا پیٹ بھر سکتا ہے؟ سردی کے موسم میں ننگے آدمی کو گرم کپڑے فراہم کر سکتا ہے؟ بے گھر کے لیے خیمے کے طور پر استعمال ہو سکتا ہے؟“

”دیکھو.....“

”نہیں۔ نظریاتی بات مت کرنا۔ اس دنیا کے سنگین حقائق کو دیکھو اور عملی بات کرو۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو۔“

اس کے بعد بھی وہ کئی بار ملے۔ وہ طیب کے گھر بھی گیا۔ وہاں کتابوں کا انبار تھا۔ ہر مذہب پر بے شمار کتابیں موجود تھیں۔ ان میں بائبل بھی تھی۔

وہ طیب کے گھر کی طرف چل دیا۔ دل ہی دل میں دعا کرتا رہا کہ وہ گھر پر موجود ہو۔ اس روز خوش قسمتی اس کے ساتھ تھی۔ طیب گھر پر ہی مل گیا۔ اس نے بڑے تپاک سے اس کا خیر مقدم کیا اور اسے اپنے کمرے میں لے گیا ”چائے پلاؤں تمہیں؟“

”ضرور۔ اگر ساتھ میں پکٹ بھی ہوں تو سبحان اللہ۔“

طیب ہنستا ہوا اندر چلا گیا۔ چند ہی لمحوں کے بعد وہ واپس آیا اور سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا ”اب کو کیسے آئے ہو؟ تم بلاوجہ تو آنے سے رہے۔“

”ٹھیک کہتے ہو“ اس نے طویل سانس لے کر کہا ”مجھے تم سے ایک چیز لینی ہے۔“

”کو کھو۔ یہ گھر بھی حاضر ہے تمہارے لیے۔“

”مجھے بائبل درکار ہے۔“

”بائبل! وہ کس لیے؟“

”ایک سودا پٹانا ہے بائبل کی مدد سے۔“

”طیب حیران ہو گیا“ یہ کیسے ممکن ہے؟“

”یہ تو بزنس سیکرٹ ہے۔ اگر میرا آئیڈیا تم لے اڑے تو میں مارا جاؤں گا۔“

طیب نے زخمی نگاہوں سے اسے دیکھا ”تم جانتے ہو“ میں ریاکار اور دعا باز نہیں

ہوں۔“

”جانتا ہوں۔ اسی لیے تم سے ڈر لگتا ہے۔ ایسے لوگ جب بھی کچھ کرتے ہیں، اچانک اور خلاف توقع کرتے ہیں۔“

”اور میں عملی آدمی بھی نہیں ہوں۔“

”ارے میں تو مذاق کر رہا تھا۔ ابھی بتاتا ہوں“ اس نے ہنستے ہوئے کہا ”بائبل تو تم نے گھول کر پڑھی ہوگی؟“

”ہاں۔ تم جانتے ہی ہو“ طیب نے جھینپ کر کہا۔

”اس میں کہیں طویل العمری کا تذکرہ بھی ہے؟“

”ہاں اور ہر آسمانی صحیفے میں ہے۔ سب جانتے ہیں کہ ابتدائی انسانی دور میں عمریں بے حد طویل ہوتی تھیں۔“

”بس..... میں اسی حوالے سے ایک بہت مہنگی چیز بیچنا چاہتا ہوں۔“

”اور وہ مہنگی چیز کیا ہے؟“

”ابدی زندگی۔“

”یہ کیسے ممکن ہے؟“

”مجھ جیسا سلازمین ہو تو سب کچھ ممکن ہے۔“

اتنی دیر میں طیب کا چھوٹا بھائی چائے اور بسکٹ لے آیا تھا چنانچہ گفتگو موقوف ہو گئی۔ چائے کی پیالی خالی اور بسکٹ کی پلیٹ صاف کرنے کے بعد اس نے سگریٹ سلگائی اور طویل کش لے کر دھواں چھت کی طرف چھوڑ دیا ”مجھے اس سلسلے میں تفصیل سے بتاؤ؟“ اس نے طیب سے کہا۔

”خدا نے حضرت آدم علیہ السلام کو تخلیق کیا پھر ان کی پہلی سے بی بی حوا وجود میں آئیں۔ اس کے بعد دانہ گندم کا پتھر چلا۔ حضرت آدم اور حوا جنت سے بے دخل ہوئے اور زمین پر آئے۔ تب روئے زمین پر پہلی بار خون بہا۔ قابیل نے ہابیل کو قتل کیا۔ اس کے بعد طویل العمری کا سلسلہ شروع ہوا۔ اوسط عمر آٹھ سو اور نو سو سال قرار پائی، پھر زمین پر انسان کی شوریہ سری حد سے بڑھ گئی اور خدا کا قہر نازل ہوا۔ طوفان آیا اور سفینہ نوح علیہ السلام کے سوا کرۂ ارض پر کچھ بھی نہیں بچا۔ تب سام اور حام کے دم سے دنیا پھر آباد ہوئی جب سے اب تک انسان بار بار بھٹکا اس پر عذاب نازل ہوئے لیکن خدا تعالیٰ نے نسل انسانی کو ختم نہیں ہونے دیا۔ بعد کے انبیاء میں حضرت یعقوب علیہ السلام نے

۱۴ سال اور حضرت یوسف علیہ السلام نے ۱۰ سال عمر پائی.....“

”ٹھیک ہے۔ تم مجھے بائبل دے دو۔“

”یہ لو۔ کہو تو کلام پاک کا ایک نسخہ بھی دے دوں؟“

”نہیں‘ وہ تو میرے گھر میں موجود ہے۔“

”حیرت ہے! تم نے اس سے مدد کیوں نہیں لی؟ اس میں تو سب کچھ موجود ہے۔“

”دیکھو دوست!“ اس نے سر دلبے میں طیب کی بات کاٹ دی، ”میں اچھا ہوں یا

برا..... بنیادی طور پر یوسف ہوں، جوزف نہیں۔ میں کلام پاک پڑھتا نہیں ہوں تو

اسے پتوں گا بھی نہیں۔ میں کوئی عالم نہیں کہ مذہب کا روبرو کروں۔“

”اور بائبل بچ سکتے ہو تم؟“ طیب نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اٹھا اور اس نے طیب کی طرف ہاتھ بڑھایا ”شکریہ

طیب‘ اب میں چلتا ہوں۔ خدا حافظ۔“

اپنے ڈربے میں پہنچ کر اس نے بائبل کھولی۔ اسے ایسا لگا کہ ایک بیش بہا خزانے

کی چابی اس کے ہاتھ آگئی ہے۔ اس کی آنکھوں میں خواب تھے اور ذہن مکڑی کی طرح

اس منصوبے کا جالا بن رہا تھا، جس کے ذریعے اسے ملک کی دولت مند ترین ہستی سے

دولت کھینچی تھی۔ اس کے بعد فراغت ہی فراغت تھی۔ اچھا خوبصورت سا گھر، محبت

کرنے والی بیوی، پیارے پیارے بچے، جنہیں ضروریات زندگی کے لیے اپنا نام بدلنے کی

ضرورت کبھی نہیں پڑے گی۔ سبھی کچھ سوچا جاسکتا تھا۔ منصوبے کی کامیابی کے بعد ہر چیز

مل سکتی تھی۔

لیکن بائبل پڑھ کر بھی خواب خواب ہی رہا۔ اسے یہ احساس تو تھا کہ بات بن سکتی

ہے مگر کیسے؟ اس کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ قسمت مہربان

ہوتی ہے تو سب کچھ خود بخود ٹھیک ہوتا چلا جاتا ہے۔

اس رات وہ ہوٹل میں کھانا کھانے گیا۔ کھانے سے فارغ ہو کر وہ چائے پیتے

ہوئے اپنے منصوبے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اچانک برابر والی میز سے بلند اور برہم

آوازیں سنائی دیں۔ اس نے چونک کر دیکھا وہ غیر ملکی تھے اور عربی بول رہے تھے۔ یقینی

طور پر وہ فلسطینی تھے۔ مولوی نعمت علی کی مہربانی سے اسے عربی زبان اچھی خاصی آتی

تھی۔

سیاہ بالوں اور سیاہ آنکھوں والے اس خوب رو لڑکے کو دیکھتے ہی اسے احساس ہو

لیا کہ اسے اپنے خواب کی تعبیر مل گئی ہے۔ لڑکے کی آنکھیں عجیب اور جان دار تھیں۔

نا میں دلی دلی آگ بھی تھی، لاسحدود اداسی اور دکھ بھی اور صدیوں کے تجربات کے نتیجے

میں ابھرنے والی گہرائی بھی۔ وہ سطحی طور پر دیکھنے میں نوجوان اور گہری نظر سے دیکھنے میں

انتہ اور جہاں دیدہ لگتا تھا۔ پتلی ستواں ناک، پتلے ترشے ہوئے ہونٹ اور مضبوط جڑا، جو

سے فائز ثابت کرتا تھا، اس کے انداز میں وقار اور خود اعتمادی تھی۔ اس کے علاوہ بھی

اس کی شخصیت میں کوئی چیز تھی جسے وہ پہلے تو سمجھ نہ سکا..... اور جب سمجھا تو سنبھل

کر بیٹھ گیا۔ اس کے سینے میں فتح مندی کا احساس ٹھانٹیں مارنے لگا۔ اس کے اعصاب

ٹھنچاؤ کا شکار ہو گئے۔ وہ یہ تمام علامتیں پہچانتا تھا۔ قسمت جب بھی اس پر مہربان ہوتی

تھی، اس کا یہی حال ہو جاتا تھا۔ اسے احساس ہو گیا کہ وہ لڑکا اس کے اور اس کے

منصوبے کے لیے بے حد اہم ہے۔

اس نے لڑکے کی عمر کے بارے میں قیاس کرنے کی کوشش کی۔ بظاہر وہ اکیس

بائیس سال کا لگتا تھا لیکن اس کے ہونٹوں کے گوشوں اور آنکھوں کے تاثر کو دیکھا اور

برسنوں کے پیمانے میں رکھا جائے تو وہ پچاس کا..... ممکن ہے پچھتر کا اور ممکن ہے سو

سال کا ثابت ہو۔ اس کی جلد کی ساخت اور پلکوں کا تاثر عجیب تھا جیسے وہ وقت اور عمر کی

حدوں سے بے نیاز ہو۔ اس کی عمر کا درست تعین کیا ہی نہیں جاسکتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ

تاریخ کے صفحات سے نکل کر سامنے آکر اڑا ہوا ہے۔ اسے ایسا لگا جیسے وہ لڑکا ہزاروں نسلوں

کے بچ ایک لمحاتی وقفہ ہے۔ وہ سب کچھ تھا..... آل ان دن! نوجوان، مرو اور بزرگ۔

وہ وقت کی طرح تھا جسے نہ سمجھا جاسکتا ہے، نہ بیان کیا جاسکتا ہے۔

یوسف کے لیے وہ حکم کے اس رکتے کی طرح تھا جس کے ملنے کے بعد اس کے

پاس ناقابل شکست ٹریل ہو جائے گی۔ اس کے دماغ میں کوئی پہا بہت تیز رفتاری سے چلنے

لگا۔ اس رکتے کو کیسے حاصل کیا جائے؟ لیکن قسمت جب ساتھ دینے پر تمل جائے تو عجیب و

غریب حالات پیش آتے ہیں۔

لڑکا اپنے ساتھیوں سے جو کچھ کہہ رہا تھا، وہ اس کی سمجھ میں واضح طور پر آرہا تھا

لیکن ناقابل یقین بھی تھا، یہودیوں سے دشمنی اپنی جگہ لیکن ہمیں ان کی کامیابی اور

فتوحات کا تجزیہ کرنا چاہئے، لڑکا کہہ رہا تھا، ”ہمیں ان کی خوبیوں کو سمجھنا چاہئے اس کے

مطابق عمل کرنا چاہئے۔ ہمیں اپنی کوتاہیوں اور اپنی خامیوں کو بھی سمجھنا چاہئے تاکہ انہیں

دور کرنے کی کوشش کی جائے.....“



خادم کی حیثیت سے اسرائیل پہنچے اور انہوں نے ملک کے خادم کی حیثیت سے کام کیا۔ انہوں نے وطن کی خاطر کوئی بھی کام کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ انہوں نے..... صحرا کو محنت سے نخلستان بنایا، بنجر زمین کو سونا لگانے پر مجبور کیا، عمارتیں تعمیر کیں اور کم تعداد میں ہونے کے باوجود ہم عربوں کے.....

”ان کی پشت پر امریکا.....“

”شکست اور نااہلی کے لیے جواز گھڑا جائے، خیلے تراشے جائیں تو قسمت پر مرگ جاتی ہے۔ کسی طاقت کی پشت پناہی سے کچھ نہیں ہوتا۔ ہمیں حقیقت قبول کر لینی چاہئے اور اپنے قومی و دینی جذبے کو زندہ کرنا چاہئے۔ امریکا کا ویت نام میں حشر دیکھو۔ کیوں امریکا وہاں ذلیل کیوں ہوا؟ اس لیے کہ وہاں کے لوگوں میں جذبہ حریت توانا تھا۔ جنگیں اسلحے کے زور پر، تعداد کے زور پر نہیں جیتی جاتیں۔ اسلامی تاریخ سے بڑی گواہی اس سلسلے میں کیس نہیں ملے گی۔ اور اب کیا ہے، ایسا لگتا ہے، جیسے تاریخ الٹ گئی ہے۔ وجہ؟ ہمارے پاس بے عملی اور زبانی باتوں کے سوا کچھ نہیں رہا۔ ہم نہ صرف اپنے لیے بلکہ اپنے اسلاف کے لیے بھی باعث ننگ ہیں.....“

یوسف سمور سا سنتا رہا۔ اسے لڑکے کی جرات پر حیرت تھی۔ لڑکا سچ کہہ رہا تھا، آئینہ دکھا رہا تھا لیکن اس دور میں آئینہ کون دیکھتا ہے؟ آئینہ تو توڑ دیا جاتا ہے۔ وہ سوچ میں گم ہو گیا۔ اب وہ کچھ سن نہیں رہا تھا۔ پھر کرسی گرنے کی آواز سن کر اس نے چونک کر دیکھا۔

لڑکے کے ساتھیوں میں سے ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کے منہ سے کف نکل رہا تھا اور آنکھوں سے شعلے۔ وہ خوں خوار نظروں سے لڑکے کو دیکھ رہا تھا، جو اپنی جگہ بڑی بے نیازی سے بیٹھا اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہا تھا۔

یوسف تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ وہ لڑکا اس کے لیے بے حد اہم تھا۔ بلیٹک چیک تھا۔ اسی پر اس کے منصوبے کی کامیابی کا دارومدار تھا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ لڑکے کی جرات مندی اور بے لاگ تجزیے نے اسے سنگین اور یقینی خطرات سے دوچار کر دیا ہے۔ لڑکے کے تینوں فلسطینی ساتھیوں کے تیر بے حد خطرناک تھے۔ یوسف کی چھٹی حس گواہی دے رہی تھی کہ کچھ ہونے والا ہے۔ اسے صرف لڑکے کے تینوں ساتھیوں کی طرف سے تشویش نہیں تھی۔ وہ اپنے وطنوں کا مزاج بھی جانتا تھا۔ اگر ہو نکل میں موجود دو لوگوں کو بھی پتا چل جاتا کہ کیا گفتگو ہو رہی ہے تو لڑکے کی تکا بوٹی ہو جاتی۔ جو قوم عمر

یوسف نے اس کے ساتھیوں کو دیکھا۔ ان کے تیر بہت خراب تھے۔ آنکھوں سے خوں خواری جھلک رہی تھی۔ گرد و پیش کے دوسرے لوگ بھی ان کی طرف متوجہ گئے تھے مگر گفتگو کیونکہ عربی میں ہو رہی تھی اس لیے ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔

”تو تمہارے خیال میں یہودیوں میں خوبیاں بھی ہیں؟“ لڑکے کے ساتھیوں میں سے ایک نے کڑے لہجے میں پوچھا۔

”اور ہم میں کو تاہیاں اور خامیاں ہیں؟“ دوسرا بولا۔

”اور ہمیں ان ملعون یہودیوں کی تھلید کرنی چاہئے؟“ تیسرے نے زہریلے لہجے میں دریافت کیا۔

”تم تینوں ہی ٹھیک سمجھے ہو“ لڑکے نے بے حد سکون سے کہا، ”میں یہی کہہ رہا ہوں۔“

”وہ خدا کی درگاہ سے دھکڑے ہوئے کتے ہیں، جنہیں صدیوں سے کوئی ٹھکا میسر نہیں.....“

”ایسی بات نہیں۔ اب تو ان کے پاس وطن ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ انہیں اللہ کی مرضی کے بغیر یہ سب کچھ ملا ہے۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ بے وطن ہم ہیں۔ مت بھولو کہ وہ خدا کی سب سے پسندیدہ قوم تھے۔ اپنی حرکتوں کی وجہ سے وہ خدا کے معتب ثمرے۔ اب اگر ہم اپنے اعمال کا جائزہ لیں تو کیا ہمیں خوف نہیں آتا؟ دنیا کی سرداری ان راندہ درگاہ لوگوں سے چھین کر ہمیں ودیعت کی گئی تھی مگر اب ہم کیا کر رہے ہیں؟ کیا ہم اپنے اعمال سے خدا کو ناراض نہیں کر رہے ہیں؟ ہم میں نہ تدبیر رہا، نہ دلیری۔ نہ ہم راست گو رہے اور نہ ہی سچائی پر ڈٹ جانے کی خواہش میں باقی رہی۔ ہم نے اپنے ہاتھوں خود کو تقسیم کر دیا، کمزور کر لیا۔ ہم جذبہ جہاد سے محروم ہو گئے۔ ہم میں شہادت کی گگن بھی نہیں رہی اور ہم رسول اکرم ﷺ کی پیروی کا درس بھی بھول گئے۔ ذرا آئینہ تو دیکھو۔ کس قدر ذلیل و خوار ہیں ہم.....“

”یہ تو ٹھیک ہے لیکن یہودی.....“ لڑکے کے ایک ساتھی نے کچھ کہنا چاہا۔

اس کے دوسرے دونوں ساتھیوں کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔

”یہودی بے وطن تھے مگر وطن کی قدر و قیمت سے آگاہ تھے۔ وہ فلسطین پر غاصبانہ طریقے سے چھائے لیکن یہ دیکھو کہ انہوں نے اپنے لیے وطن کیسے تعمیر کیا، انہوں نے محنت کیسے کی؟ دنیا بھر کے یہودی اپنی اپنی جگہ، اپنی اپنی بہترین پوزیشن چھوڑ کر وطن کے

کے اعتبار سے بچپن ہی کے عہد میں ہو اور جذباتی بھی ہو، وہ ایسے سنگین حقائق برداشت کرتی ہے۔

لڑکے کی عافیت یقینی طور پر خطرے میں تھی اور اسے بچانا یوسف کے لیے ضروری تھا۔

جو فلسطینی لڑکا اٹھ کھڑا ہوا تھا، اس نے دانت پیس کر کہا، ”اپنے الفاظ واپہ معافی مانگو۔“

لڑکا بدستور بیٹھا رہا۔ اس کے انداز سے بے پروائی مترشح تھی، ”میں بہت سمجھ کر بولتا ہوں۔ مجھے الفاظ واپس لینے کی ضرورت کبھی نہیں پڑی“ اس کے لیے ٹھہراؤ تھا۔

دوسرے دونوں لڑکے بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان تینوں نے ایک دوسرے کو پھر بیٹھے ہوئے نوجوان کو دیکھا ”تم..... تم یہودی ہو“ ان میں سے ایک نے ایک لفظ پر زور دے کر کہا ”اگر نہیں ہو تو تمہیں معافی مانگنی چاہئے۔“

”میں جو بھی ہوں، یہ میرا پیغام ہے، سب مسلمانوں کے لیے اور بالخصوص بھائیوں کے لیے۔“ لڑکے نے بے حد پرسکون لہجے میں جواب دیا ”اور تم کچھ بھی اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں الفاظ واپس نہیں لوں گا۔“

”تب تم یقیناً یہودی ہو“ دوسرے لڑکے نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”اچھا“ لڑکے نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا، ”ٹھیک ہے۔ یہودی ہوں۔ پھر؟“

یوسف اضطرابی طور پر اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے یقین ہو گیا کہ اب جھگڑا ہو گا اور اس جھگڑے میں حصہ لینا تھا۔ اس لڑکے..... حکم کے اکتے کے تحفظ کے لیے! بھی ہاتھ پیر کھولے بہت دن ہو گئے تھے۔ یہ موقع اس کو قدرت کی طرف سے ملا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ اس لڑکے سے کیونکر متعارف ہوا جائے..... اسے کیسے پتایا جا۔ کیونکہ وہ اسے استعمال کرنا چاہتا تھا۔ اس سے اچھا موقع اور کیا ملے گا اب لڑائی ہو اور وہ اس لڑکے کا ساتھ دے گا اس کا شکر گزار ہو گا اور شکرگزاری کے طور پر کو استعمال کرنے دے گا اور اس کے بعد دولت ہی دولت، خوش حالی.....

مگر پہلے اس سنگین مرحلے سے گزرنا تھا۔ اس نے لڑکے کو نگاہوں ہی نگاہوں: ٹولا۔ وہ دبلا پتلا مگر جان دار تھا۔ آنکھوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ پھرتلا بھی یقیناً ہو گا۔ پھر!

نے لڑکے کے تینوں ساتھی حریفوں کا جائزہ لیا۔ وہ بھی ٹھیک ٹھاک تھے۔

اس نے فیصلہ کیا کہ اس نے لڑکے کا ساتھ دیا تو لڑکے کا پہلہ یقیناً بھاری ہو جائے گا۔ اس لحاظ سے تشویش کی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ اپنی جگہ کھڑا رہا لیکن وہ پوری طرح چوکس تھا..... ایک لمحے کے نوٹس پر ایکشن میں آنے کے لیے تیار۔

”تو یہودی ہے تو ہم تجھے اس خرافات کا مزہ بھی چکھائیں گے“ ایک لڑکے نے مھوم کر بدستور بیٹھے ہوئے لڑکے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

یوسف مطمئن تھا کہ صورت حال پوری طرح قابو میں ہے۔ لڑکا اب بھی بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے انداز میں اب بھی بلا کا ٹھہراؤ اور سکون تھا۔

پھر اچانک جو کچھ ہوا، وہ یوسف کے لیے غیر متوقع تھا۔ دوسرے دونوں لڑکوں نے چیخ کر ہوٹل میں موجود دوسرے لوگوں سے، لڑکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”یہ یہودی ہے، یہودی جاسوس“ جملہ اردو میں کہا گیا تھا۔

یوسف کو ایک ثانیے میں اندازہ ہو گیا کہ صورت حال اچانک ہی خطرناک ہو گئی ہے۔ اتنے سارے لوگوں کے مقابلے میں لڑکے کے بچنے کا کوئی امکان نہیں تھا اور وہ لڑکا اس کے خوابوں کی تعبیر تھا۔ اسے بچنا بہت ضروری تھا۔

تینوں فلسطینی لڑکے اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ہوٹل میں موجود تمام لوگ اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے تیور بے حد خراب تھے۔ یوسف کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس صورت حال پر کیسے قابو پائے۔

اس کا ذہن بہت تیزی سے سوچنے میں مصروف تھا.....

○-----○-----○

کہا۔

لوگوں کے تاثرات بدل گئے، چروں سے کھچاؤ رخصت ہو گیا۔ ان میں سے ایک برا سامنہ بنا کر نہایت بدمرگی سے بولا ”یہی تو مصیبت ہے۔ مسلمانوں کو آپس میں لڑنے سے فرصت ہی نہیں ملتی۔ تب ہی تو ساری دنیا میں ذلیل ہو رہے ہیں ہم۔“

”اپنے ملک کو ہی دیکھ لو۔ جو شخص سیاسی طور پر خطرہ بننا محسوس ہو، اسے فوراً غدار قرار دے دیا جاتا ہے“ دوسرے نے کہا۔

”اور عوام کا یہ حال ہے کہ بغیر سوچے سمجھے، بغیر کسی ثبوت کے اس بے چارے کی پیشانی پر غدار کی کاٹھن لگا دیتے ہیں“ تیسرے نے لقمہ دیا۔

یوسف بالکل مطمئن ہو گیا کیونکہ ان میں سے کوئی آگے نہیں بڑھا تھا اور نہ ہی آگے بڑھنے کے موڑ میں تھا چنانچہ وہ میدان جنگ کی طرف متوجہ ہوا۔ لگتا تھا، اس دوران لڑکا، تیسرے حریف کے بھی ہاتھ جڑ چکا تھا۔ پہلے چوٹ کھانے والے دونوں ساتھی اٹھ کھڑے ہوئے تھے لیکن اب وہ قدرے سسے ہوئے نظر آرہے تھے۔

”یہ..... یہ یہودی ہے، غدار یہودی“ ان میں سے ایک نے لوگوں سے اپیل کی۔

یوسف نے پھر پلٹ کر دیکھا۔ صورت حال قابو میں تھی۔ ہوٹل میں موجود بیشتر لوگوں کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ تھی۔ کسی کا اس لڑائی میں مداخلت کا کوئی ارادہ معلوم نہیں ہوتا تھا۔ وہ لڑکے کی طرف بڑھ گیا، جو ان تینوں کی مرمت کرنے کے بجائے اپنی جگہ ڈٹا کھڑا تھا، جیسے ان کی پیش قدمی کا منتظر ہو۔ اس کا انداز بہر حال جارحانہ تھا۔ تینوں لڑکے، لوگوں کا منفی رد عمل دیکھ کر مایوس ہوئے تھے۔ وہ اب بھی جارحانہ انداز اپنائے ہوئے تھے۔ یوسف اس کی وجہ بھی سمجھ گیا۔ لڑائی ان تینوں نے شروع کی تھی اور اب پیچھے ہٹنا ان کے وقار کے منافی تھا لیکن یوسف بھی جانتا تھا اور وہ تینوں بھی کہ لڑکا تنہا ہی ان تینوں کے لیے کافی ہے۔

یوسف کے لیے وہ صورت حال پسندیدہ ترین اور مثالی تھی، بغیر ہاتھ پیر ہلائے ہیرو بننے کا موقع قسمت ہی سے ملتا ہے۔ چنانچہ وہ لڑکے کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا اور سخت لمبے میں ان تینوں سے مخاطب ہوا ”اب سکون سے بیٹھ جاؤ۔ ورنہ تم تینوں کی درگت بنا دوں گا میں۔ تم نے خواہ مخواہ ایک مسلمان کو یہودی قرار دے کر پڑانے کی ذلیل کوشش کی ہے۔“

ہوٹل میں موجود لوگوں کے تینوں بہت خراب تھے۔ دوسری طرف فلسطینی یہودی، وہ جو کوئی بھی تھا، اس کے ساتھی اس کے بہت قریب پہنچ گئے تھے لیکن لڑکا برو سکون اور بے پروائی سے بیٹھا ہوا تھا۔ پھر یوسف نے اسے اٹھتے دیکھا۔

یوسف کی ذہانت ہمیشہ مشکل ترین صورت حال میں حیرت انگیز حد تک تیز دکھاتی تھی۔ اس نے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ کاؤنٹر کے عقب میں بیٹھے ہوئے ہوٹل مالک کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ یوسف جانتا تھا کہ اب اس کے ہم وطن تیز سے حرکت میں آئیں گے۔ انہیں بھڑکانے کے لیے صرف لفظ یہودی بہت کافی تھا۔ اسے سب سے پہلے ان لوگوں کو روکنا تھا۔

وہ تیزی سے جھپٹا اور ان کے سامنے کھڑا ہو گیا ”جلد بازی مت کرو۔ میں ع سمجھتا ہوں“ اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

وہ سب ٹھنک سے گئے لیکن ان کے تینوں اب بھی خوف ناک تھے۔

”یہ لڑکا یہودی نہیں، فلسطینی ہے“ اس نے اپنے حکم کے اکتے کی طرف اشارہ کیا۔

دوسری طرف لڑکا متحرک ہو چکا تھا..... اور اس کی توقعات پر پورا بھی اترتا تھا۔ اس کے تینوں ساتھی اس کے متعلق درست اندازہ نہیں لگا سکے تھے۔ وہ اپنی عددی برتری کے نشے میں دھت تھے، اسی لیے انہوں ایک ساتھ جھپٹنے کی حماقت کی۔ لڑکے کے دونوں ہاتھ تیزی سے حرکت میں آئے۔ ایکشن کی رفتار اتنی تیز تھی کہ پتا کچھ بھی نہیں چلا بس اتنا نظر آیا کہ تینوں میں سے دو حملہ آور زمین چاٹ رہے ہیں۔

یوسف نے اشارہ کرنے کے دوران یہ سب کچھ دیکھا اور مطمئن ہو کر ان لوگوں کی طرف مڑا، جنہیں قابو میں رکھنا تھا ”یہ تینوں لڑکے محض اسے پڑانے کے لیے اسے یہودی قرار دے رہے ہیں۔ میں نے عربی میں ان کی پوری گفتگو سنی تھی“ اس نے مزید

”کرنے دو“ لڑکے نے کندھے جھٹک کر کہا ”میں نے کانا“ میں کسی سے ڈرتا نہیں  
 ”اے۔“

”اور میں خود کشی کو سب سے بڑی بزدلی سمجھتا ہوں۔“  
 لڑکے نے ہلکا سا قہقہہ لگایا ”بہت خوب! تمہارے نزدیک یہ خود کشی ہوگی۔ بہت  
 ب! مگر میں کہیں اور جا بھی تو نہیں سکتا۔“

”وائی ایم سی اے میں تمہارا سامان ہوگا؟“ یوسف نے اس کی بات نظر انداز کر  
 کے پوچھا۔ پھر اچانک بولا۔ ”چلتے بھی رہو۔ یہاں رکے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں، یہ  
 خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے تمہارے ساتھی لوگوں کو پھر بھڑکا دیں۔“

”میں بے گھری میں زیادہ سامان رکھنے کا قائل نہیں ہوں۔ وائی ایم سی اے میں  
 ہر ایک بیک ہے، جس میں دو جوڑے کپڑے ہیں“ لڑکے نے کہا پھر بولا ”تم بہت محتاط  
 آدمی معلوم ہوتے ہو؟“

”میں نے زندگی گزاری ہے“ اس نے سادگی سے کہا۔  
 لڑکے نے پھر قہقہہ لگایا۔ اب وہ دونوں آگے بڑھ رہے تھے۔  
 ”تمہارے ساتھی ذرا سے اختلاف رائے پر تم سے اتنے برگشتہ ہو گئے؟“  
 ”وہ میرے ساتھی تو نہیں تھے۔“

”تو پھر.....؟“

”خود ہی مل بیٹھے تھے“ لڑکے نے بے پروائی سے جواب دیا ”مجھ سے پوچھا تھا کہ  
 لیا میں فلسطینی ہوں۔ میں نے اثبات میں جواب دیا تو بے تکلف ہو گئے۔ یہ ہم لوگوں کی  
 طرت ہے..... بچوں کی سی گرم جوشی اور ذرا سی دیر میں بے تکلف ہو جانا۔“  
 ”تو تم فلسطینی ہو؟“

”کیوں؟ تمہیں شک ہے اس میں؟“

”ابھی کچھ دیر پہلے جب ان لوگوں نے تمہیں یہودی کہا تھا تو میں نے تمہارے  
 رے پر فخر کا تاثر دیکھا تھا۔ تم نے اکڑ کر کہا تھا..... ہاں، تو پھر؟ وہ انداز بناوٹی نہیں،  
 قہقہہ تھا۔ میں تمہیں بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔“

”مجھے تمہاری نظروں کا احساس تھا لیکن میرے یہودی ہونے سے کیا فرق پڑتا  
 ہے؟ فلسطینی تو میں اس کے باوجود بھی ہو سکتا ہوں۔ کیا تمہارے خیال میں فلسطین میں  
 یہودی نہیں رہتے، کیا کوئی یہودی فلسطینی نہیں ہو سکتا؟“

ان تینوں نے کڑی نظروں سے اسے دیکھا مگر کچھ کے بغیر خاموشی سے اپنی جگہ  
 گئے۔

یوسف نے لڑکے کا ہاتھ تھما ”آؤ میرے ساتھ“ اس نے کہا اور کاؤنٹر پر مل ادا  
 کے باہر نکل آیا۔ لڑکا بدستور اس کے ساتھ تھا۔ یوسف نے پلٹ کر دیکھا۔ ہوٹل سے کہ  
 بھی ان کے پیچھے باہر نہیں نکلا تھا۔ اس نے سکون کا سانس لیا۔ وہ پہلے مرحلے میں کامیاب  
 ہو چکا تھا۔ اس نے لڑکے کے چہرے کو بغور دیکھا اور خوف زدہ ہو گیا۔ لڑکا بے حد خطرناک  
 تھا۔ وہ قتل تک کر سکتا تھا۔ اس کا اندازہ اس کی آنکھوں کو دیکھ کر ہو جاتا تھا۔ اس نے  
 لڑنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ ایک تربیت یافتہ لڑکا ہے۔

”اب یہاں سے کھسک لو“ اس نے لڑکے سے کہا۔

”جلدی کیا ہے؟ میں کسی سے ڈرتا نہیں ہوں“ لڑکے نے کہا اور پلٹ کر ہونا  
 کے دروازے سے اندر دیکھا۔ اس کی نظریں یقیناً ان تینوں پر جمی ہوئی تھیں۔ جن سے  
 کچھ دیر پہلے اس کا جھگڑا ہوا تھا۔ اس کی نگاہوں سے نفرت اور برہمی جھلک رہی تھی  
 ”مجھے بزدلی سے بھی نفرت ہے اور بزدلوں سے بھی۔ بہادری یہیں تک محدود نہیں کہ  
 کسی سے لڑنے اور خون خرابا کر لیا۔ سچ سننے سے ڈرتا اور اسے قبول نہ کرنا میرا  
 نزدیک بدترین بزدلی ہے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن یہ مت بھولو کہ تم اس وقت ایک جذباتی قوم کے  
 درمیان ہو۔ ہم لوگوں کے جذبات ذرا سی دیر میں برانگیختہ ہو جاتے ہیں اور اس کے  
 بعد ہم عقل کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔“

”میں جانتا ہوں“ اس بار لڑکا مسکرایا۔ ”ابھی چند لمحوں پہلے میں سمجھا تھا کہ میرے  
 چیتھڑے اڑ جائیں گے لیکن ایک بات بتاؤں، ہم عرب لوگ تم سے زیادہ جذباتی اور جوشیلے  
 ہیں۔ اسی لئے تو ہمارا برا حال ہے۔“

”رہتے کہاں ہو تم؟“

”وائی ایم سی اے میں۔“

”اب تمہارا وہاں جانا ٹھیک نہیں۔“

”کیوں ٹھیک نہیں؟“

”وہ کسی نہ کسی طور تمہارے پیچھے پڑیں گے، یہ بات تم جانتے ہو۔ ان کی بہت  
 سے لوگوں کے سامنے بے عزتی ہوئی ہے۔ وہ بدلہ لینے کی کوشش کریں گے۔“

دی تیرا نام بھی اختیار کر لوں۔ اب تمہارے معاملے میں، میں فیصلہ نہیں کر پا رہا ہوں۔ اس کے لیے میں الجھن تھی۔ لڑکا اسے سوالیہ نظروں سے دیکھتا رہا، ”مجھے علم میں کہ تم بین آنرک ہو یا بن اسحاق“ اس نے مزید کہا۔

”میں تمہیں اپنا نام بتا چکا ہوں“ لڑکے کا لہجہ سرد تھا۔

”خیر“ اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا ”میرا نام جوزف ڈیوڈسن ہے۔ باقی باتیں برے فلیٹ میں ہی ہوں گی“ اپنے ڈربے کو فلیٹ کتے ہوئے اسے خفت سی ہوئی۔ فلیٹ بالظہر وہ ان لوگوں کے سامنے استعمال کرتا تھا، جنہیں فلیٹ نہ دکھانا ہو، جبکہ یہاں معاملہ تلف تھا۔

”کیا ضروری ہے کہ میں تمہارے فلیٹ میں چلوں؟“ لڑکے نے اعتراض کیا۔

”ہرگز ضروری نہیں۔ ویسے میرا خیال ہے، ہمیں ایک دوسرے سے فائدہ پہنچ سکتے ہیں۔“ اس نے جواب دیا اور پھر اچانک ہی پوچھ بیٹھا ”ڈر لگ رہا ہے تمہیں؟“

لڑکے کا چہرہ بے تاثر رہا۔ اس نے کہا ”تم جانتے ہو کہ یہ بات نہیں ہے اور میں بے مشعل بھی نہیں ہوتا۔ خیر، تمہارے ساتھ چلنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔“

وہ لڑکے کو لے کر ڈربے میں چلا آیا۔ ایک کمرے کے فلیٹ میں ایک چھوٹی سی لماری، ایک میز، ایک کرسی اور ایک پلنگ تھا۔ ایک طرف کچن تھا اور اس کے برابر ہی میں باتھ روم۔

”بیٹھو“ اس نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”کلی چائے پی سکو گے یا دودھ لاؤں؟“ اس نے لڑکے سے پوچھا۔

”دودھ کی ضرورت نہیں۔ شکریہ۔ ویسے تو میرے خیال میں چائے کی ضرورت بھی نہیں۔ بہر حال، تم چاہتے ہو تو.....“ لڑکے نے کندھے جھٹک دیے۔

وہ کچن میں چلا آیا۔ پانچ منٹ بعد وہ کمرے میں آیا تو اس کے دونوں ہاتھوں میں بغیر دودھ والی چائے کی دو پیالیاں تھیں۔ اس نے ایک پیالی لڑکے کی طرف بڑھادی اور خود پلنگ پر بیٹھ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ لڑکے کو بڑی ہوشیاری سے پینڈل کرنا ہوگا۔ اس کی چھٹی حس بتا رہی تھی کہ لڑکا اس کے کام آسکتا ہے۔ اس احساس کی اس کے علاوہ کوئی توجہ اس کے سامنے نہیں تھی کہ لڑکا بظاہر کم عمر نظر آ رہا تھا جبکہ اسے یقین تھا کہ لڑکے کی عمر اتنی کم نہیں ہے۔

”وہ دونوں خاموشی سے تلخ چائے کا گھونٹ لیتے رہے۔ دونوں اپنی اپنی جگہ کچھ

”اوہ..... یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا“ اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں ”ویسے تمہارا نام کیا ہے؟“

”بین آنرک“ لڑکے نے جواب دیا۔

وہ ہنس دیا ”گویا تم خود کو پوری طرح یہودی ثابت کرنا چاہتے ہو؟“

”میں کچھ ثابت نہیں کرنا چاہتا اور نہ ثابت کر رہا ہوں۔ تم نے میرا نام پوچھا،

نے تمہیں اپنا نام بتا دیا“ لڑکے کے لہجے میں سادگی تھی۔

”ہاں۔ یہ ٹھیک ہے۔ مگر تم اپنا نام بن اسحاق بھی تو بتا سکتے تھے۔“

لڑکا حیران نظر آنے لگا لیکن یوسف نے بھانپ لیا کہ وہ اداکاری کر رہا ہے۔

تمہارا مطلب نہیں سمجھا؟“ لڑکے نے کہا۔

”مطلب یہ ہے کہ میں اچھا خاصا مترجم ہوں۔“

”اوہ..... میں نے تو اب تک تمہارا نام بھی نہیں پوچھا۔“

لڑکے نے شاید گفتگو کا رخ بدلنے کی کوشش کی۔ یوسف زہرب مسکرا دیا۔

کو اندازہ بھی نہیں ہوگا کہ اس طرح گفتگو کا رخ نہیں بدل سکتا۔ اس نے تو ایک

دلیل میں قدم رکھ دیا تھا۔ ”کون سا نام بتاؤں؟“ اس نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

”کیا مطلب؟“ اس بار لڑکے کی حیرانی بناوٹی نہیں تھی۔

”اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ میں بھی تمہارا بھائی ہوں۔ یہ الگ بار

تمہاری مصلحت میری سمجھ میں نہیں آئی۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ تم قانون ضرورت

برعکس عمل کرتے ہو؟“

”کیا مطلب؟“ لڑکے نے دہرایا۔

”تم ہریات کا مطلب پوچھنے کے عادی معلوم ہوتے ہو؟“

”ایسی بات نہیں“ لڑکے نے تیز لہجے میں جواب دیا ”لیکن نہ میں معمول میں

کرتا ہوں اور نہ ہی یہ پسند کرتا ہوں کہ کوئی مجھ سے معمول میں گفتگو کرے۔“

”تم نے مجھ سے میرا نام پوچھا تھا نا؟“

لڑکے نے کوئی جواب نہ دیا۔ صرف اثبات میں سر ہلا دیا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ ج

ہے۔

”اور میں نے یہ کہا تھا کہ کون سا نام بتاؤں۔ بات یہ ہے کہ میں دو نام کا آ

ہوں۔ صورت حال کے مطابق نام استعمال کرتا ہوں۔ کبھی ضرورت پڑی تو ممکن ہے

”نہیں میں دھمکی دینے کا قائل نہیں ہوں۔ البتہ میں نے زندگی گزاری ہے۔  
میرے اندازے بہت کم غلط ثابت ہوتے ہیں۔“  
”اور میرے بارے میں کیا اندازہ ہے تمہارا؟“

یوسف چند لمحے سوچتا رہا۔ اسے اپنی چھٹی حس کے مطابق اندھیرے میں تیر چلانا تھا،  
تمہاری یہاں موجودگی غیر قانونی ہے۔“ اس نے بے حد اچانک کہا اور کھٹے کے دوران  
لڑکے کے چہرے کو بغور دیکھتا رہا۔ اسے لڑکے کے اعصاب کا قائل ہونا پڑا تھا۔ اس کے  
جلے کا رد عمل محض ایک ٹانے کے لیے لڑکے کی آنکھوں میں جھلکا تھا۔ چہرہ بدستور بے  
اثر رہا تھا۔ بہر حال اس کے لیے وہ ایک ٹانے کا رد عمل ہی بہت کافی تھا۔ کیونکہ اگر اس  
نے سمجھے میں غلطی نہیں کی تھی تو وہ تاثر خوف کا تھا۔

”میں کوئی اعتراف نہیں کر رہا ہوں۔ فرض کر لو کہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو تب بھی  
کیا فرق پڑتا ہے؟ کیونکہ ایسے لوگوں کی تعداد کم تو نہیں، جو غیر قانونی طور پر اس ملک میں  
اغل ہوئے ہیں۔“

”فرق پڑتا ہے“ اس نے زور دے کر کہا ”وہ تمام لوگ حکام کی نظروں میں نہیں  
ہیں اور نہ ہی ان کے متعلق لوگ جانتے ہیں“ اسے اندازہ تھا کہ اب وہ خطرناک مرحلے  
میں داخل ہو رہا ہے۔ لڑکا خطرناک تھا اور پھر یہ بھی ضروری نہیں تھا کہ وہ کام کا ثابت ہو  
مگر اس وقت اس کی اپنی ذہنی حالت ایسی تھی کہ وہ جینا میلکم کے ہاتھوں ابدیت کا کوئی  
آئیڈیا خواہ وہ کتنا ہی غیر حقیقی ہو، فروخت کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ  
آئیڈیا جینا میلکم جیسی گھاک کاروباری شخصیت کے لیے صرف قابل قبول ہی نہ ہو بلکہ  
اقابل مزاحمت اپیل رکھتا ہو۔ بائبل سے اسے کوئی مدد نہیں مل سکی تھی۔ کوئی اور ذریعہ  
موجہ نہیں رہا تھا۔ ایسے میں ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ وہ اس اسکیم پر لعنت بھیج کر کچھ اور  
سوچتا لیکن اس کی فطرت میں ہٹ دھرمی بھی تھی چنانچہ اس اسکیم سے چٹ کر رہ گیا تھا۔  
اب وہ لڑکا ہی فی الوقت اس سلسلے میں اس کی آخری امید تھا۔

”اور تمہارے متعلق میں جانتا ہوں.....“ اس نے خاصے توقف کے بعد کہا  
”کہ تم یہاں کسی غیر قانونی ذریعے سے آئے ہو۔ تمہارا نام بین آئزک ہے اور تم یہودی  
ہو۔“ کسی یہودی کے لیے اس ملک میں کوئی جگہ نہیں۔“

”میں اس بات کی تردید کر سکتا ہوں“ لڑکے نے بے حد سکون سے کہا۔  
”یہودیوں کے معاملے میں یہاں تردید سے کام نہیں چلے گا۔ تشدد کی صورت میں

سوچ رہے تھے۔ پھر لڑکے نے بے حد رکھائی سے کہا ”میرا خیال ہے اب ہمیں کام کی  
کر لینی چاہئے۔ تم مجھے وقت ضائع کرنے والے آدمی معلوم نہیں ہوتے مجھے یقین ہے  
میں تمہارے لیے کوئی اہمیت رکھتا ہوں۔“

یوسف نے چائے کی پیالی خالی کر کے میز پر رکھی اور گہری سانس لے کر  
”ضروری نہیں کہ یہ درست ہو مگر میرا خیال ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے  
آسکتے ہیں۔ اسی لیے میں تمہیں یہاں لایا ہوں۔“  
”میں نہیں سمجھتا کہ تم میری کوئی مدد کر سکتے ہو“ لڑکے نے بھی پیالی میز پر  
دی۔

”اس کا فیصلہ تو بعد میں ہوگا، پہلے ہمیں کھل کر گفتگو کرنی ہوگی۔ ایک دوسرے  
کے بارے میں پوری طرح جانتا ہوگا۔“  
”میرے خیال میں اس کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ میرے نکتہ نظر سے تو  
خطرناک ثابت ہوگا۔“

یوسف نے اس کی بات نظر انداز کر دی اور جیب سے سگریٹ کا پیکٹ اور ماچ  
نکالی۔ پیکٹ کھول کر اس نے لڑکے کی طرف بڑھایا۔ لڑکے نے نفی میں سر ہلادیا۔ اس۔  
ایک سگریٹ نکالی، اسے سلگایا اور چھت کی طرف دھواں چھوڑتا ہوا بولا ”یہ یقین کر لو کہ  
ہمارے اشتراک سے صرف مجھے ہی نہیں، تمہیں بھی فائدہ ہوگا۔“  
”مجھے نہیں معلوم، تم کس قسم کے اشتراک کی بات کر رہے ہو“ لڑکے نے سر  
لجے میں کہا۔

”یہ بعد کی بات ہے۔ پہلے میں تمہارے بارے میں جانتا چاہتا ہوں اور میں چاہتا  
ہوں کہ تم مجھے سب کچھ سچ سچ بتا دو۔“  
”پہلے مجھے اس فائدے کی نوعیت کا علم ہونا چاہئے جو مجھے پہنچنے والا ہے“ لڑکے کا  
لجہ طنزیہ ہو گیا۔

یوسف چند لمحے اسے بغور دیکھتا رہا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ لڑکے کو قائل کرنا آسان  
کام نہیں۔ اس نے دھیمے لہجے میں مگر زور دے کر کہا ”فائدے کی نوعیت کا علم تو تمہیں  
فی الحال نہیں ہو سکتا۔ البتہ تم ان نقصانات کے بارے میں جان سکتے ہو جو مجھ سے عدم  
تعاون کی صورت میں تمہیں پہنچیں گے۔“

”تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟“ لڑکے نے تیور بدل کر پوچھا۔



تم اپنا پورا شجرہ اگل دو گے۔ ہمارے ہاں شک کو بھی یقین کی سی اہمیت دی جاتی ہے۔ اس نے کہا۔

لڑکے کی آنکھوں میں خوف ناک چمک ابھری۔ اس کے عضلات میں تناؤ محسوس ہونے لگا۔

یوسف خوف زدہ ہو گیا لیکن جانتا تھا کہ یہ مرحلہ فیصلہ کن ہے۔ ذرا سی کمزوری دکھائی اور مارے گئے ”کوئی ایسی ویسی بات نہ سوچنا“ اس نے جلدی سے کہا ”میں کوئی ترنوالہ نہیں ہوں اور یہ شہر کا گنجان آباد علاقہ ہے۔ یہاں تو کوئی اپنے طور پر آہ بھی نہیں بھر سکتا۔ کم از کم دونوں طرف کے پڑوسیوں کو علم ہو جاتا ہے کہ یہاں آہ بھری گئی ہے۔ کوئی احتیاط نہ کرے تو اپنی قسمت پر مہر لگا لو گے۔“

لڑکے کے عضلات ڈھیلے پڑ گئے ”تم چاہتے کیا ہو؟“ اس نے پوچھا۔  
”میں تمہارے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔ یقین کرو“ اس سے تمہیں فائدہ پہنچ سکتا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ پوچھو۔“

”تمہارا نام بین آئزک ہے اور تم یہودی ہو؟“

”ہاں۔ یہ درست ہے۔“

”مجھے شک ہے اس میں۔“

”شک کی کوئی وجہ بھی ہوگی؟“

”ہاں۔ جس بات پر تمہارا جھگڑا ہوا تھا، وہ بات عربوں کا کوئی ہمدرد ہی کہہ سکتا ہے۔ کسی یہودی کو کوئی ضرورت نہیں کہ وہ اپنے دشمنوں کو ان کی کمزوری بتائے اور اسے دور کرنے کی تلقین بھی کرے۔“

”اس کی وجہ ہے۔ میں فلسطینیوں کو مظلوم سمجھتا ہوں۔ ہم بے وطن تھے، ہم نے وطن حاصل کرنے کے لیے انہیں بے وطن کر دیا۔ میں فلسطین پر ان کا حق تسلیم کرتا ہوں لیکن یہودیوں کے حق سے بھی دست بردار نہیں ہو سکتا۔ یہ عجیب سا تضاد ہے مجھ میں۔“

”عجیب بات ہے۔“

”ایک میں ہی نہیں، ایسے بہت سے لوگ ہوں گے دنیا میں جو آنکھیں بند کر کے تقلید نہیں کرتے۔ انسانیت پسند تو ہر جگہ ہوتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے، میں نے مان لیا۔ یہ بتاؤ، تم نے لڑائی کی باقاعدہ تربیت حاصل کی ہے؟“

”ہاں۔ میں ایک تربیت یافتہ کمانڈو ہوں اور بارہا انسانی خون بہا چکا ہوں“ یہ کہتے ہوئے لڑکا ایک جہاں دیدہ مرد معلوم ہونے لگا۔

یوسف کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد لہری دوڑ گئی۔ ”اور یہ تربیت کہاں حاصل کی تم نے؟“ اس نے پوچھا۔

”پولینڈ میں، ایک برطانوی مہجر نے ہمیں تربیت دی تھی“ بین آئزک کی نظریں جیسے کہیں دور..... ماضی میں پہنچ گئیں۔

”پولینڈ میں؟“ یوسف کے لہجے میں حیرت تھی ”تو کیا وہ دودھ پیتے بچوں کو تربیت دے رہے تھے؟“

”روسیوں کے عہد کی بات ہے یہ۔ میں اس وقت ۱۳ سال کا تھا۔ انہی دنوں میں نے پہلے روسی کو ہلاک کیا تھا“ بین آئزک نے بے حد سادگی سے کہا۔

”اور جو مہجر تمہیں تربیت دے رہا تھا، اس کا کیا حشر ہوا؟“

”ہمارے ساتھیوں میں سے ایک نے مخبری کی۔ مہجر پکڑا گیا۔ روسیوں نے اس پر بے تحاشہ تشدد کیا اور وہ مر گیا۔ بعد میں میں نے مخبری کرنے والے کو ٹھکانے لگا دیا۔“

اس کے لہجے کی بے نیازی سے یوسف کو خوف آنے لگا۔ لڑکا..... بلکہ اسے لڑکا کہنا ٹھیک نہیں تھا۔ بہر حال وہ بہت سخت جان اور خطرناک تھا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ

میں نے زندگی کی جنگ لڑی ہے؟ اس نے سوچا پھر پوچھا ”اور تمہارے گھر والے؟“

”وہ سب قتل کر دیے گئے“ بین آئزک نے عام سے لہجے میں کہا ”اس کے بعد میں نے بے شمار روسیوں کو قتل کیا“ اس کے نوجوان چہرے پر اچانک بڑھاپے کا بے

کراں وقت کا سایہ لہرا گیا۔ اب وہ نوجوان ہرگز نہیں لگ رہا تھا۔

یوسف کے جسم میں خوف کی سرد لہری دوڑ گئی۔ اس سے پہلے اس کا سابقہ کسی ایسے شخص سے نہیں پڑا تھا۔ وہ بالکل نیا آدمی تھا۔ اگر وہ یہودی تھا تو یہودیوں کی یہ نئی نسل اس نسل سے بالکل مختلف تھی، جس کا تذکرہ تاریخ میں ملتا ہے۔ ”تو کیا تمہارے

خاندان میں کوئی بھی نہیں بچا؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں۔ میرے انکل، میرے باپ کے چھوٹے بھائی زندہ تھے۔“

”تھے کا کیا مطلب؟ کیا اب وہ زندہ نہیں؟“

”وہ سب کچھ جانتے ہیں“ یہ ایک نوجوان کا جواب تھا..... بچکانہ جواب لیکن اگلے ہی لمحے وہ پختہ کار مرد بن گیا۔ اس نے ایک لمحے سوچنے کے بعد اضافہ کیا ”کیونکہ وہ“

کو سمجھنا بہت ضروری ہوتا ہے کیونکہ کسی بھی وقت وہ مجھے امیگریشن کے حکام کے حوالے کر سکتا ہے۔ مجھے یہاں موجود ہونے کا کوئی حق نہیں" وہ چپ ہو گیا اور پھر چند لمحے کے کرب ناک توقف کے بعد بولا "مجھے دنیا میں کیس بھی موجود ہونے کا حق نہیں۔ میں نے خاصا طویل عرصہ ہندوستان میں گزارا ہے۔ انسانوں کے اس جنگل میں ایک ناموجود آدمی کا گم ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں۔ مگر اچانک مجھے محسوس ہوا کہ محکمہ خفیہ کے لوگ مجھ پر نظر رکھ رہے ہیں۔ انہیں شبہ تھا کہ میرا تعلق سی آئی اے سے ہے۔ یہ آنکھ پھٹی میرے لئے نئی نہیں۔ میں نے سمجھ لیا کہ اب مجھے کہیں اور جانا ہوگا۔ خوش قسمتی سے بمبئی میں مجھے ایک جہاز پر کام مل گیا۔ یوں میں کراچی آگیا۔ مگر اب مجھے یہاں بھی اپنی عاقبت خطرے میں نظر آرہی ہے۔"

"یہ تو واقعی المیہ ہے" یوسف نے کہا اور چند لمحے اسے نگاہوں ہی نگاہوں میں تولتا رہا۔ پھر اس نے پوچھا "اگر تمہیں پاسپورٹ اور شناختی کاغذات مل جائیں تو تم فلسطین..... میرا مطلب ہے، اسرائیل جاسکتے ہو بلکہ جہاں چاہو، جاسکتے ہو۔ کیا خیال ہے؟"

"یہاں کے پاسپورٹ اور کاغذات ہوتے ہوئے تو میں اسرائیل کی حدود میں قدم بھی نہیں رکھ سکتا۔ میری تو اسرائیل میں بھی کوئی شناخت نہیں ہے۔ تمہیں شاید اندازہ نہیں کہ اسرائیل سے تمہارے ملک کے تعلقات کس حد تک دوستانہ ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے ہدایاتی انداز میں قہقہہ لگایا۔

یوسف نے فیصلہ کیا کہ یہ اپنے پتے سامنے رکھنے کا مناسب ترین وقت ہے۔ اس نے جیب سے مڑا ترا اخبار نکالا۔ اس پر بڑے پیار سے ہاتھ پھیر کر اس نے شکنیں دور کیں اور اسے میز پر پھیلا دیا۔ پھر اس نے جینا میکم کی تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ "بین آنزک! جانتے ہو یہ خاتون کون ہے؟" اس نے پوچھا۔

"میں نے کہا نا" میں تو اس ملک میں خود کو بھی نہیں جانتا۔ "بین آنزک نے تلخ لہجے میں کہا۔

"اس خاتون کو غور سے دیکھو اور بتاؤ کہ اس کے بارے میں تمہاری رائے کیا ہے؟"

بین آنزک نے اخبار اس سے لے لیا۔ وہ بہت غور سے جینا میکم کی تصویر دیکھتا رہا۔ یوسف کو حیرت ہوئی کیونکہ بین آنزک اب انٹرویو کی تفصیل پڑھ رہا تھا۔ اس کا

"یہ چیز ہمیں نسلی طور پر دلچسپ ہوئی ہے، یہ ہمارا ورثہ ہے" بین آنزک۔

یوسف کے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ زندگی کے اس مو پر، اس اجنبی، ادھیڑ عمر لڑکے نے اس کی اتفاقی ملاقات معنی خیز ہے، جیسے قسمت نے اس کے راستے کی تمام رکاوٹیں دور کر کے اسے جھلگاتی ہوئی شاہراہ بنانے کا فیصلہ کر لیا ہو۔ اس کا دھڑکا اس جوار کیسے اعتماد سے لبالب بھر گیا، جسے اچانک احساس ہو گیا ہو کہ قسمت ساتھ دے رہی ہے اور اب وہ ریت کو ہاتھ لگائے گا تو وہ بھی سونا بن جائے گی۔ کرارے، نئے نوٹوں کی محک اس کے وجود میں ہلکورے لینے لگی۔ اب صرف اسے قسمت کی اس کروٹ سے استفادہ کرنا تھا۔

"بین آنزک! کبھی تم نے سوچا کہ تم زندگی سے کیا چاہتے ہو؟" اس نے پوچھا۔ جواب جس سرعت سے ملا، وہ اس کے لیے حیران کن تھا۔ "ہاں۔ میں وطن واپس جانا چاہتا ہوں۔ وطن سے میری مراد پولینڈ نہیں، آبائی سرزمین فلسطین ہے۔ میں ہر روز یہی سوچتا ہوں کہ وہ کون سا دن ہوگا، جب میں وطن جاؤں گا۔"

"ادہ..... لیکن تم پولینڈ کو وطن کیوں نہیں کہتے؟" "کچھ تو اس لیے کہ آبائی وطن کی خاک بے حد مقدس ہے۔ اس کے آگے کچھ نہیں چٹا اور کچھ یوں کہ پولینڈ اب ختم ہو چکا ہے۔ وہاں اب کبھی آزادی کی کوئی تحریک نہیں ابھر سکتی۔ میرے فلسطین کی بات اور ہے۔ وہ تو پیغمبروں کی سرزمین ہے" بین آنزک کا لہجہ جذباتی ہو گیا "ممکن ہے، میں وہاں جاؤں تو میرے انکل ننھانیل مجھے زندہ ملیں۔"

"تو اب تم وہاں چلے کیوں نہیں جاتے؟" یوسف نے پوچھا۔

بین آنزک حیرت سے اسے دیکھتا رہا "سنو دوست! درحقیقت میں ایک ناموجود آدمی ہوں" اس نے جواب دیا "جو موجود ہوتے ہیں، ان کی کوئی شناخت ہوتی ہے۔ آدمی محض اپنے وجود سے تو کیسے تسلیم نہیں کیا جاتا۔ کاغذات سے وجود ثابت ہوتا ہے، دستاویزات سے۔ میں بحری جہازوں میں سفر کرتا رہا ہوں۔ وہ بھی اس صورت میں جب جہاز کا کپتان بہت زیادہ سوالات کرنے کا عادی نہ ہو اور اسے کسی خلاصی کی شدید ضرورت بھی ہو۔ میں جہاں بھی اترتا ہوں، جہاں بھی رہتا ہوں، میرے وجود کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہوتی۔ جہاز کے کپتان سے رابطہ کرتے ہوئے مجھے محتاط رہنا ہوتا ہے۔ کپتان

مطلب تھا کہ وہ اردو صرف بول ہی نہیں پڑھ بھی سکتا ہے۔  
 بین آنرک خاصی دیر تصویر کو گھورتا رہا۔ پھر اسے یوسف کی نگاہوں کا احساس  
 جو سوالیہ نظروں سے اسے تکتے جا رہا تھا۔ ”میرا خیال ہے، یہ خاتون ناخوش ہے۔“  
 ”مگر؟“

”تو اور کیا۔ جو شخص موت سے لڑنے کا دعویٰ کرے، وہ منکر ہی کہلائے گا“ بین ابزکی کے لہجے میں خفگی تھی ”اور تم کیا کھیل کھیل رہے ہو مسٹر؟ اتنا تو میں سمجھتا ہوں

”کیوں۔ مجھے کیوں ہوگی؟“

یوسف نے اس کے کٹیلے لیے اور بے رحمانہ سوال کو نظر انداز کر دیا۔ اس اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ اس وقت اپنے ہی جیسے ایک انبان کے روبرو ہے۔ بین آئزک اندر سے خام اور نرم ہے۔ وہ اوپر سے سخت دل بھی ہے اور سخت جان بھی۔ اسے اب سوا کسی سے بھی دلچسپی نہیں۔ اس لیے کہ زندگی نے اسے برتا ہے، زخم دیے ہیں اور تلمیحوں سے نوازا ہے۔

”ہونی چاہئے۔“ یوسف نے کہا ”ٹھہرو“ میں تمہیں اس کی وجہ بھی بتاتا ہوں۔ تمہیں اس عورت کو خوشی مہیا کرنے کی کوشش کرنی چاہئے، کیونکہ اس کے عوض تمہاری ہر خواہش، تمہاری تمام ضروریات پوری کر سکتی ہے۔ وہ تمہیں شناخت، شناخت کائنات، پاسپورٹ، کام کی ایک قومیت اور ایک گھر فراہم کر سکتی ہے.....“

بین آنرک نے بے حد تندہ لہجے میں کہا ”یہ خیال تمہیں کیسے آیا کہ مجھے ایک گھر کی طلب ہے؟“

یوسف نے ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ تھام لیا ”یہ طلب تو ہر شخص کو ہوتی ہے؟“  
یوسف نے اپنے تجربات اور اپنی خواہشات کو سامنے رکھتے ہوئے بہت بھرپور اور  
موثر حملہ کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ انسانی سرشت میں گھری اہمیت بہت زیادہ ہے۔ گھر کبھی  
صرف ایک خواہش نہیں ہوتا، اس کے ساتھ بہت کچھ مشروط ہوتا ہے۔ وہ صرف چار  
دیواریں، در درپچوں، کشادہ اور آراستہ کمروں کا نام نہیں، جب تک اس کے چپے چپے پر  
آسودہ خواہشیں چلتی پھرتی، ہنستی گاتی نہ ہوں، وہ گھر نہیں ہوتا۔

ادھیڑ عمر لڑکے کو اس وار نے دہلادیا تھا مگر بعد اودجنگ جوتھا۔ اس نے بہت تیزی سے خود کو سنبھال لیا ”وہ اس سلسلے میں کس طرح کام آسکتی ہے..... کیا مدد کر سکتی ہے؟ مجھے اس کے عوض کیا کرنا ہوگا بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ میرے کس کام، میری کس

بدلت کے بدلے وہ میرے کام آئے گی؟ میرا اس منکر بوڑھی عورت سے کیا واسطہ ہے؟ میں.....“  
 ”منکر؟“

”تو اور کیا۔ جو شخص موت سے لڑنے کا دعویٰ کرے، وہ منکر ہی کہلائے گا“ بین ابڑک کے لہجے میں خفگی تھی ”اور تم کیا کھیل کھیل رہے ہو مسٹر؟ اتنا تو میں سمجھتا ہوں کہ تم بے حد مطلبی اور خود غرض آدمی ہو۔ تم بے سبب ہی مجھ سے نہیں مل بیٹھے ہو اور مارا نام کیا ہے؟“

”نام میں تمہیں بتا چکا ہوں..... جوزف ڈیوڈسن“ یوسف نے سرد لہجے میں کہا۔  
 فنگو کا یہ رخ اس کے لیے قابل قبول نہیں تھا۔ اسے اب بھی پوری طرح یقین نہیں تھا۔  
 - بن آئزک درحقیقت یہودی ہے۔ تاہم اس کا امکان بھی تھا اور اس صورت میں وہ  
 سف کی حیثیت سے سامنے آنا نہیں چاہتا تھا۔

”لیکن تم نے کچھ دیر پہلے دو ناموں کا تذکرہ کیا تھا“ مین آئزک نے اعتراض کیا۔  
 ”یقیناً کیا تھا اور تمہاری طرح میرا بھی دوسرا نام ضرورت ہے۔ جہاں تک میرے  
 دغرض ہونے کا تعلق ہے، وہ میں ہوں، تم بھی ہو۔ نہیں ہو کیا؟ اور میں یہ بات کبھی  
 پاتا بھی نہیں ہوں۔ میں بے غرضی اور خلوص کے دعوے کر کے کسی کو نہیں لوٹتا۔  
 یہ اپنی ذہانت پر انحصار کرتا ہوں۔“

”مجھے یقین نہیں ہے کہ تم صرف جوزف ڈیوڈسن ہو۔“

یوسف نے الماری کھول کر اپنا شناختی کارڈ نکالا..... جوزف والا..... اور بین  
 زک کی طرف بڑھا دیا۔

بن آئزک نے کارڈ کا جائزہ لیا اور پھر اسے واپس دیتے ہوئے بولا ”اس سے کیا ہے؟ یہ خاتون.....“ اس نے اخبار میں جینا میکیم کی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”..... یہ بن اسحاق کے نام سے میرا شناختی کارڈ بھی بنا سکتی ہیں۔ تمہاری کا مطلب یہی تو تھا“ پھر یوسف کے چہرے کا تاثر دیکھ کر وہ ٹھنک گیا۔ ”خیر، مجھے کیا؟“

”یہ ہوئی نابات۔ میں تمہیں بتاتا ہوں۔“ یوسف نے خوش ہو کر کہا۔

اس نے بین آنرک کو سب کچھ کہہ سنایا۔ اپنا یہ مفروضہ بھی بتا دیا کہ بائبل میں  
ب. العمری کے متعلق جو بیان ہے، وہ جینا میکم کے لئے یقینی طور پر متاثر کن ثابت

کے بارے میں چھان بین کی جائے تو کیا نتیجہ نکلے گا؟ دیانت داری سے کبھی اتنی دولت حاصل نہیں کی جاسکتی.....

”یہ بات چھوڑو کہ دنیا نے میرے ساتھ کیا کیا ہے“ بین آئزک نے سخت لہجے میں اس کی بات کاٹ دی ”میں آپ اپنا خیال رکھ سکتا ہوں، جینے کے ہنر سے واقف ہوں۔ ورنہ اب تک مرچکا ہوتا۔ مجھے تم اپنے فلسفے سے علیحدہ ہی رکھو۔“

”دیکھو! اب تک تم ثابت کر چکے ہو کہ تم سخت جان آدمی ہو اور جینا جانتے ہو لیکن اس وقت تم جس دشواری میں پھنسے ہوئے ہو، وہ بہت بڑی ہے۔ امیگریشن والوں کے ہتھے چڑھ گئے تو کمائو تربیت کسی کام نہیں آئے گی۔ تمہارے بچ نکلنے کی یہی ایک صورت ہے“ یوسف نے بہت محتاط ہو کر بات کی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ بین آئزک اسے دھمکی تصور کرے یا اس کے ذہن میں بلیک میلنگ کا خیال آئے۔ وہ کئی طرح کی گولیاں استعمال کرنے کا قائل تھا۔ کھٹ مٹھی گولی سے کام چل جائے تو زہر کی گولی استعمال کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔

بین آئزک نے بے چینی سے پہلو بدلا ”دیکھو بھائی! وہ کیسی ہی سسی، بہر حال عورت ہے..... کم زور اور بوڑھی عورت ہے۔“

”ٹھیک کہتے ہو مگر ہم اسے کوئی نقصان تو نہیں پہنچا رہے ہیں“ یوسف نے جلدی سے کہا ”میرے آئیڈیلے پر اگر وہ سرمایہ کاری کرتی ہے تو لاکھ دو لاکھ کی ہی کرے گی نا۔ دوسری طرف ٹیلی فون پر ایک منٹ کی گفتگو میں وہ کروڑوں روپے خرچ کر کے ایک ایسی کہنی خرید لیتی ہے، جو تباہی کے دہانے پر کھڑی ہے، وہ بڑے سے بڑا خطرہ مول لے سکتی ہے۔ لاکھ دو لاکھ کی اوقات ہی کیا ہے؟ وہ اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے اتنی رقم تو ایک گھنٹے میں کما لیتی ہے۔ بینک میں اس کے کھاتے میں اعداد کا اضافہ ہوتا رہتا ہے، اور اسے پتا بھی نہیں چلتا۔ سمندر میں سے ایک باٹنی پانی نکال لیا جائے تو سمندر میں کوئی کمی تو نہیں ہو جاتی۔“

بین آئزک خاموش بیٹھا، جینا میلکم کی تصویر کو دیکھ کر جا رہا تھا۔

یوسف کے دل میں شدت سے خواہش ابھری کہ کاش اس وقت وہ بین آئزک کے ذہن میں جھانک سکتا۔ نہ جانے کیا سوچ رہا تھا وہ۔ اگر اسے معلوم ہوتا تو وہ سوچ سمجھ کر ایک اور وار کرتا۔ بہر حال، کچھ نہ کچھ تو کتنا ہی تھا ”اور یہ بھی تو دیکھو.....“ آخر کار اس نے آئزک کی خاموشی سے تنگ آکر کہا ”یہ تو نہیں ہے کہ اسے اپنی رقم کے بدلے کچھ بھی نہیں ملے گا۔ میری تھیوری پر جب تک کام نہ کیا جائے، اسے یوں ہی زبانی

ہوگا۔ وہ اسے یقین دلا سکے گا کہ کہیں نہ کہیں کوئی راز ہے، جسے دریافت کر کے آدمی بھی اپنی عمر طبعی کو طول دے سکتا ہے۔

بین آئزک خاموشی سے سنتا رہا۔ یوسف کے خاموش ہونے کے بعد اس نے ”میرا خیال ہے، تم خود بھی اس پر یقین رکھتے ہو۔“

”میرے یقین کی کوئی اہمیت نہیں“ یوسف نے بے پروائی سے کہا ”ویسے یہ تا تو نہیں ہے۔“

بین آئزک نے کندھے جھٹک دیے ”انکل نتھائل ہی اس سلسلے میں کوئی رائے دے سکتے ہیں۔“

”اوہ ہاں۔ انکل نتھائل..... سائنس دان، ماہر آثار قدیمہ، لیکن تمہیں معلوم کہ اس وقت وہ کہاں ہوں گے۔“

”کیا پتا؟ وہ زندہ بھی ہیں یا نہیں!“ بین آئزک نے افسردگی سے کہا۔ پھر اسے کچھ خیال آگیا ”لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس طرح مجھے شناختی کاغذات پاسپورٹ کیسے مل سکتا ہے؟“

”اگر جینا میلکم قائل ہو گئی تو وہ یقیناً یہ چاہے گی کہ تم اور میں فلسطین جائیں اس سلسلے میں تحقیقی کام کریں۔ وہ بے انتہا دولت مند ہی نہیں، بین الاقوامی اہمیت شہرت کی حامل ہے۔ اس کے اثر و رسوخ کی کوئی حد نہیں۔ وہ تمہیں امریکی شہریت دلا سکتی ہے۔“

”لیکن اپنے لیے جنت میں جگہ حاصل نہیں کر سکتی!“ بین آئزک نے تلخ لہجے کہا۔

”اسے وہاں جانے کی آرزو بھی نہیں۔ وہ تو ہمیشہ یہیں رہنا چاہتی ہے۔ اگر تھیوری درست ثابت ہوتی ہے تو اسے زمین پر مزید قیام کی مہلت مل.....“

”میرے خیال میں تو تم اسے جہنم کا ٹکٹ دلا دو گے۔“

”دیکھو! ہم کوئی بے ایمانی یا بد معاشی نہیں کر رہے ہیں“ یوسف نے اسے سمجھا

اسے اندازہ ہو گیا کہ بین آئزک سخت جان، سخت کوش اور خود غرض سہی لیکن کاروبار زندگی کے امور میں ابھی کچا ہے۔ اس کے سامنے بچہ ہے۔ ”دیکھو نا، ہم تو اسے آئیڈیا فروخت کر رہے ہیں اور پھر ٹھیک ہے کیا..... دیانت ہے کہاں؟ دنیا نے میر اور تمہارے ساتھ جو سلوک کیا ہے، وہ کون سا درست ہے؟ خود جینا میلکم کی تمام دوا

والی کوئی اور دلیل نہیں۔ یہاں لفاظی بھی بے کار ہے۔

پھر اس نے بین آنزک کی آنکھوں میں دیکھ لیا کہ بات اس کے دل میں اتر گئی ہے  
”ایک پیالی چائے اور نہ پی لیں“ اس نے کہا ”اس کے بعد تفصیل سے گفتگو کریں گے۔“

چائے دماغ کے جالوں کو پلک جھپکتے صاف کر دیتی ہے۔  
”ٹھیک ہے جالے صاف ہوں یا نہ ہوں“ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ چائے کی  
افادیت کے تو اور بھی بہت سے پہلو ہیں“ بین آنزک نے جواب دیا۔

○-----○-----○

منصوبہ ایک دن میں تیار ہو گیا، نوک پلک دوسرے دن درست کر لی گئی۔ اس کے  
بعد یوسف نے بنیادی مسائل کا جائزہ لیا۔ جینا میکلم کے سلسلے میں اس کی ریسرچ بہت کام  
آئی۔ یہ بات طے تھی کہ جینا میکلم تک پہنچنا آسان کام نہیں ہے۔ اس سے ملاقات کے  
لئے وقت لینے سے کہیں آسان کسی سربراہ مملکت سے ملاقات تھی۔ اس سلسلے میں  
یوسف کو بہت زیادہ سرکھپانا پڑا۔ بین آنزک اس سلسلے میں دلچسپی لینے پر آمادہ نہیں تھا۔  
ویسے بھی اس کے پاس بہترین جواز تھا۔ ”میں کچھ جانتا ہی نہیں ہوں.....“ یوسف اس  
جواز سے بہت چڑتا تھا۔ اس کا فلسفہ یہ تھا کہ کیوں نہیں جانتے، جبکہ جانا چاہئے۔ تاہم اس  
نے اپنا یہ فلسفہ بین آنزک پر نہیں تھوپا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی بہانے کی آڑ لے کر بین  
آنزک اشتراک سے دست بردار ہو جائے۔ اگرچہ اس کی صورت حال کے پیش نظر اس  
بات کا امکان نہیں تھا۔ پھر بھی خطرہ مول لینا ٹھیک نہیں تھا۔ انسانی ذہن کا کیا بھروسہ! کسی  
بھی وقت کسی بھی راہ چل نکلے۔

دوسرے دن یوسف نے فیصلہ کر لیا کہ جینا میکلم سے اپائنٹ منٹ لینا ممکن نہیں  
چنانچہ بغیر اپائنٹ منٹ کے ملنا ہو گا۔ کام مشکل ضرور تھا لیکن دنیا میں ناممکن تو کچھ بھی  
نہیں ہوتا۔ اسے بغیر اپائنٹ منٹ کی اس ملاقات کے لیے فضا تیار کرنی تھی اور اس کے  
بعد اپنی تمام تر صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کرنا تھا۔ اس کے لیے اس نے ایک خاکہ ترتیب  
دے لیا، جس میں حسب ضرورت کسی بھی وقت میسر آنے والے رنگ بھرے جاسکتے  
تھے۔

یوسف کا تجربہ اور مشاہدہ بتاتا تھا کہ اگر مسائل کو مخلوق تصور کر لیا جائے تو وہ  
افزائش نسل کی تیز رفتاری کے سلسلے میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ مخلوق کو بھی میلوں پیچھے  
چھوڑ دیں گے۔ مسئلے کی کوکھ سے مسئلے اور پھر ان مسئلوں کی کوکھ سے مزید مسئلے جنم لیتے

طور پر تو مسترد نہیں کیا جاسکتا۔ ایسا تو کوئی بھی نہیں کر سکتا۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم جینا  
سے کچھ لے نہیں رہے ہوں گے..... بلکہ اسے کچھ دے رہے ہوں گے۔ امید  
دولے سے بڑھ کر زندگی کے لیے کوئی چیز طوالت بخش نہیں ہوتی۔ ہم پوری سچائی  
ساتھ اس کے لئے تحقیقی کام کریں گے اور اس کے عوض تنخواہ لیں گے۔ ہم ایک  
ترتیب دیں گے، فلسطین جائیں گے، وہاں تحقیق کریں گے اور باقاعدگی سے رپورٹ  
بھیجیں گے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ صرف اتنی سی بات سے جو اس میں زندگی  
نئی امنگ پیدا ہوگی، وہ کم از کم پانچ سال تک تو اسے نہیں مرنے دے گی۔ اسے تو زند  
سے چٹے رہنے کا..... اس چھوٹی دُور کو دلوپنے کا بہانہ چاہیے.....“

اچانک بین آنزک نے اس کی تقریر کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس نے تصویر  
تھپتھپاتے ہوئے کہا ”تم ایک بات بھول رہے ہو دوست۔ یہ عورت تمہاری بات پر کب  
یقین نہیں کرے گی۔“

یوسف نے سخت نظروں سے اسے دیکھا، جیسے اس کے آر پار دیکھنے کی کوشش  
رہا ہو۔ ”ممکن ہے“ تم ٹھیک کہہ رہے ہو“ اس نے آہستہ سے کہا ”لیکن ایک بات یہ  
بھی یقین سے کہہ سکتا ہوں، وہ تمہاری بات پر یقین کئے بغیر نہیں رہے گی“ اس نے لفظ  
”تمہاری“ پر خاص طور پر زور دیا تھا۔

چند لمحے وہ ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے رہے۔ تمام نقابیں درمیان سے  
ہٹ گئی تھیں، کوئی پردہ نہیں رہا تھا۔ ہر چیز واضح تھی اور ہر حقیقت عیاں۔ ان کے  
درمیان ایک ہی رشتہ تھا، جو دنیا کا سب سے مضبوط بندھن ہوتا ہے..... ضرورت کا  
رشتہ! انہیں ایک دوسرے کی ضرورت تھی۔ وہ اس وقت گویا اس قدیم دور میں پہنچ گئے  
تھے، جہاں بارٹر سٹم رائج تھا، جہاں غلہ اگانے والا سردی سے بچنے کے لیے غلہ نہیں اوڑھ  
سکتا تھا اور شکاری جانوروں کی گرم کھال کو غذا کے طور پر استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ ان کی  
ضروریات مختلف تھیں، ان کی منزلیں جدا تھیں، ان کے مقاصد متضاد تھے لیکن وہ تنہا کچھ  
نہیں کر سکتے تھے۔ دونوں کو ایک دوسرے کی مدد درکار تھی۔

یوسف اس قسم کی صورت حال کے تقاضوں سے بخوبی آگاہ تھا۔ اس نے اپنے اور  
ادویٹر عمر لڑکے کے درمیان حائل خاموشی کو توڑنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اسے تلوار کی  
طرح لٹکنے دیا تاکہ وقت اور صورت حال کا فیصلہ پوری شدت اور توانائی کے ساتھ بین  
آنزک کے دل و دماغ میں اتر جائے۔ وہ جانتا تھا کہ اس خاموشی سے بڑھ کر قاتل کرنے



جار ہے تھے۔ ان میں اہم ترین مسئلہ ضرورت زر کا تھا۔ جینا میلکم تک بے ضابطہ پہنچنے کے سلسلے میں اسے اچھی خاصی سرمایہ کاری کرنی تھی۔

بہت سوچنے کے بعد اس نے اس کا ایک حل ڈھونڈ نکالا۔ اس نے اپنا ڈربہ فلیور فروخت کر دیا اور ایک ہاتھ میں اپنا سوٹ کیس اور دوسرے میں بین آنزک کا ہاتھ تھام کر کینٹ کے علاقے کی طرف چل دیا، جہاں سے رہائشی ہوٹل بکثرت تھے۔ اسے اپنے اور بین آنزک کے لیے کمرہ حاصل کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ کمرے کی حالت ایسا تھی کہ اسے اپنے فلیٹ سے دوری کا احساس بھی نہیں ہوا۔ فرق صرف درودیوار ہی تھا۔

سب سے پہلے تو اس نے کچھ ضروری چیزیں خریدیں۔ بین آنزک کو معمولی قسم کے دو جوڑے دلانے۔ پھر اس نے اپنے سوٹ کے لیے بے حد نفیس کپڑا خریدا اور ایک بہترین ٹیلرنگ شاپ کا رخ کیا۔ وہاں اس نے تقاضا کیا کہ اسے سوٹ جلد از جلد درکار ہوگا۔ ٹیلر ماسٹر نے ٹرائی کے لیے اسے تین دن بعد آنے کی ہدایت کی۔

بین آنزک حیران تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جوزف ڈیوڈسن کیا کرتا پھر رہا ہے۔ یہ بات بھی اس کی سمجھ سے باہر تھی کہ جینا میلکم جیسی عورت سے بغیر پائٹ منٹ کے کیسے ملاقات کی جاسکتی ہے۔

سوٹ کا ٹاپ دینے کے بعد یوسف نے ایک پرنٹنگ پریس کا رخ کیا۔ بین آنزک اس وقت اس کے ساتھ نہیں تھا۔ اس نے بین آنزک کو سختی سے ہدایت کی تھی کہ ہوٹل کے کمرے تک محدود رہے۔ کھانا بھی کمرے ہی میں منگوا لے۔ اگرچہ ریستورنٹ ہوٹل کی حدود ہی میں چلی منزل پر تھا مگر اس نے بین آنزک کو ہاں جانے سے بھی منع کر دیا تھا بلکہ اس نے ریستورنٹ کے ویٹر کو معقول ٹپ دے کر اسے اپنا اور اپنے ساتھی کا خیال رکھنے کی ہدایت دی تھی۔ ٹپ جیب میں پہنچتے ہی ویٹر تو ان دونوں کے آگے پیچھے گھومنے لگا تھا۔ وہ بار بار آکر پوچھتا کہ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔

تمام ضروری کاموں سے فارغ ہو کر یوسف نے ایک بار پھر منصوبے پر غور کیا۔ آخر کار وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اس سے بہتر منصوبہ اس صورت حال میں ممکن نہیں۔ منصوبے پر عمل درآمد کے لیے اس نے دو ہفتے بعد کا دن مقرر کیا۔ بین آنزک کو کسی بات کا علم نہیں تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ اس نے کسی قسم کا تجسس بھی ظاہر نہیں کیا۔ بائبل اب بھی یوسف کے پاس تھی۔ وہ آغاز زندگی کے ذیل میں اس کے تمام

ابواب کا مطالعہ کر رہا تھا۔ ہر ایسی بات جو طویل العری کے سلسلے میں بطور دلیل استعمال کی جاسکے، اس کے ذہن میں محفوظ ہوتی جا رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ بین آنزک سے کسی نکتے کی وضاحت طلب کرتا اور اس کی بات بے حد توجہ سے سنتا۔ اسے دیکھ کر ایسا لگتا جیسے وہ کسی امتحان کی تیاری کر رہا ہے اور درحقیقت وہ تھا بھی امتحان ہی..... اس کی زندگی کا سب سے بڑا امتحان، جس پر اس کے مستقبل کا انحصار تھا۔

وہ بے حد مطمئن اور پرسکون تھا کیونکہ جیب کی طرف سے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ اس رقم میں وہ تین ماہ بہ آسانی گزار سکتا تھا۔

کبھی کبھی وہ بین آنزک کو نعتی قبیلے کے بارے میں چھیڑ دیتا۔ بین آنزک اپنے انکل نعتائل کے حوالے سے ان دیکھی سرزمین کی باتیں کرتا رہتا۔ ایسے میں دونوں ہی کی آنکھیں خوب چمکتیں۔ بین آنزک کی آنکھوں میں خواب ہوتے۔ اس کی آنکھیں اس معصوم بچے کی آنکھوں کی طرح چمکتیں، جو صرف چاند کی آرزو ہی نہیں کر رہا ہو بلکہ جسے یقین ہو کہ چاند اس کے ہاتھ بھی آجائے گا۔ یوسف کی آنکھوں میں بھی خواب ہوتے مگر اس کی آنکھوں میں حریصانہ شیطنت چمکتی..... اس عیار بوڑھے کی طرح، جس نے معصوم بچے کو چاند فروخت کرنے کا فیصلہ کر لیا ہو۔ وہ اس سرزمین کی باتیں سنتا، جہاں لوگ اب بھی طویل عرصے پاتے ہیں۔ وہ اس نوجوان کو دیکھتا، جس کی عمر ۴۱ سال تھی، جس کے اجداد نعتائل قبیلے سے تعلق رکھتے تھے، جس نے اس حیات آفرین سرزمین پر کبھی قدم بھی نہیں رکھا تھا مگر پھر بھی اپنی عمر سے آدھا نظر آتا تھا۔ وہ اسے بڑی چاہت اور محبت سے دیکھتا۔ وہ ادھیڑ عمر لاکا ابدی زندگی کے نسخے کی حیثیت رکھتا تھا، جسے بہ آسانی ملک کی متول ترین خاتون کے ہاتھ بیچا جاسکتا تھا۔

تین دن بعد اس نے ٹیلرنگ شاپ جا کر سوٹ کی ٹرائی دی۔ ٹیلر ماسٹر نے ایک ہفتے بعد سوٹ دینے کا وعدہ کر لیا۔ وہاں سے نکل کر وہ پرنٹنگ پریس گیا اور ڈیلیوری پیکٹ لے کر نکل آیا۔ ہوٹل واپس آکر اس نے بین آنزک کو بتایا کہ وہ ایک ہفتے کے لیے شہر سے باہر جا رہا ہے۔ اس نے بین آنزک کو کچھ رقم دی اور کمرے تک محدود رہنے کی سختی سے ہدایت کی اور ایک بریف کیس میں دو جوڑے کپڑے اور ضرورت کا سامان رکھ کر وہاں سے نکل آیا۔

کینٹ اسٹیشن پہنچ کر اس نے لاہور کا ٹکٹ لیا اور ٹرین میں بیٹھ گیا۔ لاہور پہنچ کر اس نے ایک اچھے ہوٹل میں قیام کیا۔ وہاں سے اس نے کراچی کے لیے کال بک کرائی

اور اہم گفتگو کی۔ پھر اس نے ایک مخصوص پتے پر ٹیلی گرام کیا۔ لاہور کے فوراً بعد اس نے راولپنڈی اور پشاور کا رخ کیا۔ وہاں ایک ایک روزہ قیام کے دوران اس نے فون کالر اور ٹیلی گرام والی کارکردگی دہرائی۔ واپسی میں وہ ایک دن فیصل آباد میں رکا۔ وہاں ایک روزہ قیام کے دوران اس نے ہوٹل کے ٹیلی فون آپریٹر کو شیشے میں اتارا۔ جیب گرم ہوئی تو اسے یوسف کی ایک مخصوص تاریخ کے سلسلے میں ہدایات بھی اذہر ہو گئیں۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ وقت کی پابندی کا خیال رکھتے ہوئے اس کی ہدایات پر عمل کرے گا۔ اس طرف سے مطمئن ہو کر یوسف کراچی واپس آگیا۔

اپنے غیاب میں بس اسے ایک ہی دھڑکا لگا رہا تھا کہ ایسا نہ ہو، وہ کراچی پہنچے تو بین آئزک کو غائب پائے۔ بین آئزک کو کمرے میں موجود پاکر وہ پرسکون ہو گیا۔ اگلے دو تین دن میں اس نے باقی کام بھی نمٹا دیے۔ اب وہ منصوبے پر عمل درآمد کے لیے پوری طرح تیار تھا۔

فلیٹ فروخت کرنے کے ٹھیک دو ہفتے بعد وہ جینا میکم کو ایک غیر متوقع ملاقات سے نوازنے کی غرض سے میکم پیلس پہنچ گیا۔ بین آئزک اس کے ساتھ تھا۔

○-----○-----○

یوسف نے میکم پیلس کے لیے نکلنے سے پہلے خود کو پوری طرح تیار کر لیا تھا۔ سرمئی رنگ کے نئے سوٹ میں وہ بہت سچ رہا تھا۔ چم چماتے ہوئے نئے جوتے، نئی قمیص، یہ تمام اہتمام اس کے نزدیک بے حد ضروری تھا۔ وہ پہلے تاثر کی اہمیت سے بخوبی واقف تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اسے یہ بھاری سرمایہ کاری کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس کی خاطر اس نے بے گھر..... بے ڈربہ ہونا قبول کر لیا تھا۔

ایک دکان کے شوکیس کے پاس ٹھہر کر اس نے بظاہر شوکیس کی آرائش کا جائزہ لیا۔ درحقیقت وہ اپنے عکس کو ناقدانہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے سر سے پیر تک اپنے عکس کا معائنہ کیا۔ اس کے ذہن میں ایک ہی لفظ گونجا۔ پرفیکٹ۔ ہر چیز اپنی جگہ درست تھی۔ وہ نہایت حقیقت پسندی کے ساتھ یہ بات کہہ سکتا تھا کہ وہ شریف، معزز اور وجیہ لگ رہا ہے۔ وجیہ تو وہ یوں بھی تھا لیکن شاید لباس کی وجہ سے اس کی وجاہت پر لفتنگ پن کی چھاپ لگ جاتی تھی۔

یہ بات تو وہ بہت اچھی طرح جانتا تھا کہ دنیا میں کہیں بھی غرض مند کو عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ اس کے نزدیک اس میں کوئی قباحت بھی نہیں تھی۔ بشرطیکہ غرض

مند کی غرض پوری کر دی جائے مگر تجربات نے اسے سکھایا تھا کہ غرض مند کو صرف حقارت کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا بلکہ اس کی غرض پوری کرنے کی بجائے اسے ٹر خادیا جاتا ہے۔ یہی اصل اختلافی نکتہ تھا کیونکہ وہ پیدائشی طور پر غرض مند تھا۔ شروع میں اس نے ٹھوکریں کھائیں اور پھر اس نکتے پر ریسرچ شروع کر دی۔ ماحصل اس ریسرچ کا یہ تھا کہ جس شخص سے غرض ہو، خود اس کو کسی نہ کسی طور پر غرض مند ثابت کر دو اور یہ بھی ثابت کر دو کہ اس کی غرض صرف تم ہی پوری کر سکتے ہو، اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو اپنے غرض مند وجود پر وقار کی چادر ڈال کر اسے چھپا دو۔ یہ بہت ضروری ہے۔ اس نے دیکھا تھا کہ یہ تدبیر بڑی حد تک کارگر ثابت ہوتی ہے۔ اس بار البتہ معاملہ بہت اہم تھا۔ اس نے غرض مند وجود پر صرف وقار کا لبادہ نہیں ڈالا تھا بلکہ اسے خوش لباسی کی ڈھال بھی فراہم کر دی تھی۔ یہ بات مسلمہ تھی کہ خوب صورت وال پیپر کے پیچھے چھپی بوسیدہ دیوار کسی کو نظر نہیں آتی۔

بین آئزک کے لیے اس اہتمام کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ چنانچہ وہ عام سے لباس میں تھا۔ یہ الگ بات کہ وہ عام سالباں بھی اس کی خوب روٹی اور وجاہت کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ اس کے انداز میں ایک بے ساختہ وقار تھا جو اس کی فطری بے پروائی سے جھلک رہا تھا۔ وہ بغیر کوئی سوال کئے خاموشی سے یوسف کے ساتھ چل دیا تھا۔

یوسف اس وقت خود کو ایک مداری محسوس کر رہا تھا جو ایک تربیت یافتہ بندر کو ساتھ لے کر شہنشاہ وقت کے حضور ایک بالکل نیا کرتب دکھانے جا رہا ہو۔ فرق صرف اتنا تھا کہ مداری اتنا خوف زدہ اور اعتماد سے محروم نہیں ہو سکتا جتنا وہ خود تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کا بندر کوئی عام بندر نہیں تھا۔ وہ بے حد ذہین بھی تھا، بولنا بھی جانتا تھا اور غلط دھج کے مخدوش نظریات پر غور بھی کرتا تھا۔

بہر حال، اب تو وہ اوکھلی میں سردے ہی چکا تھا۔ اب دھماکے سے ڈرنے سے کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ اتنی بھاری سرمایہ کاری کے بعد پیچھے ہٹنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا اور پھر قسمت اس کے ساتھ تھی۔ اس کی علامتیں تو وہ مسلسل دیکھتا رہا تھا۔

اس نے میکم پیلس میں داخلے اور جینا میکم سے ملاقات کو یقینی بنانے کے لیے مکڑی کی طرح جالا بنا تھا۔ لاہور، راولپنڈی اور پشاور سے میکم پیلس فون کالر کی تھیں کہ کیا مسٹر جوزف ڈیوڈسن سے بات ہو سکتی ہے۔ اسے بتایا گیا کہ یہ رانگ نمبر ہے، یہاں جوزف ڈیوڈسن نام کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی..... اس نے جواب میں کہا کہ مسٹر جوزف

سیکرٹری نے یہاں کا نمبر دے دیا ہو گا۔ وہ جانتی تھی کہ میں یہاں آنے والا ہوں۔ بہر حال اس غیر ضروری زحمت پر میں معذرت خواہ ہوں۔“

”کھال کرنے والے نے آپ کے لیے پیغام چھوڑا تھا اور ایک فون نمبر اس درخواست کے ساتھ کہ آپ اس پر کال کر لیں“ ملازم نے بتایا۔

یوسف نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر نظر ڈالی ”اطلاع دینے کا شکریہ۔“ اس نے نہایت خوش خلقی سے کہا ”لیکن میں پہلے مس ڈیٹان سے ملنا پسند کروں گا“ جوابی کال بعد میں کر لوں گا۔“

ملازم نے چاندی کی طشتری پر اس کا وزنگ کارڈ رکھا اور اندر چلا گیا۔

اس گفتگو کے دوران بین آنزک، یوسف کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اس وقت اس کے سامنے ایک بالکل مختلف آدمی بیٹھا تھا۔ دو ہفتے کی قہرت نے اس کے شخصی تضاد اور فرق کو مزید نمایاں کر دیا تھا۔ وہ حیرت سے سوچ رہا تھا کہ کیا یہ وہی آدمی ہے جس کے ساتھ وہ دو ہفتے سے رہ رہا ہے۔ یہ لہجہ، یہ پروقار انداز، یہ طور طریقے، جو صرف بڑے لوگوں میں ہوتے ہیں۔ بین آنزک کے لیے شخصیت کی اتنی بڑی تبدیلی بے حد حیرت انگیز بلکہ ناقابل یقین تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ یوسف کے لیے یہ لہجہ، یہ انداز اور یہ طور طریقے، یہ سب کچھ محض ایک لباس کی طرح ہے جسے کسی بھی وقت پہنا جاسکتا ہے اور کسی بھی وقت اتارا جاسکتا ہے۔..... حسب ضرورت!

”تم بہت عیار ہو“ بین آنزک نے ستائشی لہجے میں کہا ”لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ تم سے ملنے سے انکار کر دے۔ اس صورت میں تم کیا کرو گے؟“

”وہ انکار نہیں کرے گی“ یوسف نے بے حد یقین سے کہا ”تم دیکھ نہیں رہے ہو“ میں نے یہاں سب کو پہلے ہی سے بری طرح الجھا دیا ہے۔ ایسا کنفیوژن پھیلا دیا ہے جیسے یہ ملاقات طے ہو۔ میں نے اپنی شناخت بھی ڈیولپ کر لی ہے۔ اب میں یہاں جانا پہچانا ہوں۔ ظاہر ہے، اپائنٹ منٹ ڈائری میں کہیں میرا نام نہیں ہو گا مگر میری تیار کردہ صورت حال میں اسے کسی غلطی پر محمول کیا جائے گا۔ ویسے کیا تم نروس ہو رہے ہو؟“

”نہیں۔ میرے لیے نروس ہونے کی کوئی وجہ ہی نہیں۔“

یوسف نے سر کو اقراری جنبش دی۔ اس کے چہرے پر اور آنکھوں میں بین آنزک کے لیے ستائشی تاثر تھا۔ ”تم بالکل فکر نہ کرو۔ یہ سمجھ لو کہ ہم دشمن کی صفوں میں کھس چکے ہیں اور یہ جو بڑی عمر کی کنواری خواتین ہوتی ہیں نا، میں انہیں بھانے کے

ڈیوڈن کا کہیں پتا نہیں چل رہا۔ چنانچہ کئی اہم کاروباری معاملات ٹھپ پڑے ہیں۔ جوزف ڈیوڈن کی سیکرٹری سے صرف اتنا پتا چل سکا ہے کہ وہ مس جینا میکم کاروباری ملاقات کی غرض سے کراچی گئے ہیں۔ اس پر دوسری طرف سے جواب ملا از کم اس وقت تک تو مسٹر جوزف ڈیوڈن نے میکم پیلس میں قدم رنجہ نہیں فرمایا اس کے بعد اس نے درخواست کی کہ مسٹر ڈیوڈن جیسے ہی میکم پیلس پہنچیں، انہیں کر دیا جائے کہ لاہور سے مسٹر ایکس نے فون کیا تھا۔ راولپنڈی اور پشاور سے کی والی کالز کا انداز بھی کم و بیش یہی تھا۔ اس کے بعد ٹیلی گرامز کا سلسلہ تھا۔ ٹیلی گرام جوزف ڈیوڈن کے نام تھے اور میکم پیلس کے پتے پر بھیجے گئے تھے۔ اس معذرت ساتھ کہ مسٹر ڈیوڈن کے متعلق اس سے زیادہ معلوم نہیں ہو پا رہا ہے کہ وہ میکم پہنچ کر مس جینا میکم سے ملاقات کریں گے۔ اگر وہ ابھی نہ پہنچے ہوں تو ان کی آمد بے حد ضروری نوعیت کے ٹیلی گرام برائے مہربانی انہیں دے دیے جائیں۔ اس یوسف نے میکم پیلس میں اپنے لیے اہمیت کی فضا قائم کرنے کی کوشش کی تھی اور اپنی کوشش میں کامیاب ہو گیا تھا تو یہ بھی یقین تھا کہ اب تک جوزف ڈیوڈن کا نام اجنبی نہیں رہا ہو گا۔

جہاں تک فیصل آباد سے ہوٹل کے ٹیلی فون آپریٹر کی کال کا تعلق تھا، وہ تو فوراً کر سکتا تھا کہ آپریٹر نے آدھا گھنٹا پہلے وہ کال بھی کر دی ہوگی، ہدایات کے عین مطابق کال کرنے کے لیے فرضی جوابی نمبر بھی دے دیا ہو گا۔

ملازم نے انہیں انتظار گاہ میں بٹھایا اور پھر یوسف کے دیے ہوئے نما خوبصورت وزنگ کارڈ کا جائزہ لیا ”مسٹر جوزف ڈیوڈن“ اس نے بہ آواز بلند پڑھا۔ یوسف سے پوچھا۔ ”آپ نے مس میکم ڈی شان سے اپائنٹ منٹ لیا ہے؟“

”نہ لیا ہوتا تو اپنا وقت ضائع کرنے کے لیے یہاں آتا؟“ یوسف نے نرم لہجے کہا ”تم یہ کارڈ مس ڈیٹان کے پاس لے جاؤ۔“

ملازم نے ایک بار پھر کارڈ پر نظر ڈالی اس بار اس کی آنکھوں میں شناسائی کی چہ ابھری ”میں معافی چاہتا ہوں جناب۔ آپ کے لیے تو غالباً ذرا دیر پہلے فیصل آباد۔ ارجنٹ ٹیلی فون کال آئی تھی۔“

یوسف نے اپنی ٹائی کی گرہ درست کرتے ہوئے کہا ”ہاں۔ وہ میری ہی کال ہو گی دراصل میرا شیڈول بری طرح گڑبڑ ہو گیا اور میں مصروف بھی بہت رہا۔ لاہور میں یہ

س نے اپنے عقب میں دروازہ بند کر لیا تھا۔

یوسف کا دل ڈوبنے لگا۔ کمرے کی بیشک ایک بہت بڑا نفسیاتی جال تھی اور اس نے محسوس کیا کہ وہ اس جال میں پھنس گیا ہے۔ اسے عورت کی میز تک پہنچنے کے لیے اصافاصلہ طے کرنا تھا۔ اس بچے کی طرح، جو اپنی کلاس ٹیچر کی طرف بڑھ رہا ہو۔ پہلی بار سے احساس ہوا کہ کمرہ بہت بڑا ہے۔

پھر وہ زیر لب مسکرا دیا۔ وہ جس کھیل کا آغاز کرنے والا تھا، وہ نفسیاتی جنگ ہی کی ہیئت تو رکھتا تھا۔ اس وقت وہ اپنے حریف کے ہوم گراؤنڈ میں تھا اور اسے پہلے ہی رطلے میں اپنی برتری ثابت کرنی تھی۔

اس نے ٹائی کی گرہ درست کی اور بے حد پُر اعتماد انداز میں میز کی طرف بڑھنے لگا۔ اس نے میز تک کا تین چوتھائی فاصلہ طے کیا ہو گا کہ میز کے عقب میں بیٹھی ہوئی ورت نے اپنا نازک کمائی والا چشمہ اتارا اور میز پر اپنے سامنے رکھ دیا۔ پھر اس نے سر ہٹا کر یوسف کو دیکھا۔

یوسف بری طرح ٹھٹھا۔ اس کے قدم جیسے فرش میں گڑ کر رہ گئے۔ اسے ایسا لگا، بے وہ کسی ان دیکھی دیوار سے ٹکرا کر رک گیا ہو۔ پہلے ہی مرحلے میں اسے شکست ہوئی تھی۔ اس کے منصوبے کی بنیادیں لرز کر رہ گئی تھیں۔ اس نے منصوبہ بناتے وقت یہ تپش نظر رکھی تھی کہ اسے پہنچے ہوئے ہونٹوں والی، ادھیڑ عمر، گھٹی ہوئی، محروم محبت، نواری عورت سے نبرد آزما ہونا ہے، جو شادی کے امکان کی ہر حد سے گزر چکی ہوگی۔ وہ اپنی طور پر ایک لڑکی کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔

لڑکی کا قد لگتا ہوا تھا۔ اس کی رنگت چمپئی تھی۔ بھورے بال کئے ہوئے تھے اور اندھوں تک جھول رہے تھے۔ چہرے کے نقوش میں دل کشی اور تیکھا پن تھا۔ آنکھیں فاف نیلی تھیں۔ وہ قیمتی کپڑے کا اسکرٹ اور بلاؤز پہنے ہوئے تھی۔ مجموعی طور پر اس شخصیت میں مشرق و مغرب کا حسین امتزاج تھا۔

یوسف دہل کر رہ گیا۔ وہ حسین لڑکی کسی مقبرے میں نمونہ پانے والے ادھ کھلے لالاب کی طرح تھی۔ میکم پیلس کے حوالے سے! اس میں حد درجہ نوانیت تھی۔ لڑکی طرف آنکھوں سے بے پناہ ذہانت جھلک رہی تھی۔ جڑے کی ساخت خوب دورتی اور مضبوطی کی مظہر تھی۔ البتہ ہونٹوں کی بناوٹ کسی کمزوری کی دلیل تھی، جس ماضیات کرنا ممکن نہیں تھا۔

ہنر کا بادشاہ ہوں، اسپیشلسٹ ہوں ان کا۔ یقین کرو، یہ مس ذیشان میرے سحر سے نہیں سکے گی۔ جینا میکم بعد کی بات ہے۔“

ملازم دوبارہ انتظار گاہ میں آیا۔ ”مس ذیشان کو یاد نہیں کہ انہوں نے آپ ملاقات کا وقت دیا ہے۔“ اس نے یوسف سے کہا ”لیکن ان کا کہنا ہے کہ وہ آپ کے آنے والے کئی بیانات ریویو کر چکی ہیں۔ تاہم، کیونکہ آپ یہاں تشریف لے آئے ہر لہذا وہ آپ سے ملیں گی۔ میرے ساتھ تشریف لے چلے۔“ اس نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

”ٹھیک ہے۔“ یوسف نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”بن اسحاق! تم یہیں بیٹھو۔ ضرور پڑی تو میں تمہیں بلوا لوں گا۔“ یہ کہہ کر وہ ملازم کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ قالین اس قدر دبیز تھے کہ قدموں کی چاپ ابھرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یوسف کو وہ سب کچھ بے حد اچھا لگ رہا تھا۔ وہ خوش ذوق تھا۔ اسے خوب صورتی سے عشق تھا۔ وہ ایسے ہی ماحول میں رہنا چاہتا تھا۔ وہ میکم پیلس کی آرائش کو دل ہی دل میں سراہ رہا تھا حالانکہ اس وقت وہ ذہنی طور پر خوف اور احساس فتح مندی کے درمیان معلق تھا۔ وہاں ہر طرف خاموشی تھی، رومان انگیز نیم تاریکی تھی، وہ ماحول تھا، جسے سرمئی اجالا یا چمپی اندھیرا کہنے کو جی چاہے۔ بل کھاتے ہوئے زینے بے حد کشادہ تھے اور ان پر دبیز، خوش رنگ قالین بچھے ہوئے تھے۔ نیم روشن راہ داری میں بڑے بڑے کمرے تھے۔ ناکافی روشنی کے باوجود کمروں کی آرائش اور خوب صورت فرنیچر حسن اور امارت کا بھرپور تاثر چھوڑ رہا تھا۔ کبھی کبھی، کہیں دور سے ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز سنائی دیتی اور گانچ جیسی خاموشی ٹوٹ جاتی۔

وہ راہداری میں مڑے اور ملازم نے ایک بھاری دودھ مار کھولا اور اسے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ یوسف کمرے میں داخل ہوا اور اس نے کمرے پر ایک تفصیلی نظر ڈالی، جس کے دور افتادہ حصے میں ایک بہت بڑی آفس ٹیبل تھی۔ ٹیبل پر گویا روشنی کا سیلاب سا آیا ہوا تھا۔ میز کے عقب میں ایک عورت سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے کچھ کاغذات تھے۔ اس کی نظرس کاغذات پر جمی ہوئی تھیں۔ میز پر کئی ٹیلی فون تھے۔ ان کے علاوہ ایک ڈیکٹیشن مشین بھی تھی۔ کمرے کے دوسری طرف ایک بڑی کانفرنس ٹیبل تھی، جس کے گرد کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔

”مس! مسٹر جوزف ڈیوڈسن“ ملازم نے اعلان کیا اور پلٹ کر کمرے سے نکل گیا۔

جنگ میں گر گیا تھا۔ کتنی نو تک پہنچی تھی۔ یہ بھی درست ہے لیکن اب میں اٹھ کر  
لڑا ہوا ہوں۔ اسکول اور کالج لائف میں پاکستان کے مقابلوں کے دوران ایسا اکثر ہوتا  
ہے لیکن بے بی، نو تک کتنی کے بعد جب میں کھڑا ہوتا ہوں تو اصل جنگ کا آغاز ہوتا  
ہے اور میں چیپٹن رہا ہوں لڑکی..... اب بھی ہوں۔“

لڑکی نے نظریں جھکا کر اس کے وزنگ کارڈ کو دیکھا، جو اس کے سامنے میز پر رکھا  
تھا۔ پھر اس نے نظریں اٹھائیں۔ خاموشی کا طلسم ٹوٹ لڑکی کو اپنی بہتر پوزیشن کا اندازہ  
لے چنانچہ اس نے جارحانہ انداز اختیار کیا ”مسٹر ڈیوڈسن! آپ کیا چاہتے ہیں؟“ اس نے  
پنے وزنگ کی الجھن محسوس کر لی تھی اور اس سے لطف اندوز بھی ہو رہی تھی۔ اس کے  
دل میں وہ اس کا مستحق بھی تھا۔ وہ اس پر بھی خوش تھی کہ اس نے اس ناخواندہ مہمان  
انہی کی بیرونی تہ کو اکھاڑ پھینکا ہے۔ ویسے بھی اسے زندگی میں اس طرح کی فتوحات  
ضرورت رہتی تھی۔ وہ ایک ایسی لڑکی تھی، جس نے زندگی کے دوراہے پر ایک بے  
اہم فیصلہ کیا تھا..... بلکہ اسے فیصلہ کرنا پڑا تھا، اور یہ احساس اسے اب تک ستاتا تھا  
۔ اس کا فیصلہ جرات مندانہ نہیں تھا۔ فیصلہ کرتے وقت وہ باحوصلہ ثابت نہیں ہوئی  
تھا۔

اس کی زندگی جدوجہد میں گزری تو نہیں تھی مگر اس نے ابتدائی زندگی میں  
جدوجہد دیکھی بہت تھی۔ وہ اپنے باپ کے حوصلہ مندانہ فیصلے کی پیداوار تھی۔ اس نے  
پنے باپ کو زندگی سے لڑتے، معاش کے لیے زبردست جدوجہد کرتے دیکھا تھا جب کہ وہ  
ڈرپٹی باپ کا بیٹا تھا۔ صرف ایک جرات مندانہ فیصلے نے اسے عرش سے اٹھا کر فرش پر  
بٹک دیا تھا۔ پھر اس نے اپنے باپ کو جدوجہد میں مسلسل ناکام ہوتے اور ماں کو صبر  
سے دیکھا تھا۔ ماں باپ کی موت کے بعد فیصلے کا ایک کڑا وقت اس پر بھی آیا تھا.....  
اس نے بڑی بے حوصلگی سے خود کو جینا میلکم کی ساتھی، سیکریٹری کی حیثیت سے اپنی  
امانگوں، خوشیوں اور امکانات سمیت دفن کر دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کے عوض اسے  
نیشنل زندگی اور ابدی خوش حالی ملی تھی اور یہ نوید بھی کہ ایک روز سب کچھ اسی کا  
گہ آخروہ جینا میلکم کی بھتیجی تھی، واحد رشتے دار۔ اس کے لیے اس نے راحیلہ ڈیٹان  
راہیلہ میلکم ڈیٹان بنا قبول کر لیا تھا، اگر صرف راحیلہ میلکم بننے کا حکم دیا جاتا تو وہ  
بھی قبول کر لیتی۔ اس نے بچپن میں عسرت دیکھی تھی اور اب عمر بھر اس کا سامنا  
کرنا چاہتی تھی۔

اس طلسم کدے سے اس کی نظریں نکلیں تو اس حسین چہرے پر موجود تا  
میں الجھ کر رہ گئیں۔ اس کے ہونٹ سکڑے ہوئے تھے، جیسے وہ بد مزگی کے ناخوش  
احساس سے دوچار ہو۔ اس کی بڑی بڑی نیلی آنکھیں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں  
ان کا تاثر بھی خوش گوار نہیں تھا۔ وہ تیز نگاہیں تھیں، وجود میں اتر کر دور گہرائی تک  
لینے کی اہل نگاہیں۔ ان میں اس کے لئے تسخیر بھی تھا اور غصہ بھی، جیسے اس نے  
نظر میں اسے ناپسند کر دیا ہو۔

وہ حیران، ساکت کھڑے رہ جانے کا ایک لمحہ تھا..... صرف ایک لمحہ۔ اس  
میں یوسف نے اپنے وجود میں برہمی اور ناپسندیدگی کی ایک تند لہر اٹھتی محسوس کی.....  
اس لڑکی کے لیے، جس نے ایک لمحے میں اس کے بہروپ کے نیچے اتر کر حقیقت  
تھی جبکہ اس نے بڑی محنت اور توجہ سے وہ روپ دھارا تھا۔ اسے یقین تھا کہ لڑکی  
اس کی اصلیت بھانپ لی ہے، اس کے عزائم کی بوسنگھ لی ہے اور اب وہ اس کے  
میں مداخلت کے لیے جو کس ملے گی۔ وہ اس کے عزائم اور ان کی نوعیت سے بے خبر  
مگر یہ سمجھ چکی ہے کہ وہ اچھے نہیں ہیں۔

یوسف کو اپنے ساتھ شدید زیادتی کا احساس ہوا۔ اس نے ایک بے جا  
کاروباری مسٹر جوزف ڈیوڈسن کا روپ دھارا تھا، زندگی میں پہلی بار خود کو اہم ثابت  
کی کوشش کی تھی اور لڑکی نے ایک ہی لمحے میں اس کے چہرے سے اہمیت کی وہ  
کھینچ لی تھی۔ اب وہ پھر سے سڑکیں ٹاپنے والا، اسکیمیں سوچنے والا یوسف تھا، جسے  
نام کے آگے لگانے کے لئے کوئی حقیقی ولایت میسر نہیں تھی..... غیر اہم یوسف!  
کی دنیا میں کسی کو ضرورت نہیں تھی۔ ذہین اور زیست کرنے کے ہنر سے واقف  
پاتھ پر چلنے والا یوسف، جسے ضروریات زندگی کے حصول کے لیے تماشے کرنے  
تھے۔ اسے ایسا لگا، جیسے اس کے بدن پر سے وہ نیا سوٹ اتر گیا ہے، جو اس نے بدن  
سے اپنے لیے سلوا لیا تھا۔

اس عرصے میں، جب لڑکی کی مسکور کن شخصیت نے اسے گھما کر رکھ دیا تھا،  
ایسا لگ رہا تھا، جیسے وہ کسی تیز رفتار ہنڈولے میں بیٹھا ہے اور اسے دنیا کی ہر چیز  
نظر آرہی ہے۔ اس نے خود کو سنبھالنے کی، اپنی قوتیں مجتمع کرنے کی بھرپور کوشش  
اس نے دل ہی دل میں لڑکی سے کہا ٹھیک ہے لڑکی، تم نے مجھے پکرا دیا ہے، یہ  
درست ہے مگر یقین کرو، زیادہ دیر نہیں لگے گی، میں بھی تمہیں اسی طرح حیران کروا



تھا کہ یہ پیش کش قبول کر کے وہ اپنی نسوانیت سے دست بردار ہو رہی ہے۔ جینا کی زندگی میں اس کی شادی کا کوئی امکان نہیں ہوگا لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ صنفِ نازک کی حیثیت سے بقا کی جنگ لڑنا اس کے لیے بہت زیادہ دشوار ہوگا۔ چنانچہ اس نے جان بوجھ کر وہ منگنا سودا کر لیا۔ اس نے پُر تعیش زندگی کے عوض نسوانی امتگیں اور چھوٹی چھوٹی غیر اہم خوشیاں جو محرومی کے بعد بہت بڑی اور بہت اہم لگتی ہیں، بیچ دیں۔

اس وقت اس اجنبی مرد کا سامنا کرتے ہوئے وہ خود کو یہی یاد دلا رہی تھی، یہی یاد دلا رہی تھی کہ اس کی کوشش کر رہی تھی کہ اسے اپنے فیصلے پر کوئی پچھتاوا محسوس نہیں ہوتا۔ وہ پُر تحفظ، پُر تعیش زندگی گزار رہی تھی۔ تاہم اسے احساس بھی نہیں تھا کہ وہ اپنی محرومیوں اور اپنے غلط فیصلوں کا انتقام ان بد قسمت غرض مندوں سے لیتی ہے، جو کسی امید پر، کبھی دھوکا دے کر کوئی فائدہ حاصل کرنے کے لیے جینا میکلم کے دروازے پر آکھڑے ہوتے ہیں۔ اسے علم نہیں تھا کہ غیر شعوری طور پر اس نے طے کر لیا ہے کہ اپنے جیسی کسی قربانی کے بغیر کسی ضرورت مند کو جینا میکلم سے فیض نہیں پانے دے گی۔ وہ جینا میکلم کے فیض کدے کے دربان کی حیثیت رکھتی تھی۔

دوسری طرف یوسف کے ذہن میں بھی یہی خیال گردش کر رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جینا میکلم کو اس سے بہتر دربان نہیں مل سکتا تھا۔ وہ سوچتا بھی رہا اور خود کو اس جھٹکے سے سنبھالنے کی کوشش بھی کرتا رہا۔ جو لوگ درحقیقت جینا میکلم سے باضابطہ طور پر کسی کاروباری سلسلے میں ملنے آتے ہوں گے، وہ بھی راحیلہ میکلم ذیشان کے حضور خود کو بے بس محسوس کرتے ہوں گے۔ اسے اس بات کا کامل یقین تھا۔ پھر اس نے سوچا کہ جب دربان کا یہ حال ہے تو صاحبِ دربار کیسا ہوگا۔ اس کے سامنے لب کشائی آسان تو نہیں ہو سکتی۔ کجایہ کہ ایک ناموجود شے فروخت کرنا.....

اس نے ایک نظر میں دیکھ لیا کہ راحیلہ صرف ذہن ہی نہیں ہے بلکہ نسوانیت، جبلت اور وجدان کے خوف ناک ہتھیاروں سے بھی پوری طرح لیس ہے۔ اس کے علاوہ اس میں اضافی خوبیاں بھی ہیں۔ وہ کسی بھی مرد کو ہوش و حواس سے بیگانہ کر سکتی ہے..... اس کی قوتِ ارادی کو کم زور کر سکتی ہے، اس کی خود اعتمادی کو تباہ کر سکتی ہے۔ صرف اپنے خداداد حسن کے زور پر۔ اس کی پیلیج کرتی ہوئی آنکھوں میں، کہیں کمرائی میں دبی ہوئی، کچلی ہوئی فطری خواہشات نظر آتی ہیں، جو اسے یقینی طور پر مردوں کو ذہنی اذیت پہنچانے پر مجبور کرتی ہوں گی۔ اس کا ترشا ہوا حسین جسم چھوئے بغیر ہی پتھر کی

ماں باپ کی موت کے بعد پھوپھی کے سوا اس کا کوئی نہیں رہا تھا چنانچہ پھوپھی اسے اپنی شفقت کے نہیں، دولت کے سائے میں لے لیا۔ اسے یہ علم نہیں تھا کہ اس میں کچھ غیر معمولی صفات دیکھی ہیں..... ایسی صفات جو اس کے لیے فائدہ مند ہیں۔ ان میں ایک صفت وفاداری بھی تھی، جو جینا کے نزدیک عقدا تھی۔ اس کے وہ ایک ایسی چیز تھی، جسے صرف پیسے سے خریداجا سکتا تھا، جو بلا قیمت کہیں نہیں مل سکتی۔ لیکن اس نے فوراً ہی بھانپ لیا کہ اس کے بے وقوف مگر محبت کرنے والے بد نصیب کی اکلوتی بچی میں یہ صفت بدرجہ اتم موجود ہے۔ دوسری صفت جو اسے اچھی راحیلہ کی غربت سے نفرت تھی اور وہ غربت سے خوف زدہ بھی رہتی تھی۔

جینا میکلم نے زندگی میں جو کچھ بھی چاہا تھا، خرید لیا تھا مگر وہ وفاداری اور نہیں خرید سکی تھی۔ خادماؤں کی کمی نہیں تھی، جو اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتے لیکن اسے وہ بے لوث محبت اور خدمت گزاری کبھی میسر نہیں آئی تھی، جس کے صرف محبت اور وفا سے پھونٹے ہیں۔ اس نے محسوس کر لیا کہ اس کی زندگی کا راحیلہ ہی پُر کر سکتی ہے اور پھر راحیلہ اس کی سگی بھتیجی تھی..... اس کے خون۔ پھر بھی کاروبار، کاروبار ہوتا ہے۔ جینا نے بھانپ لیا تھا کہ قسمت نے اسے موقع فراہم کیا ہے۔ وہ اس بچی کو تاحیات اپنے ساتھ رکھ سکتی ہے، سونے کی زنجیر باندھ کر اور وہ ہمیشہ اس کے ساتھ رہے گی۔ ایک جاں نثار، ساتھی، ایک دوست محبت کرنے والی، ہستی کی حیثیت سے، سودا ہرگز منگنا نہیں تھا۔

لیکن کاروباری جینا نے تمام تر اعتماد کے باوجود وفاداری اور محبت کو ناقابلِ بنانے کے لئے ہر حربہ آزمایا۔ اس نے قدم قدم پر راحیلہ کو پہلے عدم تحفظ کا احساس اور پھر ثابت کیا کہ یہ تحفظ اسے صرف وہی فراہم کر سکتی ہے۔

جینا نے راحیلہ کے سامنے دو راستے رکھے تھے۔ ایک تو تحفظ کا راستہ تھا، کی قربت سے مشروط تھا۔ وہ قبول نہ کرنے کی صورت میں جینا نے راحیلہ کو پیش کر کے اس کی بھتیجی ہونے کے ناتے یہ اس کا فرض ہے کہ وہ راحیلہ کو تعلیم حاصل کر موقع دے، جہاں تک راحیلہ چاہے لیکن اس کے بعد راحیلہ کو اپنے طور پر زندگی ہوگی۔

راحیلہ نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے پہلی پیش کش قبول کر لی تھی۔ اس نے دیکھا تھا اور جان لیا تھا کہ اپنے طور پر زندگی گزارنا بے حد جان لیوا کام ہے۔ اسے



یوسف اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ ”آپ مائٹ نہ کریں تو میں سگریٹ سلگا لوں؟“  
اس نے راحیلہ سے کہا۔

”ضرور۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ راحیلہ نے بے مری سے جواب دیا۔  
یوسف نے سگریٹ نکالی اور بڑی نزاکت اور آہستگی سے اسے سلگایا۔ جلدی کی  
کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے نکتہ نظر سے تو ایک ایک لمحے کی مہلت بہت زیادہ اہم  
نہی۔ ہر لمحہ اس کے لیے خود کو سنبھالنے میں معاون ثابت ہو رہا تھا۔ آخر وہ میدان کا  
انا کھلاڑی تھا۔

”سب سے پہلے تو مجھے یہ اعتراف کرنے دیجئے کہ آپ نے مجھے حیران کر دیا“  
ہاروں شانے چت کر دیا۔ ”اس نے بے حد شائستگی سے کہا۔ ”آپ کے بارے میں میرا  
مور بالکل مختلف تھا۔“

اس نے اپنی دانست میں درست سمت منتخب کی تھی۔ اتنی پرکشش لڑکی کے لیے  
یہ لائن مناسب تھی۔ پھر یہ اس لحاظ سے بھی اہم تھا کہ اس گفتگو پر لڑکی کے رد عمل سے  
اس کے بارے میں سمجھنے میں مدد ملتی اور اپنی پوزیشن کے بارے میں اندازہ لگانا ممکن ہو  
بات۔ لیکن لڑکی کے چہرے دیکھتے ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ اس سے غلطی سرزد ہو گئی ہے۔  
اس نے عجلت سے کام لیا ہے۔ اسے سمجھ لینا چاہئے تھا کہ اس لڑکی کے رو برو آنے والے  
لوگوں کی اکثریت اس کے حسن کی قصیدہ خوانی ہی سے آغاز کلام کرتی ہوگی۔ لڑکی کے تاثر  
سے صاف پتا چل گیا کہ لڑکی کو یہ بات پسند نہیں آئی ہے۔ اگر اس کی کوئی کمزوری تھی تو  
کم از کم یہ ہرگز نہیں تھی۔

یہ بات ان دونوں میں سے کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا تھا کہ تعریف و حسن کی اس  
اپنندگی کا اصل سبب کیا ہے۔ انسان اپنی جس خوبی سے استفادہ نہیں کر سکتا، اس کے  
کرے چڑنے لگتا ہے لیکن ظاہر ہے، یوسف یہ بات سمجھ نہیں سکتا تھا اور راحیلہ اسے  
بھٹانے چاہتی تھی۔

”مجھے اس شاعری سے محفوظ رکھیں مسٹر ڈیوڈسن۔ میں اس معاملے میں بے حد  
ابذوق ہوں۔“ راحیلہ نے سرد لہجے میں کہا۔ تاہم اندر ہی اندر وہ اس تاثر سے محفوظ ہو  
رہی تھی، جو اس کی شخصیت مردوں پر ہمیشہ مرتب کرتی تھی۔ وہ ہمیشہ ہی محفوظ ہوتی تھی  
مگر اس بار اس خط میں برہمی بھی شامل تھی۔ تمام تر شائستگی کے باوجود سامنے بیٹھا ہوا  
جوزف ڈیوڈسن اسے بدتمیز آدمی محسوس ہو رہا تھا۔ اسے وہ شخص ہر اعتبار سے نفی لگا۔

کسی مورتنی کی طرح سرد محسوس ہو رہا تھا، جس کے سامنے کبھی کسی پجاری نے ناز  
پھول جیسے جذبوں کی نذر نہیں گزاری ہوگی۔ وہ اس حسین مندر کی طرح تھی، جسے آپا  
سے دور، بہت دور ہونے کی بنا پر پوجا سے پہلے ہی متروک قرار دے دیا گیا ہو۔ ا  
متروک عمارتوں پر جالے بڑی کثرت سے اترتے ہیں۔ وہاں حشرات الارض خوب بڑ  
پھولتے ہیں۔ کوئی دیا جلانے والا نہ ہو تو سوچ بھی روشنی بانٹتے وقت ایسی عمارتوں کو نا  
انداز کر دیتا ہے۔

یوسف پورے یقین سے کہہ سکتا تھا کہ اس لڑکی کو اس نے مکمل طور پر ناپسند  
ہے۔

بہر حال، راحیلہ کی نظروں نے اس کا جو ظاہری خول توڑ کر اسے جھٹکا پھینچا تھا،  
کے اثرات زائل ہو رہے تھے۔ اسے احساس تھا کہ اسے کچھ مہلت درکار ہے۔ لڑ  
حملہ کر چکی تھی۔ اب اسے نہ صرف اپنا دفاع کرنا تھا بلکہ جوابی حملے کے لیے حکمت  
بھی ترتیب دینی تھی۔ اس کے لیے چند لمحوں کی مہلت درکار تھی۔

”آپ کیسی ہیں مس ڈیشان؟“ اس نے کہا۔ ”اجازت ہو تو میں بیٹھ جاؤں۔“  
”ضرور، ضرور۔ تشریف رکھئے۔“ راحیلہ نے خوش گوار آواز اور سرد لہجے  
کہا۔ وہ اپنے تضادات پر پوری طرح قادر معلوم ہوتی تھی۔ اس نے اپنا چشمہ اٹھایا اور  
لیا۔ شیشے کے ٹاپ والی اس بہت بڑی میز کے عقب میں چشمہ لگانے کے بعد گویا وہ قد  
بند ہو گئی۔ وہ اس کی اپنی مملکت تھی، جہاں اس کی حیثیت ایک مطلق العنان حکمران  
سی تھی۔

اس نے چشمہ لگا کر بے حد طمانیت سے نوادر اجنبی کو بہ غور دیکھا، جو یقینی طور  
کسی نہ کسی انداز کا لٹیرا تھا۔ وہ مطمئن تھی کیونکہ اس نے بے حد کامیابی سے انڈیو  
شروع کرنے سے پہلے ہی ختم کر دیا تھا۔ اب وہ اس کام کے بارے میں سوچ رہی تھی،  
اجنبی لیبرے کی آمد کی وجہ سے ادھورا رہ گیا تھا۔ وہ ذہنی طور پر اس ادھورے کام  
طرف متوجہ ہو گئی۔ اسے یقین تھا کہ اجنبی کا وجود اور عدم وجود برابر ہو چکا ہے۔ وہ  
چارہ اب ہکھلانے اور اپنی نامعقول قسم کی تجویز پیش کرنے کی ناکام کوشش کے سوا کچ  
نہیں کر سکتا۔ البتہ وہ یہ یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ لٹیرا ہونے کا تاثر چھوڑنے والا  
اجنبی کس قسم کا سیزمین ہے اور کیا چیز فروخت کرنا چاہتا ہے۔ بہر حال، چند منٹ بعد  
منہ لٹکائے باہر جاتا نظر آئے گا۔

اس کی شائستگی اور وقار کے نیچے یقیناً بدتمیزی تھی۔ نفیس سوٹ اور ظاہری شخصیت اس کے لفتنگے پن کے لیے لبادے کا کام کر رہی تھی۔ اس کی نسوانی جبلت نے اسے کہ وہ ایک اداکار ہے، جو اس وقت ایک نہایت شریف آدمی کا کردار ادا کر رہا ہے۔ وہ اس حد تک تو یقیناً شریف تھا کہ اسے ایک شریف، شائستہ طبع اور خوش آدمی کا کردار ادا کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہو رہی تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ میں کچھ نہ کچھ اچھائی تھی ضرور.....

”میں نے جو کچھ کہا تھا پوری سچائی سے کہا تھا۔“ یوسف نے کہا ”اس میں کوئی پہلو نہیں تھا۔ البتہ میرے لہجے میں یا لفظوں میں شائستگی کی کمی ہو تو اس لیے میں معذرت خواہ ہوں۔ اس کے علاوہ اس ملاقات کے سلسلے میں جو کنفیوژن ہوا ہے، میں اس کے لیے بھی معذرت خواہ ہوں۔ میرا تاثر یہ تھا کہ میری اور آپ ملاقات طے شدہ ہے۔“

”معذرت کی کوئی ضرورت نہیں۔“ راحیلہ نے خشک لہجے میں کہا۔ ”اب آئی گئے ہیں تو میں آپ کی آمد کا مقصد جانتا چاہوں گی۔“

یوسف کا ذہن بہت تیزی سے سوچ رہا تھا۔ اڑتے ہوئے لمحوں کی دُور باتوں چھوٹی جا رہی تھی۔ بات کس انداز سے کہی جائے۔ میں مس میکم کی خدمت میں منصوبہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے دل ہی دل میں دہرایا۔ یا یہ کہا جائے..... یہ ذہن میں ایک اچھوتا خیال آیا ہے..... اور مجھے یقین ہے کہ مس میکم اس سلسلے جانتا اور سننا پسند کریں گی..... وہ سوچتا اور اندر ہی اندر لرزتا رہا۔ اسے یقین تھا سامنے بیٹھی ہوئی لڑکی اسے آ رہی ہے اور وہ ان تمام ہتھ کندوں سے آگاہ۔ جو اس نے یہاں تک پہنچنے کے لئے آزمائے ہیں۔ اس صورت میں سوال یہ تھا کہ اس نے اسے باہر ہی سے کیوں نہیں بھگا دیا؟

اس ایک لمحے میں اسے میکم پیلس میں گزرنے والی زندگی کا ادراک ہو گیا۔ راحیلہ میکم ڈیٹان ایک راہ داری کی حیثیت رکھتی تھی۔ جینا میکم تک پہنچنے کے لیے شخص کو اس راہ داری سے گزرنا ہوتا تھا۔ یہ ذمے داری بہت بڑی تھی۔ اس کا صلہ نہ کتنا ہی بڑا ہو لیکن ذمے داری کی اہمیت اپنی جگہ تھی۔ راحیلہ کسی غلطی کا خطرہ مان نہیں لے سکتی تھی۔ اگر کوئی شخص جینا میکم سے ملنے آیا ہے تو اس سے ملنا اور اسے جانے دینا راحیلہ کے لیے بے حد ضروری تھا۔ وہ بغیر رکھے ملنے والے کو لوٹانے کا خطرہ مول نہیں

لے سکتی تھی کہ ممکن ہے ملنے والا واقعتاً ملاقات کا مستحق ہو..... اور وہ ملاقات جینا میکم کے مفادات کے لیے اہمیت رکھتی ہو۔ راحیلہ کا کام چھان بھنگ کرنا تھا اور اس کام کے لیے مرکز اور غیر ملک دار جذبہ فاداری کی ضرورت تھی۔ وہ ان دونوں عورتوں کے باہمی تعلق کے بارے میں سوچتا رہا۔ آخر کس چیز نے انہیں ایک دوسرے سے منسلک کر رکھا ہے۔ بہر حال اس نے اس سوال کو مستقبل کے کسی حوالے کے لیے محفوظ کر لیا۔

”مجھے مس جینا میکم سے ملنا ہے“ آخر کار اس نے کہا۔ ”میری درخواست ہے کہ آپ میرا پیغام ان تک پہنچا دیں.....“

”پیغام کی نوعیت بتائیے۔“

اب سوچنے اور بہ غور دیکھنے کا کام راحیلہ کو منتقل ہو گیا تھا۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ شاید کوئی ایسی علامت نظر آجائے جس سے پتا چلے اس کا پہلا تاثر غلط تھا۔ یہ بھی تو ممکن تھا کہ یہ شخص کسی اہم کام سے آیا ہو۔ وہ اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے درمیان خاصا فاصلہ تھا اور وہ سیاہ تھیں۔ وہ ذہین آدمی معلوم ہوتا تھا لیکن بے پردا بھی تھا۔ ٹھوڑی کی بناوٹ بتاتی تھی کہ وہ ضدی ہو گا۔

اسی وقت یوسف نے اس کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ یوسف کو اس تبدیلی کا احساس فوری طور پر ہو گیا، جو لڑکی کے انداز میں بہت آہستہ آہستہ مگر یقینی طور پر رونما ہو رہی تھی۔ دوسری طرف راحیلہ دیکھ رہی تھی کہ وہ ابتدائی جھٹکے سے سنبھل رہا ہے اور اب اس کے انداز میں خود اعتمادی نمایاں ہو رہی تھی، جو مردوں کی فطرت کا لازمہ ہوتی ہے۔ اب وہ اسے جن نظروں سے دیکھ رہا تھا، وہ بتاتی تھیں کہ اب وہ اس حسن سے متاثر نہیں ہو گا، جس کے زور پر اب تک وہ مردوں کی خود اعتمادی کو درہم برہم کرتی آئی تھی۔

یوں ان کے درمیان نظروں اور پھر رسمی سے کاروباری جملوں کا تبادلہ ہوا لیکن پہلی بار راحیلہ کو احساس ہوا کہ یہ ایک طرح کی جنگ ہے، جس میں جوزف ڈیوڈسن نامی یہ مرد اس کا حریف ہے۔ ابتدا میں اس نے اسے دفاع پر مجبور کر دیا تھا لیکن اب وہ ایک بلا ہوا آدمی تھا..... اس کے حسن اور اس کے صنفِ نازک سے متعلق ہونے کے احساس سے بے نیاز۔ اب وہ اس سے مرعوب بھی نہیں تھا جبکہ عام طور پر وہاں آنے والے دوسرے مرد اس پہلے جھٹکے سے سنبھل ہی نہیں پاتے تھے۔

اب راحیلہ اس سے ملنے والے کو لوٹانے کا خطرہ مول لیتی تھی۔ وہ خوب رو اور زکشت

”مسٹر ڈیوڈن! مجھے یقین ہے، آپ مجھ سے یہ توقع نہیں کر رہے ہوں گے کہ میں مہمل پیغام مس میکلم کے پاس لے جاؤں گی۔“ اس نے نرم مگر فاتحانہ لہجے میں کہا۔

”جبکہ مجھے یقین ہے، آپ ایسا ضرور کریں گی۔“

راحیلہ نے اپنی پشت کرسی سے نکائی۔ ”میں ایسا کیوں کرنے لگی؟“

”اس لیے کہ میری بات سچ ہونے کا امکان موجود ہے۔“

”مجھے افسوس ہے مسٹر ڈیوڈن! آپ کو اس سے بہتر کوشش کرنی چاہئے۔ ہمیں ہموں سے کوئی دلچسپی نہیں اور ہمارا وقت بے حد قیمتی ہے۔ اگر آپ کے ذہن میں کوئی بی بات ہے، جو آپ کے خیال میں مس میکلم کے لیے اہم ہو سکتی ہے تو وہ مجھے بتائیں۔ فیصلہ کرنا میری ذمہ داری ہے کہ مس میکلم کو زحمت دی جائے یا نہیں۔ آپ کا وجود پیغام بے معنی ہے۔ میں اسے اتنی اہمیت نہیں دے سکتی۔“

یوسف نے دل ہی دل میں کہا، نیلی آنکھوں والی حسینہ، بڑی پُر اعتماد بن رہی ہو لاکہ ہو نہیں۔ میں نے تمہارا ہاتھ گھنٹی کی طرف بڑھتے اور پھر ٹھکٹے دیکھ لیا ہے۔ تم فی محفوظ بھی نہیں، جتنا ظاہر کرتی ہو۔ آخر تم کس چیز سے خوف زدہ ہو؟

بہ آواز بلند اس نے سخت لہجے میں کہا۔ ”مس ڈیشان، اگر وہ بات آپ سے متعلق رہتی تو میں آپ کو بتانے میں کوئی قباحت محسوس نہ کرتا لیکن یہ معاملہ ارجنٹ بھی ہے۔ بے حد نجی نوعیت کا بھی ہے۔ میں اس سلسلے میں جو بھی گفتگو کروں گا، مس میکلم ہی سے کروں گا۔ اس سلسلے میں کسی اور سے کچھ کہنا مس میکلم کی اہانت کے مترادف ہے۔ پمانڈ نہ کیجئے گا۔ میں آپ کو وہ بات نہیں بتا سکتا۔“

”شد، کھیوں کے لیے بہترین چارہ ہوتا ہے لیکن یوسف جانتا تھا کہ کبھی کبھی کھیاں رکے کی بوتل میں بھی پھنس جاتی ہیں۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ شدید غصے کے عالم میں یہ کی کیسی لگتی ہے اور اس نے دیکھ بھی لیا۔“

راحیلہ کے ہونٹ بھینچ گئے۔ جسم اس کمان کی طرح تن گیا، جس سے تیر نکلتے ہی الا ہو اور پہلی بار اس کے چمپنی رخساروں پر حقیقی سرخی کی لہری دوڑ گئی۔ اس کی انگلی فطری طور پر گھنٹی کے بٹن کی طرف بڑھی۔

”مسٹر ڈیوڈن! انٹرویو ختم ہوا۔“ اس نے بے حد سرد لہجے میں کہا۔ ”یہ بات طے ہے کہ میں آپ کا مہمل اور احمقانہ پیغام مس میکلم تک نہیں۔“

”ایسا نہ کریں۔“ یوسف نے جلدی سے کہا۔ ”کیونکہ اس صورت میں آپ کو

تھا۔ اس کی کشش زمانہ قدیم کے غیر ترقی یافتہ، بے رحم آدمی کی سی تھی، جسے کوئی خوف زدہ نہیں کرتی تھی، جو اپنے ہر خوف سے بہ زور بازو لڑتا جانتا تھا۔ راحیلہ بہت پہلے طے کر لیا تھا کہ وہ صنفِ قوی سے کبھی سمجھوتا نہیں کرے گی۔ اسے مرد سے، ’رومانس سے‘، جنسی کشش سے اور محبت سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

یوسف نے اپنی کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے سوچا کہ صورت حال بہتر ہو رہی۔ مہلت حاصل کرنے، بڑھانے اور معاملے کو لٹکائے رکھنے کی کوشش بار آور ثابت ہو رہی تھی۔ وہ پہلی بار اپنی برتری ثابت کر رہا تھا۔ حکمرانی مرد ہی کو زیب دیتی ہے۔

”بات سیدھی سی ہے۔“ یوسف نے کہا۔ ”آپ میرا کارڈ مس جینا میکلم کے پاس لے جائیں اور ان تک میرا یہ پیغام لفظ بہ لفظ پہنچا دیں۔ مجھے یقین ہے کہ میں انہیں چیز فراہم کر سکتا ہوں، جس کی انہیں دنیا کی ہر چیز سے زیادہ خواہش اور طلب ہے۔“

”آپ مذاق کر رہے ہیں مسٹر ڈیوڈن!“

”نہیں مس ڈیشان، میں بے حد سنجیدہ ہوں۔“

اس کی سنجیدگی نے راحیلہ ڈیشان کو دہلا دیا۔ اس کے پاس جینا میکلم سے ملنے، خواہش مند لوگ آتے رہتے تھے اور وہ ملاقات کے لیے عجیب عجیب جواز تراشتے تھے۔ یہ اپروچ بالکل نئی تھی۔ اس سے پہلے کسی نے ایسی کوئی بات نہیں کہی تھی۔ راحیلہ ۱۱ لیے بھی پریشان تھی کہ یوسف کی بات پوری طرح سمجھ میں نہیں آئی تھی اور طرح طرح کے سوالات کی متقاضی تھی۔ آخر اس بات کا مطلب کیا تھا..... جینا کو وہ چیز فراہم کر جس کی طلب اسے دنیا کی ہر چیز سے زیادہ ہے! وہ برسوں سے جینا میکلم کے ساتھ تھی! ذہنی طور پر اس سے بے حد قریب بھی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ جینا کی سب سے بڑی خواہش کیا ہے اور اس کا کیا سبب ہے۔ وہ ضدی اور خود سر تھی۔ اسے اپنی دولت، پیار تھا اور وہ اپنی دولت پر دانت گاڑے ہوئے محکمہ انکم ٹیکس کو ٹھکست دینا چاہتی تھی! اس کے لیے موت کے فرشتے کو ٹھکست دینا لازمی تھا جو عملاً ناممکن تھا۔

تو کیا اس شخص نے، جسے اس نے پہلی نظر میں لیرا قرار دے دیا تھا، جینا میکلم کی کمزوری بھانپ لی ہے؟ وہ اسے خطرناک تو پہلے ہی قرار دے چکی تھی لیکن جینا میکلم سب سے بڑی کمزوری بھانپنے کے بعد تو وہ سو گنا خطرناک ہو گیا تھا۔ پھر اس نے سوچا۔ نہیں ہو سکتا۔ موت ایک ناگزیر حقیقت ہے، جس سے مفر کی کوئی صورت ممکن نہیں زندگی بازاروں میں نہیں ملتی۔ ایسا ہوتا تو قارون آج بھی زندہ ہوتا۔.....

www.pdfbooksfree.pk  
 بچھٹانا پڑے گا۔ مس میکم کو ہٹا چل گیا کہ آپ نے کس اہم اور سنہرے موقعے کو از  
 دروازے سے واپس کر دیا ہے تو وہ آپ کو کبھی معاف نہیں کریں گی۔

اس نے راحیلہ کے چہرے پر زلزلے کا سا تاثر دیکھا۔ اگلے ہی لمحے اس کا چہرہ  
 تاثر ہو گیا لیکن یوسف دیکھ چکا تھا راحیلہ کے گھٹنی کے ٹھن کے قریب موجود ہاتھ  
 لرزش ہے..... پھر اس نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس بار اس میں عجب سی تہ  
 آئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں موجود چہلچہ، برہمی، تسخر، ذہانت اور دور تک دیکھ لینے  
 صلاحیت، ہر چیز دھندلا گئی تھی۔

”مسٹر ڈیوڈسن! مجھے دھمکایا جانا پسند نہیں ہے۔“ اس نے کہا لیکن اس کے  
 میں زور نہیں تھا۔ اس نے گھٹنی کا ٹھن بھی نہیں دیا تھا۔

یوسف کو اپنے وجود میں ایک واضح آواز گونجتی محسوس ہوئی۔ فاتحانہ آواز.....  
 لفظوں سے محروم آواز۔ وہ فتح مندی کے بے پناہ احساس سے سرشار ہو گیا۔ اس نے،  
 دشوار جنگ جیتی تھی اور بڑی شان سے جیتی تھی۔ راحیلہ میکم ڈیٹان، جو شروع میں  
 حد جارح اور ناقابل شکست نظر آئی تھی، اب شکست خوردہ تھی اور اس کا انداز مدافعت  
 تھا۔

وہ انھی اور یوسف کو پہلی بار یاد آیا کہ اس نے جینا میکم کے بارے میں جو رپہ  
 کی تھی، اس میں راحیلہ میکم ڈیٹان کے بارے میں بھی بہت کچھ پتا چلا تھا۔ میکم پلا  
 میں اس کی پوزیشن، اس کی کمزوریاں، اس کی طاقت سب کچھ اسے یاد آگیا۔ اس کی  
 میں آگیا کہ وہ کس چیز سے خوف زدہ ہے۔ سیدھی بات تھی، وہ دنیا میں کسی بھی چیز  
 سے اتنی خوف زدہ نہیں ہو سکتی تھی، جتنا اسے اپنی ملازمت سے محروم ہونے کا خوف  
 تھا۔ جینا میکم بہت کچھ تھی، اس کی ان گنت میشتیں تھیں۔ وہ پھوپھی بھی تھی لیکن سر  
 سے آخر میں۔ اس سے پہلے وہ ایک سخت گیر ماکن تھی!

”ارے نہیں۔“ یوسف نے کہا۔ ایک لمحے کے لیے اسے اندر سے سہمی ہوئی ار  
 لڑکی پر پیار آگیا۔ ”میرا مقصد آپ کو دھمکی دینا ہرگز نہیں تھا۔ میں تو آپ کو معاملے کا  
 نزاکت اور اہمیت کے متعلق سمجھانا چاہتا تھا۔ آپ چاہیں تو میں آپ پر اپنا نکتہ نظر تمام  
 وضاحت کے ساتھ واضح کر دوں۔“

اس کے لمحے کی معقولیت اور دوستانہ انداز نے راحیلہ کو قبولیت کا موقع فراہم  
 دیا۔ اس کے لیے وقتی پسپائی کا راستہ جیسے کھل گیا۔ اب اسے پسپا ہو کر اپنی باتوں کو بچتا

راحیلہ کے لیے یہ دھماکا تھا۔ اس بار وہ خود پر ذرا بھی قابو نہ رکھ سکی۔ اس کی  
 نظریں بے ساختہ پھٹت کی طرف اٹھ گئیں، جہاں یقیناً کوئی آڈیو باکس پوشیدہ ہو گا۔

راحیلہ کی نگاہوں کی اس دغا بازی نے یوسف کے شکوک کی تائید کر دی۔ اسے  
 پہلے ہی شک تھا کہ جینا میکم جیسی عورت اپنے گرد و پیش سے بے خبر رہنا یقیناً پسند نہیں  
 کرے گی۔ اسے اپنے اسٹاف میں سے کسی سے بھی بے خبر رہنا پسند نہیں ہو گا اور اس  
 نے اس سلسلے میں یقیناً کوئی اہتمام کر رکھا ہو گا۔ وہ جب جی چاہے، کسی کی بھی گفتگو سن  
 سکتی ہو گی۔

”میں آپ سے صرف اتنا کہہ رہا ہوں کہ آپ میرا پیغام مس میکم تک پہنچا  
 دیں۔“ اس نے نرم لہجے میں کہا۔ ”اس میں آپ کا کیا جاتا ہے۔ میرے بارے میں آپ  
 کی جو بھی رائے ہے، آپ اس کا اظہار مس میکم کے رو بہ رو بھی کر سکتی ہیں۔ آپ ان  
 سے یہ اپیل بھی کر سکتی ہیں کہ وہ مجھ سے ملاقات نہ کریں۔ اب یہ ان کی مرضی کہ وہ  
 آپ کی بات ماننی ہیں یا اپنے تجسس کی تسکین کے لیے مجھ سے ملاقات کا فیصلہ کرتی ہیں۔  
 دونوں صورتوں میں آپ بری الذمہ ہو جائیں گی۔ ذمے داری مس میکم کی اپنی ہو گی  
 کیونکہ فیصلہ ان کا اپنا ہو گا جبکہ آپ مجھے بیس سے رخصت کر دیتی ہیں تو ذمے داری آپ  
 کی ہو گی۔ ممکن ہے اس کے نتیجے میں آپ سب کچھ ہار بیٹھیں۔ مس ڈیٹان..... فیصلہ

یوسف نے..... وہ آپ سے ضرور ملیں گی..... سن کر اپنا اندرونی جوش بانے کی کوشش کی پھر بھی اس کا چہرہ متمنا تھا۔ اس کے لیے یہی بہت کافی تھا۔ اس کا جینا میلم سے ملنا ہی بہت تھا۔ اس کے بعد وہ اسے ہینڈل کر سکتا تھا۔ موضوع بدلنے میں کیا دیر لگتی ہے۔ جب کہ باہر نکالے جانے میں خاصی دیر لگتی ہے۔ اصل اہمیت تو مس میلم سے ملاقات کی تھی۔

پھر بھی وہ خاموش رہا۔ اس کی چھٹی حس اسے سمجھا رہی تھی کہ کام اتنی آسانی سے ہو گیا ہے تو اس میں ضرور کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہے۔ جینا میلم کے اس پیغام میں کہیں نہ کہیں اس کے لیے کوئی جال چھپا تھا۔ اس نے خود کو یاد دلایا کہ جینا میلم جیسے بڑے لوگوں سے معاملہ کرتے وقت ذہن کو وسعت دینا اور اپنی سوچ کو محدود ہونے سے روکنا بہت ضروری ہے۔

پھر اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور اسے راستہ نظر آگیا۔ اس کی سمجھ میں آگیا کہ اسے کیا کرنا چاہئے۔ وہ اپنے وجدان کے اس مشورے پر عمل کرنے کو تیار ہو گیا۔ اس نے کرسی پیچھے دھکیلی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنی ٹانگیں گہرے درخت کی ایسے جیسے جانے کے لیے تیار ہو رہا ہو۔ ”آپ کا بہت بہت شکریہ مس ڈیٹان۔ میرا خیال ہے، میں اپنا موقف یا تو واضح نہیں کر سکا یا مس میلم کو اس سلسلے میں کوئی دلچسپی نہیں۔ بہر حال اب یہاں رکنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اب میں چلتا ہوں۔ آپ بہت مہربان ثابت ہوئیں۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں۔“ اس نے نہایت شستہ انگریزی میں کہا۔

راحیلہ بری طرح چونکی۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ جوزف ڈیوڈسن کا ردِ عمل اس کی توقع کے برعکس تھا بلکہ توقع نہیں، یقین کے برعکس کہنا چاہئے۔ ”تو آپ مس میلم کے اس پیغام کے جواب میں کچھ نہیں کہیں گے؟“ اس نے پوچھا، لہجے میں حیرت تھی۔ ”دیکھئے، مجھے ہنلایا جانا پسند نہیں۔“ یوسف نے سادگی سے کہا۔ ”میں یہاں ایک مقصد کے تحت آیا تھا، جو ناجائز نہیں تھا۔ میں نے راستہ گوئی اور راست عملی کا مظاہرہ کیا۔ میرا کسی کمپنی یا کسی قسم کے کاروبار سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی میں کسی قسم کا کوئی ایجنٹ ہوں۔ اس قسم کے معاملات میں، میں بالکل کورا ہوں اور اس سلسلے میں مس میلم کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ اگر میرے پیغام کا یہی جواب ہے تو یہ معاملہ یہیں ختم سمجھا جائے۔ آئی ایم سوری۔“

یہ کہہ کر وہ پلٹا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا

کرتے ہوئے اپنی پوزیشن کو تہ نظر رکھیں۔ میرا مشورہ ماننے ہی میں آپ کا مفاد ہے، راحیلہ نے اپنا چشمہ اتار کر میز پر رکھ دیا۔ دہلی پتلی لڑکی اب بہت بدل بدل رہی تھی۔ عورت پن رخصت ہو گیا تھا۔ سیکریٹری پیش منظر میں آگئی تھی۔ اس نے جھکا کر سامنے رکھے ہوئے پیڈ اور پنسل پر نظریں جمادیں۔ اب یوسف اس کے چہرہ تاثر نہیں دیکھ سکتا تھا۔

”ٹھیک ہے۔ آپ وہ پیغام لکھوادیں، جو مس میلم تک پہنچانا چاہتے ہیں۔“ اس نے سپاٹ آواز میں کہا۔

یوسف نے اپنا پیغام دہرایا۔ ”مجھے یقین ہے کہ میں ان کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش پوری کرنے میں ان کی مدد کر سکتا ہوں۔“

کمرے میں، پیڈ پر پنسل کے چلنے کی نرم آواز کے سوا خاموشی تھی۔ پھر راحیلہ۔ پیڈ تھما اور ایک چھوٹے دروازے کے ذریعے کمرے سے نکل گئی، جو پہلی نظر میں دیو کی کا حصہ معلوم ہوتا تھا۔ وہ دروازہ اس کی کرسی کے عین پیچھے تھا۔

یوسف خود کو بے حد تھکا تھکا محسوس کر رہا تھا۔ اس نے طویل اعصابی جنگ لڑا تھی اور اب اس کے اثرات ظاہر ہو رہے تھے۔ اب وہ آگے کی سوچ رہا تھا۔ ابھی تو پہلے مرحلے سے گزرا تھا۔ اصل مرحلہ تو اب درپیش تھا۔ اس نے سوچا..... کاڑ دونوں جنگوں کے درمیان وقفہ ہوتا اور سستانے کی مہلت مل جاتی لیکن مہلت بالکل نہیں تھی۔ چنانچہ وہ خود کو یک جا کرنے کی کوشش میں مصروف ہو گیا۔ راحیلہ میلم ڈیٹان کو شکست دینے کا تصور اسے سہارا دے رہا تھا۔

پانچ منٹ بعد دروازہ کھلا اور راحیلہ نمودار ہوئی۔ اس نے یوسف کو اس طرح دیکھا، جیسے پہلی بار دیکھ رہی ہو..... جیسے کچھ دیر پہلے ان کے درمیان کوئی ذہنی معرکہ ہوا ہی نہ ہو۔ اس کے انداز میں بے گانگی تھی اور وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ اب وہ پھر پہلے کی طرح پراعتماد تھی، جینا میلم کی کبھی نہ رکنے والی کاروباری اور ذاتی مشین کا اہم ترین پرزہ! وہ احکامات کی تعمیل کر رہی تھی۔ گویا اپنا فرض پورا کر رہی تھی۔ ذاتی جنگ کی اب کوئی اہمیت نہیں تھی۔

”مس میلم کا کہنا ہے کہ ان دنوں وہ بعض اہم کمپنیاں اور کاروباری ادارے خریدنے میں بہت دلچسپی لے رہی ہیں۔ اگر آپ ان کمپنیوں میں سے کسی کی خریداری کے سلسلے میں اعانت کرنا چاہتے ہیں تو وہ آپ سے ضرور ملیں گی۔“

اور اعصاب جھج رہے تھے۔ ایک ایک قدم اٹھانا دو بھر ہو رہا تھا۔ اب ایک قدم کی دیر نہ تھی۔ کوئی مرحلہ اسے اتنا گراں کبھی نہیں گزرا تھا۔ تاہم وہ بڑے باوقار انداز میں دروازے طرف بڑھتا رہا جو اسے قسمت کا بندھن ہوتا ہوا دروازہ لگ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا اس کے وجدان نے اسے دھوکا دیا ہے؟ کیا اسے جینا میلکم سے مل لینا چاہئے تھا؟ اس نے دروازہ کھولا اور پھر راحیلہ کی طرف مڑا۔ ”تھینک یو ویری میچ ڈیشان۔ گڈ ڈے۔“

دوسری طرف ایک بائبل رکھی تھی۔  
”بیٹھ جاؤ مسٹر ڈیوڈسن!“ اس نے یوسف سے کہا ”راحیلہ! میرے خیال میں تمہاری موجودگی بھی ضروری ہے۔“  
راحیلہ کے ہونٹوں پر ایک موہوم سی مسکراہٹ ابھری اور وہ سیکریٹریل ٹیبل کی طرف بڑھ گئی۔

یوسف اپنا لائحہ عمل طے کرنے لگا۔ مس میلکم نے راحیلہ ڈی شان کو موجود رہنے کی ہدایت دے کر اس کے لیے مسئلہ کھڑا کر دیا تھا۔ اسے توقع تھی کہ وہ جینا میلکم سے تنہائی میں گفتگو کر سکے گا اور اس میں اس کے لیے آسانی بھی تھی لیکن یہاں تو ہر بات اس کی توقع کے خلاف ہو رہی تھی۔ چنانچہ جو کچھ اس نے سوچا تھا، وہ سب دوسری بار درہم برہم ہو گیا۔ جینا میلکم وہ عورت تھی جسے ابدیت کی آرزو تھی۔ ہر آدمی میں کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی معاملے میں ایک بچہ چھپا ہوتا ہے، جو چاند کی طلب کرتا رہتا ہے، یہ جانتے ہوئے بھی کہ چاند اسے نہیں مل سکتا۔ ایسے بڑھے بچے، چاند کی خریداری کے چکر میں بہ آسانی بے وقوف بنائے جاسکتے ہیں۔ جینا میلکم کو ابدیت کے چکر میں پھنسا یا جاسکتا تھا کیونکہ وہ اس کی کمزوری تھی لیکن راحیلہ کی تو یہ کمزوری نہیں تھی۔

پھر جینا میلکم بھی اس کی توقعات کے برعکس ثابت ہوئی تھی۔ طویل زندگی کی خواہش اس کی کمزوری سی لیکن وہ بے وقوف ہرگز نہیں تھی اور نہ ہی عمر نے اس کی ہوش مندی کو کم کیا تھا..... کم از کم بظاہر تو ایسا نہیں تھا۔ وہ دہلی پتلی اور بوڑھی تھی لیکن اس کی شفاف آنکھیں اس کی عمر سے بے نیاز تھیں۔

یوسف کو احساس ہوا کہ جس کام کو وہ آسان سمجھ رہا تھا، وہ اتنا آسان نہیں ہے۔ لیکن وہ مایوس ہونے والوں میں سے نہیں تھا۔

کرسی پر بیٹھنے کے دوران چند لمحوں میں یوسف نے کمرے کا تفصیلی جائزہ لے لیا۔ دائیں دیوار پر جینا کی ماں کا پورٹریٹ آویزاں تھا۔ یہ بات صرف اس لیے کہی جاسکتی تھی کہ پورٹریٹ والی خاتون کی شباهت راحیلہ میلکم ڈی شان میں تھی، جو اسے یقیناً اپنے باپ سے ورثے میں ملی ہوگی۔ راحیلہ کی ماں کی تصویر وہاں موجود ہونے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔

جینا نے اسے جس کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا، وہ اس زاویے سے رکھی تھی کہ اس پر بیٹھنے کے بعد اس کا چہرہ جینا اور راحیلہ دونوں کی نگاہوں کی زد میں رہتا۔

راحیلہ پیڈ ہاتھ میں لیے کھڑی تھی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔  
اب واپسی کا نہ کوئی موقع تھا، نہ جواز۔ اب وہ کمرے سے رخصت ہونے کے۔ کچھ بھی تو نہیں کر سکتا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ قدم باہر نکالتا، ایک آواز نے اسے روک دیا۔ وہ آواز عقب سے آتی محسوس ہوئی تھی۔  
”ایک منٹ فوجوان! میں تم سے بات کرنا چاہتی ہوں۔“

وہ بری طرح چونکا۔ پہلے تو وہ اسے فریب سماعت محسوس ہوا۔ ایسا لگا کہ مایوسی وجہ سے اس کے کان بجے ہیں لیکن پھر اسے احساس ہوا کہ وہ آواز حقیقی تھی اور وہ آواز راحیلہ کی نہیں تھی جب کہ کمرے میں اس کے علاوہ کوئی موجود نہیں تھا۔  
آواز دوبارہ سنائی دی۔ اس بار وہ اوپر سے آتی محسوس ہوئی تھی اور اس کی گور اس کے چاروں طرف تھی۔

”راحیلہ!“  
راحیلہ نے چھت کی طرف دیکھا، جس میں پوشیدہ لاؤڈ اسپیکر نصب تھا۔ ”جی سر میلکم؟“

”مسٹر ڈیوڈسن کو میرے پاس لے آؤ۔ میں ان سے بات کرنا چاہتی ہوں۔“  
”بہت بہتر مس میلکم۔“

کھلک کی آواز سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی کمرے میں گھمبیر خاموشی چھا گئی۔  
راحیلہ نے کہا۔ ”میرے ساتھ تشریف لائیے مسٹر ڈیوڈسن، میں آپ کو مس میلکم کے پاس لے جاؤں گی۔“



وہ ایک جہازی سائز کی میز کے عقب میں بیٹھی تھی۔ میز پر شیشے کا ٹاپ تھا۔ میز کے پیچھے دیوار پر اس کے باپ کا پورٹریٹ آویزاں تھا۔ میز پر ایک ایک جانب ایک گلوب رکھا تھا۔



”اطمینان سے بیٹھو نوجوان!“ جینا نے کہا۔

”جی..... میں ٹھیک ہوں۔“

پھر جینا نے جس انداز میں گفتگو کا آغاز کیا اس نے اس کی شخصیت کو پوری عیاں کر دیا۔ ”مسٹر ڈیوڈسن! راحیلہ یہ فیصلہ کرتی ہے کہ مجھے کس سے ملنا ہے اور سے نہیں ملنا۔ تمہارے بارے میں راحیلہ کی رائے کچھ اچھی نہیں ہے، اس کے بارے میں نے تمہیں ملاقات کا موقع دیا ہے۔“

”میں اس سلسلے میں مس ڈیٹان کو قصور وار نہیں ٹھہراؤں گا۔“ اس نے صاف گوئی سے کہا ”انہوں نے میرے کئی جھوٹ پکڑے ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے راحیلہ دیکھا اور شرارت سے مسکرایا۔ اسے یقین تھا کہ میکلم پبلش میں داخلے کے سلسلے میں اس نے جو ترکیبیں استعمال کی ہیں، راحیلہ نے جینا میکلم کو ان کے بارے میں تفصیل سے دیا ہے۔ اس لحاظ سے اس کے لیے اعتراف کر لینے ہی میں بہتری تھیں۔

راحیلہ کے چہرے پر جھلکنے والی برہی نے اس کے اندازے کی تائید کر دی۔ مگر ہی اس نے جینا میکلم کی آنکھوں میں دلچسپی کی چمک دیکھی۔ بڑی بی محظوظ ہونے صلاحیت سے محروم نہیں ہوئی تھیں۔

”لیکن وہ ترکیبیں میرے لیے ناگزیر تھیں۔“ اس نے مزید کہا۔ ”کیوں کہ آپ سے ملنا چاہتا تھا اور سب سے زیادہ اہمیت اسی بات کی تھی کہ میں کسی طرح آہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاؤں۔“

”ممکن ہے، آپ ٹھیک کہہ رہے ہوں۔“ راحیلہ نے تیز لہجے میں کہا۔ ”آج مجھے فیصل آباد سے کسی ذوالفقار نامی شخص نے فون کیا اور آپ کے لیے..... پیغام اور فون نمبر چھوڑا۔ میں نے اس فون پر رنگ کیا تو پتا چلا کہ وہاں جوزف ڈیوڈسن نام کا کوئی آدمی کبھی نہیں رہا۔ میں آپ کے حوصلے کی داد دیتی ہوں۔ جب میں نے مس میکلم کو جوبلی پیغام آپ تک پہنچایا تو آپ نے بھرپور تاثر دیا کہ آپ واپس جا رہے ہیں.....“

”ہاں، تم بہت اچھے اداکار ثابت ہوئے۔“ جینا میکلم نے شگفتہ لہجے میں کہا۔ ”بہر حال اب تمہیں میرے تجسس کی تسکین کرنی ہے۔ ذرا مجھے یہ تو بتاؤ کہ میری زندگی کی سب سے بڑی اور شدید خواہش کیا ہے؟“

”زندہ رہنا..... موت پر فتح“ یوسف نے بے دھڑک کہا۔

اگر یوسف کو یہ توقع تھی کہ اس جواب پر جینا میکلم کا رد عمل بے حد شدید ہو گا

اسے باہمی ہوئی ہوگی کیونکہ جینا میکلم کا چہرہ بے تاثر رہا۔ وہ چند لمحے ٹٹولنے والی نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی، پھر بولی۔ ”اتفاقانہ بات ہے۔ ہمیشہ تو کوئی بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔“

”یہ سچ ہے لیکن کوئی کسی کو اس امر کی خواہش کرنے سے نہیں روک سکتا۔“

”اور میرے بارے میں تمہارا تاثر یہ ہے کہ میری یہ خواہش ہے؟“

”مس میکلم..... مرنا تو کوئی بھی نہیں چاہتا۔“

اسی وقت ٹین پینل پر روشنی ہوئی۔ جینا میکلم نے ٹیلی فون ریسیور اٹھایا اور چند لمحے دوسری طرف سے کچھ سننے کے بعد بولی، ”شکریہ۔ فی الوقت اس کی ضرورت میں۔“ یہ کہہ کر اس نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ ایک لمحے کے لیے اس کا دھیان نہ آنے کہاں بھٹکا۔ اسے کمرے میں یوسف اور راحیلہ کی موجودگی کا احساس ہی نہیں رہا۔ ردہ مزی اور اس سے مخاطب ہوئی۔ اس بار اس کے لہجے میں کڑھکی اور بے صبری تھی۔ ”مسٹر ڈیوڈسن! تم مجھے صرف یہی بتانا چاہتے تھے؟“

یوسف کو احساس ہو گیا کہ یہاں اسے تیزی سے کام لینا ہو گا کیونکہ زیادہ مہلت ملے گی۔ وہ تو اس پر بھی حیران تھا کہ اس سے انٹرویو لینے والے اس سے کیسے منٹے لگے۔ بہر حال اسے یہ بھی یقین تھا کہ کہیں نہ کہیں اس عورت کی ہمیشہ زندہ رہنے کی خواہش کا ٹریگر موجود ہے۔ بس اس پر انگلی پڑنے کی دیر ہے۔ پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے۔ دشواری صرف اتنی تھی کہ اس کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ انٹرویو ختم ہونے والا ہے۔

”آپ اپنے بارے میں میرا اصل تاثر جاننا چاہتی ہیں مس میکلم؟“

جینا میکلم نے اس بات کا جواب نہیں دیا لیکن اس کے کسی انداز سے یہ بھی ظاہر نہ ہو رہا تھا کہ وہ اسے اس اظہار سے روکنا چاہتی ہے۔

”مجھے یقین ہے کہ آپ موت کے مقابلے میں سختی سے ڈٹی ہوئی ہیں اور ڈٹی رہیں گی۔“

”اچھا؟ تمہیں یہ یقین کیوں ہے مسٹر ڈیوڈسن؟“ جینا میکلم نے پوچھا۔ اس کے لہجے میں دلچسپی بھی تھی اور چیلنج بھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ پوری طرح محظوظ ہونے کے موڈ میں ہے۔ انداز ایسا تھا جیسے وہ دیکھنا چاہ رہی ہو کہ یہ جوزف ڈیوڈسن خود کو کس حد تک قائل ثابت کر سکتا ہے۔

”کیونکہ موت کی صورت میں آپ ہر اس چیز سے محروم ہو جائیں گی، جس کے

لیے جیتی رہی ہیں۔ ہر وہ چیز جس سے آپ کو محبت رہی ہے، آپ سے چھین جائے گی عظیم کاروباری مملکت، جس کی بنیاد آپ کے والد نے رکھی تھی، یہ بھی آپ کے ہاتھ جاتی رہے گی۔“

جینا میکلم نے کوئی جواب نہیں دیا۔..... کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

یوسف کو احساس ہو گیا کہ اب رکنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ داؤ تو کھیل ہی چڑھ چکا تھا۔ ”محکمہ انکم ٹیکس سے آپ کی سرحد جنگ اب بیس برس پر محیط ہے۔ وہ اس ناگزیر نتیجہ سے محروم ہو جائیں گی، بلکہ آپ کا دشمن محکمہ اس دولت کا بہت بڑا حصہ سمیٹ جائے گا۔“

جینا میکلم نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا ”تم اس کی فکر نہ کرو۔ انہیں ایک دھیا نہیں ملے گا۔“ اس کے لہجے میں قطعیت تھی۔

یوسف سوچ میں پڑ گیا کہ پاگل وہ خود ہے یا یہ بوڑھی عورت؟ اس نے ایک وار کیا۔ نسبتاً گمراہ۔ ”جی ہاں، آپ زندہ رہنے کے لیے لڑتی رہیں گی۔ آپ ہار نہیں گی۔ جب آپ چلنے کے قابل نہیں رہیں گی تو آپ گھسٹنے لگیں گی۔ ممکن ہے، آپ سے لگ جائیں اور نوبت یہاں تک پہنچے کہ زندگی صرف آپ کی آنکھوں تک محدود رہ جائے۔ یعنی آپ کے تمام اعضاء مرجائیں سوائے آنکھوں کے۔ آپ سینے میں زخم کی ہلکی سی برائے نام رقی باقی رکھنے کی جدوجہد کرتی رہیں گی لیکن بالآخر..... کار.....“

راحیلہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ ”پلیز میکلم!“ اس نے چیخ کر التجا کی۔ ”اس شخص سے کہیں کہ یہ خاموش ہو جا۔ پلیز..... اسے مزید کچھ نہ کہنے دیں۔“ وہ اپنے آپے میں نہیں تھی۔

جینا میکلم نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر وہ یوسف کی طرف متوجہ ہوئی ”میں جاؤں گی۔“ اس نے پر لطف لہجے میں کہا ”میں یقیناً مرجاؤں گی بشرطیکہ تم نے اپنے وعدے کے مطابق اس سلسلے میں میری مدد نہ کی۔ تمہارا کتنا غالباً یہی ہے کہ تم موت کے چنگل سے بچا سکتی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ مسٹر ڈیوڈسن کہ میں نے زندگی میں سے زیادہ عجب کوئی آدمی نہیں دیکھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تم کیا فروخت کرنا چاہو؟ ابدی حیات کی کوئی گولی، کوئی شہرت، کوئی جزی بوٹی یا کوئی الیکٹرک بیٹ؟ اور یہ

بتاؤ کہ اپنا یہ مشہور زمانہ راز مجھے کس قیمت پر بیچو گے؟“

”کچھ بھی نہیں۔ راز تو آپ کے ہاتھوں میں موجود ہے۔“ یوسف نے جواب دیا۔ پھر وہ اٹھا اور گھوم کر جینا میکلم کی میز کے پہلو میں پہنچا۔ جینا میکلم کی نظریں اسے اپنے وجود میں اتارتی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس نے بائبل اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”آپ کے سوال کا جواب اس میں ہے۔ یہ کوئی پراسرار راز نہیں۔“ اس نے کہا۔

جینا میکلم نے کرسی گھمائی اور اس کا سامنا کیا۔ ”کیا بات کر رہے ہو؟“ اس نے خفگی سے کہا ”تمہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ خدا کی کتاب کیا کہتی ہے؟“ پھر اس نے ۱۹ ویں الوبی گیت کا دسواں مصرعہ بغیر پڑھے دہرایا ”ہمیں جو برس دیئے گئے وہ تین بیسی اور دس ہیں۔“ اس کی آواز بلند تھی اور اس میں وہ کھنک تھی، جو صرف جوانی سے مشروط ہوتی ہے۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کی آواز بڑھاپے کی گرفت سے آزاد ہو گئی ہے۔..... ”اور اگر کسی وجہ سے انہیں بڑھایا گیا تو چار بیسی تک پہنچیں گے لیکن اس کا انجام اذیت اور دکھ ہے۔ اور بالآخر ہمیں اڑ جانا ہے۔“

”جی ہاں!“ یوسف نے کہا ”لیکن یہ سب کچھ ہمیشہ سے تو نہیں ہے۔“

”جینا میکلم نے اسے سخت نگاہوں سے دیکھا۔ ”کیا خرافات بک رہے ہو تم؟“ ”ذرا آغاز زندگی کا باب نکال کر دیکھئے۔“ یوسف نے کہا۔ نہ جانے کیسے اس کی آواز اور لہجے میں اس پادری کا انداز ابھر آیا، جس نے بے خبری میں اسے یہ نکتہ سمجھایا تھا۔ اس نے بائبل کے ورق پلٹے اور مطلوبہ باب نکالنے لگا۔ ”آغاز زندگی کا باب دیکھئے اور اس میں ان لوگوں کا ذکر پڑھے، جنہوں نے طویل عمریں پائیں۔ وہ تین بیسی اور دس برس نہیں بلکہ آٹھ آٹھ، نو سو برس جئے.....“ وہ پڑھ کر سنانے لگا۔

اسے احساس ہو رہا تھا کہ جینا میکلم کی توجہ اس کی طرف نہیں رہی ہے۔ شاید وہ اسے پاگل اور ذہنی تفریح کا ذریعہ سمجھ رہی تھی۔ وہ اس کے خاموش ہونے کا انتظار کرتی رہی اور پھر بولی۔ ”نوجوان..... یہ سب کچھ تو میں بچپن ہی میں پڑھ چکی ہوں۔ یہ بتاؤ اس سے میرے مسئلے کا کیا تعلق ہے؟“

یوسف کو ایسا لگا، جیسے اس کے جسم میں اس روز تقریر کرنے والے پادری کی روح حلول کر گئی ہے۔ وہ ہر بات بھول کر وہ سب کچھ دہراتا رہا، جو اس نے سنا اور پڑھا تھا۔ ”جب ان لوگوں کو اتنی عمریں ملیں تو آپ کو کیوں نہیں.....“

ڈیوڈسن نے پھر روشنی چمکائی۔ البتہ اس بار رنگ مختلف تھا۔ جینا میکلم کی انگلی خود

اعتماد لےجے سمیت۔ ”میں آپ کو آپ کے دشمنوں پر فتح یاب ہونے کا طریقہ بتا رہا ہوں۔ آپ کو وقت سے لڑنے کا راز سمجھا رہا ہوں اور آپ اسے احقانہ گفتگو قرار دے رہی ہیں۔ اپنے کاروباری دماغ کو کام میں لا کر ذرا حساب لگائیں کہ آپ مزید سو سال زندہ رہیں گی تو آپ کی یہ مملکت کتنی وسیع ہو جائے گی؟ سود در سود کے حوالے سے حساب لگائے کہ آپ کی دولت کہاں سے کہاں جا پہنچے گی؟ ان لوگوں کا تصور کیجئے جنہوں نے کئی صدیوں تک زندگی کے پھول سے رس نچوڑا۔ اگر آپ کو بھی اتنی زندگی مل جائے تو آپ جو ایک کاروباری جینس ہیں، کاروباری دنیا میں کیا حشر برپا کریں گی اور پھر یہ بھی سامنے رکھئے کہ دور جدید سے جدید تر ہوتا جائے گا۔“

اسے بغیر دیکھے احساس ہو گیا کہ جینا میکم اس کی باتیں نہیں سن رہی ہے۔ اس نے کن آنکھوں سے اسے دیکھا۔ وہ کانڈ سامنے رکھے بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں پنل تھی اور پنل کانڈ پر بہت تیزی سے تھرک رہی تھی۔

اس لمحے یوسف کو احساس ہوا کہ تمام تر ذہانت، اپنی شخصیت کی سفاکی کے باوجود جینا میکم ایک انسان ہے۔ انسان جس میں کمزوریاں ہوتی ہیں..... جو اپنی خواہشات کا غلام ہوتا ہے اور کوئی کوئی خواہش ایسی ہوتی ہے، جس کے لیے وہ تمام ذہانت، ہوش مندی اور منطق و توجیہ اٹھا کر بلائے طاق رکھ دیتا ہے۔ ایسا ہر انسان کے ساتھ ہوتا ہے۔

اور جینا میکم بھی اپنی تمام تر مضبوطی کے باوجود انسان تھی!

جینا نے تھوڑی دیر میں پورا حساب کر ڈالا۔ پھر اس کی پنل رکی اور نظریں اٹھیں۔ اس بار اس کی آنکھوں میں ایک نئی روشنی تھی۔ اتنی تیز روشنی جو آدمی کے اندر تک چکا چوند کر دیتی ہے۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس نے جنت کی ایک جھلک دیکھ لی ہے..... جیسے وہ مملکتِ افلاک کا جائزہ لے آئی ہے.....

لیکن جیسے ہی اس کی نظریں یوسف سے ملیں، آنکھوں کی اس روشنی پر گویا دھند اتر آئی۔

اس بار یوسف نے اسے بولنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ اس وقت وہ گویا منبر پر کھڑا تھا اور جینا میکم اور راجیلہ میکم ویشان وہ عقیدت مند تھے، جو گزرے زمانوں کی گھن گرج کی بازگشت سننے آئے تھے۔ ”بائبل پر آپ کا ایمان ہے؟“ اس نے چیخ کر پوچھا۔ لہجے میں حکم تھا۔ اس وقت وہ خود بھی اپنے اختیار میں نہیں تھا۔

کار انداز میں حرکت میں آئی اور اس نے ایک بٹن دبا دیا۔ بائیں سمت ایک دروازہ کھلنے کی صورت میں کہیں سے بھی دروازہ نہیں لگتا تھا۔ اس دروازے کے ذریعے جوان آدمی کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں فلیپ میں بندھے ہوئے کانڈا ایک پلندہ تھا۔ اس نے یوسف کی طرف کوئی توجہ نہ دی بلکہ وہ سیدھا جینا کی طرف، اس نے کانڈات جیر سامنے رکھے اور جھک کر سرگوشی میں اس سے کچھ کہا۔

اچانک کھلنے والے دروازے سے یوسف کو دوسری طرف ایک بڑی دفتری کمرہ کی جھلک دکھائی دی، جہاں اچھی خاصی تعداد میں لوگ موجود تھے۔ وہاں کچھ مشینیں تھیں۔ ان میں ٹیلی پرینٹرز بھی تھے اور ٹیلی گرافک آلات بھی۔

وہ حیران رہ گیا۔ جینا میکم کے قریب، اتنے قریب اس کی کاروباری مملکت کاروبار پورے زور و شور سے چل رہا تھا اور اگر وہ دروازہ نہ کھلا ہوتا تو وہ اس بات بے خبر ہی رہتا۔

جوان آدمی اور جینا کے درمیان سرگوشیوں کا تبادلہ ہوا۔ جوان آدمی وقتاً فوقتاً تقبیبی جنبش دیتا رہا۔ پھر اس نے کانڈات سمیٹے اور جس دروازے سے کمرے میں آیا اسی سے رخصت ہو گیا۔

دروازہ بند ہوتے ہی کمرے میں دوبارہ خاموشی کا راج ہو گیا۔ جینا میکم پھر پورے کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔ یہ بات یقینی تھی اب وہ تفریح لے رہی ہے۔

”ہاں تو تو جوان! یہ جو تم احقانہ گفتگو کر رہے ہو، اس کا کیا مطلب ہے؟“ اس یوسف سے کہا اور پھر راجیلہ سے مخاطب ہوئی ”راجیلہ میرا خیال ہے، تم ٹھیک ہی رہی تھیں۔ یہ شخص دیوانہ معلوم ہوتا ہے۔“

اس بات کا یوسف پر ردِ عمل شدید ثابت ہوا۔ اسے دکھ بھی ہوا اور غصہ بھی آ۔ جینا میکم ایک بزنس مشین ثابت ہوئی تھی، جس کے دماغ کا کیکلو لیٹر صرف نفع نقصا کے اعداد و شمار ترتیب دے سکتا تھا جب کہ وہ خود کو ایک فن کار..... تخلیق کار سمجھ کر رہا تھا اور بزنس مشین اس کے تخلیقی ذہن کی فن کارانہ کاوش، اس سو فیصد قابلِ فہم کہانی کو سمجھ ہی نہیں پا رہی تھی۔ اسے بری طرح غصہ آیا کہ آخر وہ یہاں کر کیا ہے..... بھینس کے آگے بن بجا رہا ہے۔

وہ غصہ اس کی آواز میں اتر آیا۔ اس روز تقریر کرنے والے پادری کے پُر

میاں جو نسل در نسل منتقل ہوتی رہیں۔ ان یادوں میں دیوالا بھی خلط ملط ہوئی لیکن یاد رکھئے، دیوالا کی ضرورت ان حقائق کو سمجھانے کے لیے پیش آئی، جنہیں کسی اور طرح واضح نہیں کیا جاسکتا۔ دیوالائی انداز ہی ان کے لیے آسان ترین پیرایہ اظہار تھا۔.....

جینا میکلم اب سنبھل کر بیٹھ گئی تھی اور بڑی توجہ سے اسے سن رہی تھی۔ اس کا سرائیک طرف جھکا ہوا تھا۔ مٹھیاں بچھنچ گئی تھیں مگر اسے اس بات کا احساس ہی نہیں تھا حتیٰ کہ راحیلہ کے ہونٹوں پر چمکی ہوئی تمسخرانہ مسکراہٹ بھی معدوم ہو گئی تھی۔

یوسف اب اپنے ہی حرم میں گرفتار تھا۔ اس کی خود اعتمادی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔

”اس زمانے کے لوگ بہت بڑے تھے۔ ہر اعتبار سے دیو قامت تھے۔ موسیٰ نے بنی اسرائیل کو آسمن کے دیس میں جانے سے منع فرمایا تھا یہ کہہ کر کہ وہاں دیوتے ہیں۔ جانیس.....“

”ان کا اشارہ روحانی طاقت کی طرف تھا۔“ جینا میکلم نے احتجاج کیا۔

یوسف نے سختی سے اسے ٹوک دیا۔ اب اس کی جرات کی کوئی حد نہیں تھی۔ وہ اس وقت ہر خوف سے آزاد تھا۔ ”ایسا نہیں ہے۔ اشارہ بلاؤں کی طرف تھا جو ایک زمانے میں زمین پر آباد تھیں۔ دو سال پہلے میں نے مشرق وسطیٰ میں ایک مقبرے کی کھدائی کرنے والے وفد کے ایک سائنس داں سے انٹرویو کیا تھا۔ کھدائی کے دوران تین انسانی دانت برآمد ہوئے تھے۔ اس نے وہ دانت مجھے دکھائے۔ وہ ہمارے دانتوں سے کم از کم چھ گنا بڑے تھے۔ جڑے کی ہڈی کا ایک ٹکڑا بھی تھا۔ وہ محض ایک ٹکڑا تھا مگر موجودہ انسانی جڑے سے کیس بڑا..... وہ ان دانتوں سے مطابقت رکھتا تھا۔ سائنس داں کا کہنا تھا کہ جس شخص کے وہ دانت ہیں، اس کا قد کم از کم پندرہ فٹ رہا ہوگا۔ اگر آپ زمانہ نسل از تاریخ کے انسان کو دیکھ لیں تو مرتے دم تک اسے نہیں بھول سکتیں۔ بنی اسرائیل آج تک نہیں بھولے۔“ اس نے توقف کیا اور راحیلہ کو دیکھا لیکن وہ اس کے چہرے کے تاثر کو کوئی مفہوم نہ دے سکا۔

”سچائی“ چند لمحے بعد اس نے بہ آواز بلند پکار کہا۔ ”بائبل میں سچائیاں اور حقائق موجود ہیں۔ خدا نے گمراہ انسان کو اس کے گناہوں کی سزا دینے کے لیے طوفان بھیجا۔ اس طوفان کا ارضیاتی ثبوت آج بھی ہمارے مشاہدے کے لیے موجود ہے۔ خدا نے گمراہ انسانوں پر بارشِ سنگ کی، ان کے شہر تباہ و برباد کر دیے۔ وہ معتبہ شر آج بھی کھدائی کے بعد برآمد ہو رہے ہیں..... پتھروں اور ریت کے نیچے دبے ہوئے شہر! ماہرین آثار

”بالکل ہے۔ یہ خداوند کا کلام ہے۔“

”تو آپ اس بات پر بھی یقین رکھتی ہوں گی کہ آدم نے شجر ممنوعہ کا پھل کھایا اور جنت میں شجر زندگی بھی تھا۔ پھر وہ دنیا میں آئے تھے۔ اس زمین پر چلے پھرے تھے۔ ان کی اولاد نے یہاں زندگی گزاری۔ طویل، بے حد طویل زندگی۔ ان میں سے بہت سے تو تقریباً ہزار ہزار سال زندہ رہے۔ انہوں نے اپنی نسل بڑھائی۔ ان کے بیٹے بیٹیاں پانچ پانچ سو سال زندہ رہے۔ یہ سب کچھ اس کتاب میں لکھا ہے۔“

”ہاں، یہ درست ہے۔ کتاب میں یہ بھی لکھا ہے کہ ممنوعہ پھل کھانے کی پاداش میں آدم سے ابدی زندگی چھین لی گئی اور انہیں جنت سے نکال دیا گیا۔“ جینا چند لمحے رک جیسے ذہن پر زور دے کر یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔ پھر وہ بولی ”اور خدا نے کہا اب یہ اپنی معصومیت کھو چکا ہے۔ اب اسے نیکی اور بدی کو اپنے طور پر سمجھنا ہوگا۔ جاؤ اسے زمین پر پھینک آؤ۔ ایسا نہ ہو کہ اب یہ شجر زندگی کی طرف ہاتھ بڑھائے اور اس کا پھل بھی کھالے اور ابدی زندگی کا سزاوار ٹھہرے۔ یوں یہ زمین آباد ہوئی، جنت سے نکالے ہوئے آدم کی نسل نے زمین کو آباد کیا۔“

”اور اس کے باوجود یہ امکان موجود ہے کہ آدم نے شجر زندگی کا پھل کھایا ہوگا۔“

یوسف نے بہت تیزی سے حملہ کیا۔ ”کیوں کہ انہوں نے ۹۳۰ سال کی عمر پائی اور ان کے بیٹے اور ان کے بیٹوں کے بیٹے..... انہوں نے بھی نسلوں تک زندگی کا ذائقہ چکھا۔ وہ سب طویل العمری کے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ پھر وہ زمین پر ہر سمت میں بکھر گئے.....“

”یہ ممکن نہیں۔“ جینا نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”شجر زندگی تو باغ عدن میں تھا۔ جب پہلے آدمی کو نافرمانی کی پاداش میں.....“

”شجر زندگی محض ایک علامت ہے۔“ یوسف نے اسے خاموش کر دیا۔ ”یہ تو استعارہ ہے، زمین پر پائے جانے والے اثمار کا۔“ میں بائبل کا حوالہ تاریخ کی حیثیت سے دے رہا ہوں۔ بائبل بحیثیت تاریخ، یہ ثابت کرتی ہے کہ انسانوں نے روئے زمین پر بہت طویل عمر پائی۔ وہ اس زمین پر کئی کئی صدیاں جئے۔ وہ روایت بن گئے اس لیے کہ ہر باپ نے جدید بھائی یا دیاں اپنے بیٹے کو سونپ دیں۔ ان کا بھگتنا، ان کی گمراہی، خدا کی ان سے ناراضی..... اور پھر ان کی یہ جدوجہد کہ وہ خاک سے اٹھیں اور آسمان تک پہنچیں، روٹھے ہوئے خدا کو منائیں۔ جب یہ سب کچھ لکھا گیا تو ان یادوں کے حوالے سے لکھا

بھری۔ ان کے زاد سفر میں ہر روز استعمال ہونے والی کوئی ایسی چیز ضرور ہوگی، جو انسانی ریڑھی کی زوک تھام کرتی ہوگی، انسان کو موت سے دور رکھتی ہوگی۔ وہ چیز جسے سیلاب نے تباہ کر دیا ہو گا یا وہ کم ہو گئی ہوگی۔ اس کی رفتارِ نمو میں فرق آگیا ہوگا۔ وہ چیز جسے بالآخر بھلا دیا گیا۔“

یوسف نے جینا میکم کو بہت غور سے دیکھا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کی بات کا جینا پر کچھ اثر ہوا ہے یا نہیں۔

پھر اس نے سلسلہ کلام جوڑا۔ ”میں یقین نہیں کر سکتا کہ وہ چیز مکمل طور پر ختم ہو گئی ہوگی۔ مادہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ زمین سے کوئی چیز مکمل طور پر کبھی ختم نہیں ہوئی۔ آٹا، وقت سے اب تک کوئی اضافہ بھی نہیں ہوا۔ سو وہ جو چیز بھی تھی، جو غصہ بھی تھا، اب بھی کہیں نہ کہیں موجود ہے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ اس کی شکل بدل گئی ہو۔ میرا خیال ہے، میں جانتا ہوں کہ اسے دنیا کے کس حصے میں تلاش کرنا چاہیے۔ اگر مجھے اپنی تلاش میں کامیابی ہوئی تو آپ دنیا کی وہ پہلی خاتون ہوں گی، جو ناپید شدہ نسلوں تک کے درمیان زندگی گزار سکیں گی۔ میں ابدی زندگی کا نہیں، غیر معمولی حد تک طویل زندگی کا وعدہ کر رہا ہوں۔“

ایک لمحے کے لیے اسے ایسا لگا جیسے وہ جیت گیا ہے۔ جینا میکم کی نظریں اپنی بھینچی ہوئی مٹھیوں کی طرف بھٹکیں، جو اس کی فٹانہ ہونے والی خواہش کی علامت تھیں لیکن جب اس نے نظریں اٹھائیں تو ثابت ہو گیا کہ وہ اپنی خواہش کے سیلاب میں بہہ نہیں سکی ہے۔ وہ محسوس ہو رہی تھی۔

”کواس!..... نری کواس!“ اس نے تند لہجے میں کہا۔

اسی لمحے کمرے میں راجیلہ کا تسخراہ قفقہ گونجا۔ وہ قفقہ جینا میکم کے تبصرے کی تائید کر رہا تھا۔

جینا نے فاتحانہ نظروں سے یوسف کو دیکھا اور بولی۔ ”خدا نے زمانہ آغاز میں انسان کو طویل عمر اس لیے عطا فرمائی کہ وہ اس کی زمین کو اپنی اولاد سے جلد از جلد بھر دے۔ انہوں نے زیادہ عمریں پائیں تو محض اس لیے کہ اسی میں خدا کی خوشی تھی۔“

یوسف نے اپنی مایوسی پر قابو پانے کی زبردست کوشش کی۔ ساتھ ہی اسے زبردست غصہ بھی آیا۔ مین آنزک نے بھی اسے یہی جواب دیا تھا۔ وہ حیران تھا کہ عقیدہ انسان کو ذہنی طور پر کس قدر غیر منطقی اور سہل پسند بنا دیتا ہے۔ وہ خدا کی حکمتوں پر اس

قدیمہ کی ہر دریافت روایتوں کی تصدیق کرتی ہے۔ ہر روایت، جو اس آسمانی کتاب موجود ہے۔“ اس نے بائبل کو چھوتے ہوئے کہا۔

ڈیسک پیٹل پر پھر روشنی چمکی۔ یوسف کو یقین ہو گیا کہ جو سحر وہ تخلیق کر رہا اب ٹوٹ جائے گا لیکن جینا کی توجہ اس کے ہاتھ کے اشارے اور میز پر رکھی بائبل مرکوز تھی۔ اس نے ایک بٹن دبایا، جو غالباً یہ پیغام تھا کہ اسے ڈسٹرب نہ کیا جائے کہ پیٹل پر نمودار ہونے والی روشنی فوراً ہی بجھ گئی۔ ”ہاں نوجوان! کہتے رہو۔“ اس نے ”ان تمام باتوں سے میرے مسئلے کا کیا تعلق ہے؟“

یوسف نے بڑی صفائی سے گفتگو کی ٹوٹی ہوئی ڈور کا سرا تھا۔ ”پرانے آدمی زندگی کا حساب برسوں میں نہیں، صدیوں میں ہوتا تھا۔ انسانی تاریخ کا اولین ریکارڈ بتاتا ہے، جب کہ زندگی اس سے بھی پہلے جاری و ساری تھی۔ پھر عرصہ حیات بند سکڑنا شروع ہوا۔ طوفانِ نوح کے بعد حضرت نوح اور ان کی اولاد نے زمین کو پھر آباد کیا۔ عرصہ حیات سمٹتا رہا، پانچ سو، چار سو، تین سو اور پھر محض دو سو سال رہا۔ حضرت ابراہیم ۱۷۵ سال جئے۔ ان کے بیٹے حضرت اسحاق نے ۱۸۰ سال کی عمر پر حضرت یعقوب کی عمر وصال کے موقع پر ۱۳۷ سال تھی اور حضرت یوسف جو سرزمین چھوڑ کر مصر چلے گئے تھے، انہوں نے محض ۱۱۰ سال کی عمر میں وفات پائی۔ کے بعد بائبل میں طویل العمری کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں۔ کیوں؟ یہ تبدیلی آئی تو اسے کوئی سبب بھی ہوگا۔ طویل زندگی اور تین بیسی دس برس کی عمر کے درمیان کوئی فاصلہ تو ہوگا.....“

”ٹھیک ہے۔ یہ تو تم ہی بتاؤ گے۔“ جینا نے خشک لہجے میں کہا۔

یوسف نے اپنی آواز دھیمی کر کے ڈرامائی تاثر ابھارا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کا جو دل میں اتر جائے۔ ”جی ہاں..... وہ خط فاصل ہے طوفانِ نوح!“ اس نے تقریباً سرگرمی میں کہا۔ ”طوفان نے پوری زمین کو ڈبو کر رکھ دیا تھا۔“

جینا کی آنکھوں میں دلچسپی کی چمک ابھری مگر اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد یوسف نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”طوفان سے والوں میں حضرت نوح، سام اور حام تھے جو پرانی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے زمینی پھل کھایا تھا، جو طوفان سے پہلے زمین پر موجود تھا۔ ان کے وجود میں طویل العمری بچ نمو پا چکا تھا۔ طوفان کے بعد زمین چالیس دن تک زیر آب رہی اور اس کے

لیکن جب راحیلہ نے جواب دیا تو وہ اس کی ذہانت کو سراہے بغیر نہ رہ سکا.....  
 راحیلہ نے لمحاتی ہچکچاہٹ کے بعد جواب دیا۔ ”میں محسوس کرتی ہوں کہ مسٹر  
 ڈیوڈسن آپ کو جو چیز پیش کر رہے ہیں، اگر آپ کو اس کی خواہش ہے تو آپ وہ اپنے طور  
 پر بھی حاصل کر سکتی ہیں..... ان کے مدد کے بغیر۔“

تاہم اس جواب سے ایک بات کی تصدیق ضرور ہو گئی۔ راحیلہ کی ہچکچاہٹ اور  
 احتیاط ثابت کر رہی تھی کہ جینا میکلم ایک ناممکن سی خواہش کے طلسم میں اس طرح  
 گرفتار ہے کہ خلاف عقل فیصلہ بھی کر سکتی ہے۔ یوسف کے لیے یہ تصدیق ایسی تھی  
 جیسے کسی بے در کمرے میں کوئی دروازہ کھل گیا ہو۔

”تم نے ٹھیک کہا راحیلہ!“ جینا کے لہجے میں اطمینان اور قطعیت تھی۔ ”مسٹر  
 ڈیوڈسن، تم نے تو مجھے کچھ بھی آفر نہیں کیا۔ اگر جو کچھ تم نے کہا، اس میں ذرا بھی  
 صداقت ہے تو وہ بائبل کے حوالے کی وجہ سے ہے۔ اس میں تمہارا کوئی کمال نہیں۔ تم  
 میرے لیے اپنی ضرورت اور اہمیت ثابت نہیں کر سکتے۔“

اب یوسف کے سامنے جینا کا اصل روپ آیا، جس کی بابت طرح طرح کے قصے  
 مشہور تھے۔ اب وہ ایک بے رحم کاروباری عورت کے روپ میں سامنے آئی تھی، جس  
 کے نزدیک ہر گفتگو نفع اور نقصان کے حوالے سے ہونی چاہیے۔ اب وہ ہر چیز کو توٹنے  
 والی جینا تھی، جس کے ضابطہ اخلاق میں بوقت ضرورت لیرا پن بھی کاروباری کا ایک حصہ  
 تھا، جو کسی بھی ایسی جائیداد، صنعت یا آئیڈیے پر قابض ہونا اپنا حق سمجھتی تھی، جسے کوئی  
 قانونی تحفظ حاصل نہ ہو۔ اب جب کہ آئیڈیا اس کے علم میں آچکا تھا، وہ سائنس دانوں  
 اور ماہرین آثار قدیمہ کی ایسی ٹیم تشکیل دے سکتی تھی، جو ہر حیات کی تلاش میں کرۂ  
 ارض کا چپہ چپہ چھان مارے۔ وہ اب اس سلسلے میں سینکڑوں ہزاروں ماہرین کی خدمات  
 حاصل کر سکتی تھی۔ اب اس کے نزدیک یوسف کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔

”آپ کو یہ تو نہیں معلوم کہ آپ کے پاس مہلت کتنی ہے؟“ یوسف نے  
 اعتراض کیا۔

جینا میکلم کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ انٹرویو کا وقت ختم ہوا۔ ”تھینک یو  
 ڈیری مچ مسٹر ڈیوڈسن۔ آئی ایم نٹ انٹرسٹڈ۔“ اس نے سرد لہجے میں کہا۔

”ٹھیک ہے۔ اس صورت میں آپ اس لڑکے سے نہیں مل سکیں گی۔“ یوسف  
 نے تڑپ کا آخری پتا استعمال کیا۔ ”اور اس کے بغیر آپ کامیاب ہو ہی نہیں سکتیں مس

کی دی ہوئی عقل کی مدد سے غور تک نہیں کرتا حالانکہ خدا نے خود فرمایا کہ کائنات کی  
 چیز پر غور کرو لیکن غور کون کرتا ہے۔ لوگ تو کلام خدا میں بھی صرف لفظ پکڑ کر بیٹھ  
 ہیں۔ نہیں جانتے کہ لفظوں کے پیچھے معانی در معانی کا لاتناہی سلسلہ ہے۔

”اور پھر اگر تمہاری بات مان لی جائے.....“ جینا نے تولنے والی نظروں  
 اسے دیکھتے ہوئے کہا ”تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ خیال کسی اور کے ذہن میں  
 نہیں آیا، کسی اور نے اس چیز کی تلاش کیوں نہیں کی؟“

”اس لیے کہ کبھی کسی نے اس انداز میں سوچا ہی نہیں۔“ یوسف نے تندر  
 میں کہا ”آپ اپنی ہی مثال لے لیں۔ آپ بائبل پڑھتی رہی ہیں۔ آپ کو بہت کچھ یاد  
 ہے۔ آپ ذہن بھی ہیں مگر آپ کو یہ خیال کبھی نہیں آیا۔ اس کی وجہ جانتی ہیں آپ  
 صرف اتنی سی بات ہے کہ اسے پڑھتے ہوئے آپ ذہانت کی نہیں، جذبات کی عینک لگا  
 ہیں۔ آپ اس کی معرفت قبول کرتی ہیں۔ جو بات میں نے کہی ہے، ہر شخص پڑھتا ہے،  
 غور کرنے کی زحمت کوئی نہیں کرتا۔ آپ بتائیں..... آپ نے پہلے کبھی اس چیز کو  
 زاویہ نظر سے دیکھا؟“

”ہرگز نہیں۔ یہ زاویہ نظر مہمل اور لغو ہے۔“  
 ”لیکن ممکن ہے اور اسے یکسر مسترد نہیں کیا جاسکے۔“ یوسف نے اصرار کیا۔  
 جینا میکلم کے چہرے پر چیلنج ابھرا۔ اس کی زندگی سے بھرپور آنکھوں میں سرد مہر  
 سی ابھری، جیسے کھڑکیوں پر پردے کھینچ دیے جائیں۔ ”راحیلہ..... تمہارا اس سلسلے میں  
 کیا خیال ہے؟“ اس نے پوچھا۔

اس لمحے راحیلہ میکلم ڈیشان کو دیکھتے ہوئے یوسف کے دل میں اتر م کی ایک لہر  
 اٹھی۔ کیوں کہ لڑکی کی آنکھوں میں اچانک بے پناہ خوف ابھر آیا تھا۔ اسے احساس ہو گیا  
 تھا کہ وہ خطرناک صورت حال سے دو چار کر دی گئی ہے۔ عدم تحفظ اور عدم استحکام کا  
 احساس ابھر آیا تھا۔ اس پر ایک بے حد مشکل فیصلے کی ذمہ داری تھوپ دی گئی تھی۔

یوسف اس کی ذہنی کیفیت پوری طرح سمجھ رہا تھا۔ وہ لڑکی اس محکم سے دو چار  
 تھی، جو جینا میکلم جیسی عورت کے ساتھ گزارا کرنے کے بعد لازمی تھی۔ اس وقت وہ یہ  
 اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھی کہ جینا اس سوال کا کیا جواب سننا چاہتی ہے۔ اسے  
 خدشہ تھا کہ کہیں وہ کوئی مختلف جواب نہ دے دے..... ایسا جواب، جو جینا میکلم کی  
 خواہش سے متصادم ہو۔



”اس سے میرا کیا تعلق ہے؟“

یوسف کچھ اور آگے جھک گیا۔ ”میں نے عرض کیا تاکہ طوفان نوح کے بعد شجر ہدیٰ فراموش کر دیا گیا لیکن پوری طرح نہیں۔ بین آئزک کے اجداد کی تاریخ گواہ ہے کہ ان کا ایک بزرگ بارزی لئی ۵۱۲ء تک زندہ تھا لیکن یہ کسی کو علم نہیں تھا کہ وہ کب رہا ہوا اور اس کی عمر کتنی ہے۔ وہ ان دنوں کی باتیں کرتا تھا جن کے متعلق اس کے قبیلے اے کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ ایک رات طوفانی بارش میں وہ گول گومتا کی پہاڑی پر مل لڑی کر رہا تھا کہ اسے تین مصلوب لاشیں نظر آئیں۔ ان میں سے ایک کے سر پر انٹوں کا تاج تھا۔“

جس دوران وہ بول رہا تھا، جینا میکلم کی شخصیت میں تبدیلی رونما ہوئی تھی۔ تبدیلی وہم سی تھی لیکن اسے بہ آسانی محسوس کیا جاسکتا تھا اور یوسف نے محسوس کر بھی لیا۔ یہ وہ برف کی طرح سرد اور فولاد کی طرح ناقابل شکست عورت نہیں تھی۔

یوسف کو اپنے جسم میں سنسنی دوڑتی محسوس ہوئی۔ اگر دولت بنانے والی یہ مشین قابل شکست قوت ارادی کی مالک، بے رحم حسابی ذہن کی حامل یہ ہستی، جس نے کچھ دیر لے ایک مستحکم اور ممکن اثبوت نظریے کو مسترد کر دیا تھا، اس احمقانہ اور بے بنیاد جھوٹ و قبول کر لیتی ہے تو یہ کتنی بڑی ستم ظریفی ہوگی! یہ تصور ہی اس کے لئے ہیجان انگیز تھا۔ ”یہ لڑکا کون ہے، جس کا تم تذکرہ کر رہے ہو؟“ جینا نے پوچھا۔

”اس کی رگوں میں اس بارزی لئی کا لہو دوڑ رہا ہے، جو مسیح کے مصلوب ہونے کے پانچ سو سال بعد موت سے ہمکنار ہوا۔“

جینا کی آنکھوں میں واضح طور پر طمع کی چمک نظر آئی۔ اس کی قابضانہ فطرت پوری طرح بیدار ہو گئی تھی۔ اس کا حسابی ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں لہندہ ٹھیکوں کی طرح، یوسف کے جھوٹ کو اپنی ٹھٹھی میں دبوچ رہا تھا۔

”لیکن مس میکلم، آپ اسے نہیں خرید سکتیں۔“ یوسف نے بے حد ٹھہرے دئے لہجے میں کہا۔ ”جب وہ مجھے ملا تو بھوکوں مر رہا تھا۔ اس پر میرے احسانات ہیں۔ میرے بغیر وہ آپ کے قابو میں نہیں آئے گا۔“

”اس کی عمر کتنی ہے؟“

”کون جانے! مجھے تو وہ وقت اور عمر سے بے نیاز لگتا ہے۔“

جینا کچھ دیر خاموش بیٹھی رہی اور یوسف سوچتا رہا کہ کیسے اس نے معقولیت کی حد

میکلم..... میں آپ کی انسانوں کو سفاکی کی حد تک استعمال کرنے کی سرشت اور اس شرت سے بہ خوبی آگاہ ہوں۔ کیا آپ کے خیال میں میں بے وقوف ہوں کہ اپنے بچے آپ کے سامنے رکھ دوں گا؟ نہیں خاتون..... میں جانتا ہوں کہ سودے بازی لئے تڑپ کا اپنا پانس چھپا کر رکھنا پڑتا ہے۔“

اسے فوراً ہی احساس ہو گیا کہ وقتی طور پر جینا میکلم پھر اس کی طرف متوجہ ہو رہے۔ اس نے نظریں اٹھا کر یوسف کو بہ غور دیکھا۔ ”کون لڑکا؟“ اس نے پوچھا۔ ”یہ قسم کی گفتگو شروع کر دی تم نے؟“

یوسف ہچکچایا۔ باطنی طور پر اسے افسوس ہونے لگا۔ اب اسے وہ جھوٹ بولنا تھا اس نے جینا میکلم کو پھنسانے کے لیے دو ہفتے پہلے گھڑا تھا۔ اس جھوٹ کے تانے بانے کے سلسلے میں بین آئزک کی مذہبی معلومات نے اس کی بہت مدد کی تھی۔ اس کا توجہ تھا کہ جھوٹ آگے جا کر آدمی کے لئے بہت بڑا خطرہ بنتا ہے..... آسیب کی طرح پچھا کر ہے اور کہیں نہ کہیں اسے چت کر دیتا ہے۔ وہ عملاً اپنی تھیوری کے قابل عمل ہونے امکان ثابت کر چکا تھا۔ اب جینا میکلم کو اسے قبول کر لینا چاہئے تھا۔ ایسی صورت میں کھیل جو وہ کھیل رہا تھا، فن کارانہ ثابت ہوتا۔ اس صورت میں بین آئزک کا وجود کہانی میں ایک غیر ضروری کردار کا سا ہوتا، جسے وہ بڑی بے رحمی سے بغیر ہچکچائے کہا سے خارج کر دیتا..... کسی کامیاب مدیر کی طرح، جو اس نے بہت دیکھے تھے۔

وہ پھر کرسی پر بیٹھ گیا اور آگے کی جانب جھٹکتے ہوئے اس نے جینا میکلم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ پھر اس نے مستحکم لہجے میں ٹھہر ٹھہر کر کہنا شروع کیا۔ ”بین آئزک گیلیلی نے نعتیہ قبیلے سے تعلق رکھتا ہے..... انسانوں کی بے حد قدیم نسل سے۔ اس نسل سے جس کا تذکرہ آسمانی صحیفوں میں موجود ہے۔ وہ برگزیدہ لوگوں کی نسل ہے، جو نے خدا کی آواز سنی اور اس کے احکامات پر عمل کیا۔ جن کے پاس شجر زندگی کا پتہ تھا پھل آج بھی موجود ہے۔“

جینا میکلم کے چہرے پر زلزلے کا سا تاثر ابھرا۔ اس کے تنے ہوئے عضلات ڈھچکا پڑ گئے اور انداز میں وہ پہلے جیسا اعتماد نہیں رہا۔

”بین آئزک ہیزر کی ان پہاڑیوں کا باسی ہے، جن کے قدم میروم کا پانی چومتا ہے۔ وہاں اس کا آبائی قبیلہ آباد ہے، جو آغاز تاریخ سے اب تک پہلے ہی جیسا ہے اور جس دور جدید کی کسی تبدیلی کو نہیں اپنایا ہے۔“

کے مقابل کھڑا اس میں اپنا بے ہنگم بدن اور مسخ شدہ چہرہ دیکھ رہا ہو۔ بہر حال فرق اپنی جگہ رزم کہ زیست کے دونوں جنگجوؤں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا۔ یوسف کا ساتھ چھوڑنے میں تاسف کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ وہ دونوں غرض کی زور سے بندھے ہوئے تھے۔ اسے یقین تھا کہ اگر اس کے بغیر ہی یوسف کا کام بن گیا تو وہ اسے لے بغیر ہی یہاں سے نکلوا دے گا اور اصول بقا کے تحت اس کا یہ عمل ناجائز بھی نہیں ہوگا۔ خطرناک پہاڑوں کو سر کرنے والے، چوٹی کے سفر کے دوران ضرورت پڑنے پر ہر نیم ضروری اور بعض اوقات ضروری بوجھ تک سے پیچھا چھڑا لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک ناگزیر اور اہم ترین بوجھ جس سے نجات حاصل نہیں کی جاسکتی، صرف اپنا وجود ہوتا ہے۔

لیکن دوسری طرف اسے یہ ان جانا احساس بھی ہو رہا تھا کہ جنگ اور خواری کے دن تمام ہوئے۔ اب آسائش اس کی مختصر ہیں اور وہ اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے پیش قدمی کی پوزیشن میں آگیا ہے۔ آبائی وطن کا تصور ہی اس کے لئے بے حد خوش کن تھا لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کا کام بے حد دشوار ہے اور وہ بے حد مشکل صورت حال سے دوچار ہے۔ یوسف جو کچھ کر رہا تھا، وہ اخلاقی اعتبار سے درست نہیں تھا مگر اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ وہ تو صرف یہ سوچ رہا تھا کہ وہ یوسف کو کس حد تک استعمال کر سکتا ہے۔

اس کے انداز فکر میں نہ تو خود ترسی تھی اور نہ شیطنت۔ وقت نے اسے اس نواز میں تربیت دی تھی کہ وہ لوگوں اور واقعات کو جذبات کے نہیں بلکہ اپنی ضروریات اور حقائق کے حوالے سے دیکھتا تھا۔ اسے خدشہ تھا، ایسا وقت بھی آسکتا ہے کہ جب یوسف اسے اپنی اسکیم کے لئے غیر ضروری سمجھنے لگے۔ اس صورت میں وہ ان تمام باتوں سے محروم ہو جائے گا، جن کا یوسف نے وعدہ کیا ہے۔ یہ کوئی غیر معمولی یا انسانی بات نہیں تھی۔ ویسے وہ یوسف کو کسی حد تک پسند کرنے پر مجبور تھا اس کی وجہ یوسف کی ماف گوتی اور ریاکاری سے پاک رویہ تھا۔ وہ بغیر ضرورت کے چہرے پر نقاب اٹھانے کا عادی نہیں تھا۔ جبکہ بین آنزک نے ایسے ایسے پیٹ بھرے دیکھے تھے، جنہیں ناک تمام تر نعمتیں میسر تھیں اور وہ پھر بھی ریاکار تھے۔ وہ صرف لوگوں کو مسخر کرنے کے لئے خود کو تمام تر انکسار اور عاجزی کے ساتھ بہتر و برتر ثابت کرنے کے لئے اپنے چہروں پر ہر ممکن نقاب چڑھائے رکھتے تھے۔ نقاب کے نیچے سے نقاب اور اس کے نیچے سے

تو عبور نہیں کرلی۔ اگر اس کی جگہ بین آنزک ہوتا تو اتنے رواں جھوٹ بولنے ہی اس کا دل پھٹ جاتا۔

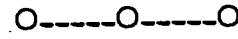
”تین مصلوب لاشیں، جن میں سے ایک کے سر پر کانٹوں کا تاج تھا۔“ سرگوشی میں دہرا رہی تھی۔ پھر اس نے یوسف سے پوچھا۔ ”اس وقت وہ نوجواں ہے؟“

”وہ میرے ساتھ آیا تھا۔ انتظار گاہ میں بیٹھا ہے۔“

”میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔“ جینا میکم نے نرم لہجے میں کہا۔ ”تم مجھے املوا سکتے ہو؟“

”جی ہاں مس میکم، کیوں نہیں؟“ یوسف نے کہا اور راحیلہ ذی شان کی مڑا۔ ”مس ذی شان! آپ اسے بلوا سکتی ہیں۔ بین آنزک اس کا نام ہے۔“

راحیلہ نے ریپور اٹھایا۔ مگر اس کے چہرے پر اپنے لئے برہمی، حقارت اور نفرت کا تاثر دیکھ کر یوسف بری طرح دہل گیا، حالانکہ راحیلہ ذی شان کا رد عمل اس لئے خلاف توقع نہیں تھا۔



انتظار گاہ میں بین آنزک خود سے بحث کر رہا تھا، لڑ رہا تھا۔ اس کے سامنے راستے تھے۔ وہاں رک کر اس فراڈ کا تماشا اور اس کے نتائج دیکھے، جس کے بارے میں اسے یقین نہیں تھا کہ یہ ممکن ہے۔ اسے یہ بھی ناممکن معلوم ہو رہا تھا کہ یوسف رسائی جینا میکم تک ہو سکے گی۔ کسی بھی لمحے وہ منہ لٹکائے بے نیل مرام واپس آسکتا دوسرا راستہ یہ تھا کہ وہ چپ چاپ یہاں سے نکل جائے اور پورٹ کا رخ کرے۔ قسمت آزمائی کرے۔ ممکن ہے، کسی ایسے جہاز پر کام مل جائے، جس کے کپتان کو کام سے دلچسپی ہو..... جو خطرناک نوعیت کے سوال نہ کرے اور جسے کاغذات سے کوئی غرض نہ ہو۔

اس کے لئے یوسف کو چھوڑ بھاگنے میں افسوس کی کوئی بات نہیں تھی۔ زندگی ایک مسلسل جنگ تھی اور اس نے جان لیا تھا کہ جنگ میں سب کچھ جائز۔ سب سے زیادہ اہم چیز اپنی بقا ہے اور پھر یوسف نے اس پر کوئی احسان نہیں کیا تھا یوسف کو پہلی ہی نظر میں پہچان گیا تھا۔ یوسف بھی اس جیسا ہی تھا۔ تھوڑے سے کے ساتھ..... اسے دیکھ کر بین آنزک کو ایسا لگا تھا، جیسے وہ کسی اترے ہوئے آ

اور وہ تمام دولت چوس لے۔ اس حساب سے وہ غذا اور انسان، دونوں کی دشمن اور بھرم تھی۔ اس اعتبار سے اسے لوٹنا کوئی بری بات نہیں تھی۔

اس نے اس عورت کے بارے میں مختلف انداز سے سوچنے کی کوشش کی۔ وہ ایک ایسی عورت بھی تو ہو سکتی ہے، جو اپنی دولت کی اسیر ہو اور اس اسیری کی وجہ سے اس ناگزیر لمحے کا سامنا کرنے سے خائف ہو، جو اسے اس کی عمر بھر کے منافع سے محروم کر دے گا اور جس کی وجہ سے اسے اس دنیا سے اس طرح خالی ہاتھ واپس جانا پڑے گا، جس طرح وہ اس دنیا میں آئی تھی۔

پھر اس نے تصور کرنے کی کوشش کی کہ اوپر کیا ہو رہا ہے؟ کیا یوسف اور وہ رات سرجوڑے بیٹھے کوئی سازش کر رہے ہیں؟ انتظار گاہ میں صرف اتنی روشنی تھی کہ سے اندھیرا نہیں کہا جاسکتا تھا۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر پڑے ہوئے پردے اتنے بھاری تھے کہ نہ ان میں سے روشنی گزر سکتی تھی اور نہ ہوا انہیں ہلا سکتی تھی۔ چنانچہ کمرے کی آواز کے نام پر پردوں کی سرسراہٹ بھی نہیں تھی۔ اس کا جی چاہا کہ انتظار گاہ سے ہر نکلے۔ تیز حدت آمیز دھوپ سے آنکھیں ملانے، تازہ ہوا کی روشنی پھیپڑوں میں مارے اور نیل گوں آسمان کو اپنے وجود میں سمیٹ لے۔

وہ کچھ دیر گوگموں میں مبتلا کچھ سوچتا رہا پھر اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھل۔ ہر طرف نانا اور سکوت تھا۔ کبھی کبھی ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز سکوت کی چادر کو تار تار کرتی۔ یسے میں وہ عظیم الشان مکان آسیب زدہ محسوس ہونے لگتا۔

اسے اپنی جیب میں کسی چیز کی موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ ٹھٹھکا..... اس نے بے ٹٹلی، وہ اخبار کا وہ مڑا مڑا صفحہ تھا جس پر جینا میکلم کی تصویر اور انٹرویو شائع ہوا تھا۔ اس نے اخبار جیب سے نکالا اور کھڑکی کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے پردہ ذرا سا سرکایا۔ عجب تیزی سے کمرے میں لپک آئی لیکن کمرے کے محض ایک گوشے کو روشن کر سکی۔ اس نے جینا میکلم کی تصویر کا جائزہ لیا۔ اسے ایسا لگا جیسے بوڑھی جینا میکلم کے چہرے کے توش اسے پہلے ہی اذیر ہو چکے ہیں۔ جینا کی آنکھوں میں عجیب سی شعلہ لگی تھی، جو اس کی لاشمذہب برہمی اور ضدی پن کی رہین منت تھی۔ اس کے سر کی اٹھان اس کے غور کی نیاز تھی۔ لیکن اسے پہلی بار جس چیز نے متاثر کیا تھا، وہ یہ تھی کہ وہ اپنے ہر انداز سے خوش معلوم ہوتی تھی۔ حالانکہ تصویر انسان کے ہر انداز کو ظاہر کرنے سے معذور ہوتی ہے پھر بھی وہ تصویر دیکھ کر صاحب تصویر کے ناخوش ہونے کا احساس شدت سے ابھرتا

ایک اور نقاب..... پھر ایک اور نقاب اترتا چلا آتا تھا۔ بین آنزک کے نزدیک پو ایسے لوگوں سے بدرجہا بہتر تھا۔

البتہ اس میں اور یوسف میں ایک فرق تھا۔ یوسف دولت کے پیچھے بھاگ، کیوں کہ دولت اس کی محرومیوں کا ازالہ کر سکتی تھی۔ جبکہ اس کا اپنا مسئلہ بے وطنی دولت سے انسان وطن نہیں خرید سکتا۔ یہ بات یوسف نہیں سمجھ سکتا تھا کہ وطن اہمیت رکھتا ہے..... بالکل گھر کی طرح۔ یہ اور بات کہ وطن میں آدمی کو گھر سے اہم کچھ نہیں لگتا۔ وہ وطن کی اہمیت کو نہیں سمجھ پاتا۔ یوسف بے گھر تھا مگر بے نہیں تھا۔ بے وطنی کا عذاب تو کچھ وہی سمجھ سکتے ہیں جو بھری دنیا میں قومیت اور تہ سے محروم ہوں۔

سو اس کا مقصد کسی نہ کسی طرح وطن پہنچنا تھا۔ وطن کی خدمت تو وہ برسوں کر رہا تھا لیکن اب وہ خاک وطن کو چومنا چاہتا تھا۔ زمین کا بھر دکھ بن کر اس کے رگ پے میں اتر گیا تھا۔ وہاں پہنچنا کچھ دشوار نہیں تھا مگر اسے اپنی جدوجہد کے پیش نظر آداب کا خیال بھی رکھنا تھا اور آداب سے گراں بار زنجیر کوئی اور نہیں ہوتی۔ یہ زنجیر قدم اٹھنے ہی نہیں دیتی۔

اسے یاد تھا کہ یوسف نے اسے اشارتاً دھمکی دی تھی کہ اگر وہ اس کی مرضی مطابق نہیں چلا تو وہ کام کو اس کے متعلق بتا سکتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا یوسف ایسا کر سکتا ہے اور اس میں شکایت کی بھی کوئی بات نہیں تھی کیوں کہ وہ زنجیر کے بارے میں کسی خود فریبی میں مبتلا نہیں تھا۔

وہ یوسف کے اندر جانے کے بعد انتظار گاہ میں اکیلا بیٹھا انہی سوچوں سے رہا۔ وہ ایک اچھے جنگ جو کی طرح حساب لگاتا رہا کہ اس کا یہاں موجود رہنا اور یوسف ساتھ دینا اس کے لئے کس حد تک ضرر رساں ثابت ہو سکتا ہے۔

اس کے خیالات کی رواندہ موجود اس عورت کی طرف مڑ گئی، جس سے ملا یوسف کے لئے بے حد اہم تھی۔ وہ اس کے لئے بھی تو اہمیت رکھتی تھی۔ وہ اس لئے جنت کے اس دروازے کی چابی کی حیثیت رکھتی تھی، جس کی اسے عرصے سے تھی۔ یوسف نے اسے ایک بہت بڑی مکڑی قرار دیا تھا جس نے اپنے گرد دولت کا بے مضبوط اور ناقابل شکست جالابن لیا تھا، جو اپنے محفوظ قلعے میں بیٹھی کسی بھی ایسے شکار خطر رہتی تھی، جس کی رگوں میں خون کے بجائے دولت دوڑ رہی ہو تاکہ وہ اس پر

تھا..... بشرطیکہ دیکھنے والا اسی کی طرح حساس ہو۔ اس وقت بھی تصویر دیکھتے ہو۔  
احساس شدت سے ابھرا۔

اس بار تصویر دیکھ کر اسے ایک اور احساس بھی ہوا..... شناسائی کا اور  
اسے ایسا لگا جیسے وہ اس عورت کو برسوں سے جانتا ہے۔ اسے جینا میلم کے چہرہ  
کرت خطوط ماضی میں جاتے، نرم ہوتے محسوس ہوئے اور ان نرم خطوط میں اس  
لئے اجنبیت بھی نہیں تھی۔

اس نے خود کو یاد دلایا کہ یہ محض اس کا خیال ہے..... تصور یا وہم  
شناسائی کے اس احساس سے پیچھا نہ چھڑا سکا۔ اسے جینا میلم کی آنکھوں میں ایک وہ  
الٹا کروٹ لیتی محسوس ہوئی۔ صرف التجائی نہیں، وہاں کوئی اذیت بھی تھی، کوئی اسرا  
تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس نے زندگی سے کچھ چاہا ہے لیکن وہ ”کچھ“ اسے مل نہیں سکا۔  
بین آنزک نے چہروں پر حزن و الم بارہا دیکھا تھا۔ اس نے عورتوں کو اپنے  
مکانوں کے سامنے بیٹھ کر روتے دیکھا تھا۔ ان مکانوں کے سامنے، جن سے دھواں اڑ  
تھا۔ اس لئے وہ دکھ کو سمجھنے، اسے پڑھنے میں کبھی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ اسے جینا میلم  
بڑی شدت سے ترس آیا اور اس ترس کے نیچے سے اسے سمجھنے اور جاننے کی خواہش  
سرا بھرا۔

اس نے کھڑکی سے باہر نیل گوں آسمان کو دیکھا، جو بے حد مختصر اور محدود لگ  
تھا، آسمان کا محض ایک ٹکڑا۔ وہ اپنے اس جذبے سے خوف زدہ ہو گیا۔ جنگ میں نہ  
اور ترم کا کیا کام؟ اور اپنے سوا بھی کوئی قابل اعتماد ہوتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ رحم کر  
والے جنگ میں اپنی زندگی ہار جاتے ہیں۔ دنیا میں نفرت اور تنگ نظری کے سوا دھرا  
کیا ہے.....

اس کے دل میں وہاں سے نکل بھاگنے کی خواہش پوری شدت سے ابھری۔  
وقت اندرونی دروازے کی طرف سے قدموں کی چاپ ابھری۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔  
ملازم یوسف کو اندر لے کر گیا تھا، وہ انتظار گاہ میں داخل ہوا۔

”جناب! ماکن نے آپ کو طلب کیا ہے۔ میرے ساتھ چلے آئیے..... پلیز!“  
بین آنزک نے اخبار پھر جیب میں ٹھونس لیا۔ وہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا اور سوچتا  
تھا۔ یہ بلاوا اس کا جواب تھا۔ وہ فیصلے کے حق سے محروم ہو گیا تھا اور اب اسے اس راہ  
پر آنکھیں بند کر کے چلنا تھا، جس کے متعلق اسے کچھ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس

منام پر اس کی منزل ہے یا.....  
اس نے سر کو اثباتی جنبش دی اور ملازم کے پیچھے پیچھے چل دیا۔

○-----○-----○

یوسف غیر محسوس طریقے سے اس سائے کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا، جو جینا میلم کے  
واڑے کی سمت سے بائیں جانب پھیلا ہوا تھا۔ وہ بین آنزک کے کمرے میں داخلے کے  
تقریباً ایک مخصوص تاثر ابھارنا چاہتا تھا۔

لوکے نے جیکٹ کندھے پر ڈالی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک اور  
ملنے ہوئے چہرے کے دل کش کلاسیکی نقوش میں عجیب سی خوبصورتی اور معصومیت  
..... جیسے اس نے دنیا میں کچھ دیکھا ہی نہ ہو۔

یوسف نے جینا میلم کو بہ غور دیکھا، جس کی بھنپی ہوئی مٹھیاں میز پر اس کے  
نہ رکھی تھیں۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے مٹھیاں کھلیں اور پھر بھنچ گئیں۔

”مس میلم..... مس ڈی شان!“ یوسف نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ ”اس سے  
یہ بین آنزک ہے۔ بارزی لئی کا خون..... گیلی لی کے علاقے میں آباد نفتالی قبیلے  
بل فرد۔ یہ قدیم بنو اسرائیل سے تعلق رکھتا ہے۔“

بین آنزک، جینا میلم کی میز کے سامنے کمرے کے وسط میں یوں کھڑا تھا، جیسے اسے  
وجود کا احساس ہی نہ ہو۔ پھر اسے ایک جانب نقل و حرکت کا احساس ہوا تو اس نے  
لہا کر دیکھا۔ وہ راحیلہ میلم ڈی شان تھی، جس نے اپنا چشمہ اتار کر میز پر رکھ دیا تھا۔  
بین آنزک نے اس کی طرف سے نظریں ہٹائیں اور اس مختصر الوجود، معمر عورت  
چہرے پر مرکوز کر دیں، جو اس کے سامنے، اپنی میز کے عقب میں بیٹھی تھی۔ اب جیسے  
کمرے میں کسی اور کی موجودگی کا احساس ہی نہیں تھا۔ اسے اپنے دل میں ایک بار پھر  
جذبہ ترم ابھرتا محسوس ہوا، جو اس عورت کی تصویر دیکھ کر ابھرا تھا۔ مگر اس بار اس  
باہ میں عجیب سی گرم جوش، چاہت اور اشتیاق کی آمیزش تھی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ  
”بڑے“ اس عورت کے قدموں میں بیٹھے اور اس سے لپٹ جائے..... کسی ننھے  
کی طرح! وہ یہ بات سمجھ نہیں پا رہا تھا، لیکن یہ حقیقت تھی کہ اس معمر عورت نے نہ  
کس طرح اس کے دل کے کسی اچھوٹے گوشے کو چھو لیا تھا۔

اسے احساس ہوا کہ اس عورت کو تنخیر کرنا ہے..... دو وجوہات کے تحت۔  
لادج اب بھی وہی تھی۔ پاسپورٹ اور شناختی کاغذات کا حصول۔ وہ اسے اس کی

رکھا تھا..... مگر بین آنرک کی معصوم خوبصورتی نے اسے اپنے نسوانی رد عمل کو بانے کا کوئی موقع نہیں دیا تھا۔ پھر اس نے بین آنرک کا جواب سنا اور اسے سمجھا..... بین آنرک ان دونوں خواتین کی موجودگی میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ اسے بچہ سمجھا جائے مگر اس کے بولنے کا انداز اس کی آواز اور بڑی عمر کا دعویٰ کرتے ہوئے اس کا لہجہ..... اور بے حد متاثر کن تھی۔

”اور اس دعائیہ جملے کا کیا مطلب ہوا، جو تم نے آتے ہی کہا؟“ جینا نے پوچھا۔  
”یہ دعا بھی ہے اور سلام بھی۔ یہ میرے اجداد کا طریقہ ہے۔ میں نے اس کا ترجمہ لیا تھا۔“  
”اور نوجوان..... تم رہنے والے کہاں کے ہو؟“

بین آنرک نے اس سوال کا جواب فوراً نہیں دیا۔ وہ اب بھی اس بات پر غور کر کے الجھ رہا تھا کہ اس عورت نے اس پر اتنا عجیب اور بھرپور تاثر کیسے چھوڑا ہے؟ اس اب کیا ہے؟ اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس کی اپنی اغراض کی خاطر اس عورت کو خوش کرنے اس کا دل جیتنے کی خواہش کمزور پڑ گئی ہے۔ اس کی جگہ اب اس عورت کے سرد انڈل پر ایک مسکراہٹ تھرکتی دیکھنے کی خواہش نے لے لی ہے۔

پھر اس نے جواب دیا تو جھوٹ بولا مگر اس کے شعور میں یہ بات نہیں تھی کہ وہ یہ موٹ کیوں بول رہا ہے۔ کم از کم یہ تو وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ یہ جواب اس لئے دے رہا ہے کہ بوڑھی عورت بھی کچھ سننا چاہتی ہے۔

”میں گیلی لی کا رہنے والا ہوں۔ میرا تعلق نفتالی قبیلے سے ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

یہ قدم نام اس کے لبوں سے موسیقی کی طرح پھوٹے اور کمران کی گونج سے بھر گیا۔

جینا نے سر کو تھپسی جنبش دی۔ راحیلہ اسے ٹٹکی باندھے دیکھتی رہی۔ ایسا لگتا تھا کہ نظریں ہٹانا اس کے بس میں نہیں رہا ہے۔

وہ شخص جس کے ہاتھوں میں کٹھ پتلیوں کی ڈور تھی، جس کی انگلیوں کے اشاروں کے پتلیاں ناچ رہی تھیں، بے حد خوش تھا۔ وہ آپ ہی آپ مسکرا رہا تھا، اپنی ذہانت کو براہ رہا تھا لیکن وہ حیران بھی تھا۔ بین آنرک تو پیدائشی اداکار ثابت ہو رہا تھا۔ اس کی افادگی میں کیس جھول نہیں تھا۔ یہ بات طے ہو چکی تھی کہ وہ دونوں خواتین کو اپنے

شناخت فراہم کر سکتی تھی اور دوسری وجہ ناقابل فہم تھی۔ بس وہ اتنا جانتا تھا کہ ام وجود میں، ان جانے جذبوں کی راہ داری میں کھلنے والے بند آہنی دروازے، جو طویل استعمال کی وجہ سے زنگ آلود ہو چکے تھے، کھل رہے ہیں۔

اس نے بڑے احترام سے عورت کے سامنے سر خم کیا اور بولا، ”اللہ آ سلامتی سے نوازے۔“

اپنے لفظوں نے خود اسے بھی حیران کر دیا۔ الفاظ اس کے ہونٹوں نے ادا کیے لیکن بے ارادہ۔ اسے شدت سے احساس ہوا کہ یہ ملاقات اسے عجیب کیسادی تباہ سے دوچار کر رہی ہے۔ اسے احساس ہی نہیں ہوا کہ اس نے کیا تاثر مرز ہے.....

اس کی گہری آواز نے..... ان لفظوں نے کمرے کی فضا کو بدل کر رکھ دیا۔ لخت، جیسے وقت پیچھے چلا گیا، پل بھر میں زمانے گزر گئے اور پھر جیسے وقت ناموجود ہو، ہزاروں نسلوں کے درمیان ایک لمبائی وقفے کی طرح کھڑا تھا۔ اس کی عمر کا تعین ناممکن وہ ایک پیر جواں تھا..... ایک ایسا شخص، جس پر سے صدیاں گزر گئی ہوں..... پامال کئے بغیر!

ایسے میں جینا میکم اس سے ایک یہی سوال کر سکتی تھی۔ ”تمہاری عمر کتنی لڑکے؟“ اس نے اسکول ٹیچر کے سے انداز میں تحممانہ لہجے میں پوچھا۔

”میری عمر جتنی نظر آتی ہے، اس سے زیادہ ہے..... درحقیقت بہت زیادہ۔“

بین آنرک نے جواب دیا۔  
نیم تاریک سائے میں کھڑا یوسف زیر لب مسکرایا۔ اس نے اپنے لئے بہتر منتخب کی تھی۔ یہاں سے وہ سب کچھ دیکھ سکتا تھا..... اس نے دیکھا تھا.....

دیکھ رہا تھا۔ اس نے بین آنرک کو حسین راحیلہ کی طرف دیکھتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس نے بھی دیکھا تھا کہ راحیلہ نے بین آنرک پر نظر پڑتے ہی بے اختیار اپنا چشمہ اتارا۔ گویا مشین بننے کے باوجود وہ پوری طرح مشین نہیں بنی تھی، اس کی نسوانیت نہ ہو سکی تھی، اس کا دل اب بھی خوبصورتی کے لئے دھڑک سکتا تھا۔ نازک اسٹیک، منہ، رنگا رنگ جذبے سوئے ضرور تھے لیکن موت کی نیند نہیں..... اور اسٹیک جذبوں کی نیند بہت کچی ہوتی ہے۔ دل کے دروازے پر ہلکی سی چاپ بھی ابھرے تو اٹھا کر آنکھیں کھول دیتے ہیں۔ لڑکی نے اپنی نسوانی جبلت کو جارحیت کے نیچے دبا





یوں کو لفظ عموماً ناراض ہوتے ہیں۔

چنانچہ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ یہ اسے خود بھی علم نہیں تھا کہ اس کے چہرے اس کی آنکھوں نے جواب دے دیا ہے۔  
”خیر چھوڑو۔“ جینا نے کہا۔

پھر کچھ دیر خاموشی رہی مگر اس میں سنگینی نہیں تھی۔

چند لمحوں کے بعد جینا میکلم کی انگلی حرکت میں آئی۔ شاید وہ اس کے جسم کا واحد زار عضو تھا۔ اس نے پیتل پر کوئی ٹن دلیا۔ اگلے ہی لمحے اس دروازے میں ’جس کے ہاتھ کے سامنے میں یوسف کھڑا تھا‘ وہ ملازم نمودار ہوا جو بین آئزک کو یہاں لایا تھا۔ وہ باور مؤدب کھڑا ہو گیا۔

”سٹریٹوڈ سن!“ جینا نے کہا ”میں تم سے بعد میں گفتگو کروں گی۔ اصولی طور پر ہمارے تجویز..... پیشکش قبول کر لی ہے۔ تم دونوں بیس میرے ساتھ رہو..... اس گھر میں۔ ولیم تمہیں تمہارے اقامتی کمرے دکھا دے گا۔“ اس نے ملازم طرف اشارہ کیا۔ ”اور اس دوران بین آئزک کے لئے لباس کا بندوبست کیا جائے گا۔ اسے اچھے لباس میں دیکھنا چاہتی ہوں۔ راحیلہ! تم فوراً اس سلسلے میں اقدامات کرو۔“ وہ بین آئزک کی طرف مڑی۔ ”بین آئزک! تم مس ڈیٹان کے ساتھ جاؤ۔ یہ تمہیں دردت کی ہر چیز دلائے گی۔“

بین آئزک کے انداز میں اس محبت کرنے والے کا بے صبراپن تھا جسے یہ یقین لیا کہ وہ اپنے محبوب کی محبت جیتنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ اس نے کرسی سے اٹھتے ہوئے والمانہ انداز میں جینا میکلم کے ہاتھ تھام لئے اور محبت آمیز لہجے میں بولا ”شکریہ“

اس بار جینا نے ہاتھ نہیں کھینچے۔ البتہ بین آئزک کے چہرے کو ٹٹولنے والی نگاہوں سے دیکھتی رہی۔

بین آئزک نے اپنی جیکٹ کندھے پر ڈالی اور راحیلہ کی طرف بڑھ گیا، جو اپنی میز کے پاس اس کی منتظر کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں چشمہ تھا اور ہونٹوں پر بے حد دل آویز کراٹھ۔ بین آئزک بھی مسکرا دیا۔

”مجھے آپ پہلی نظر میں ہی اچھی لگی تھیں۔“ بین آئزک نے راحیلہ سے کہا۔  
وہ چند لمحوں تک ایک سرے کو ستائش نگاہوں سے دیکھتے رہے، یوں جیسے انہیں

دیکھتا رہا، جو اس نے کبھی نہ دیکھا تھا، اس کی سماعت میں ان گیتوں کے پھول گل تھے جو برسوں پہلے انکل نتھانیل نے بوئے تھے۔

جینا میکلم نے بھی وہ سب کچھ محسوس کر لیا۔ بے وطنی کا دکھ بھی اور دل خواب بھی لیکن وہ سمجھتا نہیں چاہتی تھی چنانچہ اس نے لفظوں پر اصرار کیا۔  
آئزک..... مجھے بتاؤ اپنے بارے میں سب کچھ بتاؤ۔ میں سننا چاہتی ہوں۔“

بین آئزک نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرانی اٹھی۔ کیا آئزک کچھ دیکھ لے، اسے بھی سننا چاہتا ہے؟ ایسا کیوں ہے؟ یہ تشکیک کیسی؟ دیکھ کر بھی نہیں آتا!

پھر وہ بولتا رہا..... اپنے خواب بیان کرتا رہا۔ جینا میکلم یوں تن کر بیٹھی جیسے پتھر کا مجسمہ ہو۔ راحیلہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں ٹھوڑی رکھ کر آگے کی جھک آئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں سحرزدگی کی تمام علامات تھیں۔ وہ جو کچھ دیکھ رہی اور جو کچھ سن رہی تھی، اس کا اس دنیا سے تو کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا تھا۔ وہ اور ہی دنیا تھی۔

پھر خاموشی چھا گئی۔ کمرے میں کوئی آواز نہیں تھی۔

جینا میکلم کے چہرے پر جو تاثر تھا، یوسف اسے سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ نہ جانے سوچ رہی تھی، اس کے ذہن میں کیا تھا؟ اس نے یہ فراڈ قبول کر لیا تھا یا مسترد کر دیا وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔

بالآخر جینا نے کہا ”ایک بار پھر مجھے ویسے ہی پکارو“ جیسے ابھی کچھ دیر پہلے پکارا مجھے وہی دعا دو.....“

”خدا آپ کو حقیقی خوشیاں عطا فرمائے ماں۔“

اچانک جینا کے چہرے کا تاثر تبدیل ہوا اور اس نے کرخت لہجے میں پوچھا  
”مجھے ماں کہہ کر کیوں پکارا؟“

بین آئزک سنجیدگی سے اسے دیکھتا رہا۔ اس وقت وہ خود بھی اپنے آپ سے سوال کر رہا تھا۔ کیا اس کی مادی تبدیلی کا یہی سبب تھا اور یہی ماحصل تھا جو اس خاتون پہلی نظر دیکھتے ہی اس نے اپنے اندر رونما ہوتی محسوس کی تھی؟ کیا یہی وہ جذبہ تھا؟ اس کی کسی اضافی حس نے اسے بتا دیا کہ یہ بات کہنے کے لئے یہ مناسب نہیں ہے۔ جذبہ کھوتا ہو تو اس کی بے قدری کا خطرہ مول لیا جاسکتا ہے لیکن کہ

یقین ہو گیا ہو کہ ان کی باہمی قربت دونوں ہی کے لئے باعث مسرت ہوگی۔ پھر د سے چلے گئے۔

ان کے بعد یوسف، ملازم ولیم کے پیچھے جینا کے کمرے سے نکل آیا۔ اس میں ایک خٹس کی پھانس رہ رہ کر چبھ رہی تھی۔ اسے کوئی اہمیت نہیں دی گئی تھی اس گھر میں رہنا ضرور تھا لیکن میزبانوں کے رویے نے ثابت کر دیا تھا کہ نہ وہ مطلوب ہے اور نہ ہی اسے قبول کیا گیا ہے۔ یہ سب کچھ اپنی جگہ..... مگر اس یہ بات حیرت انگیز تھی کہ اس کے لئے یہ رویہ تکلیف دہ ثابت ہوا ہے۔ عام حالات اسے اس بات کی پروا بھی نہ ہوتی۔ وہ تو اپنا الو سیدھا کرنے کا قائل تھا اور اگر سیدھا ہو گیا تھا۔ اس کے لئے یہ بات اور زیادہ باعث حیرت تھی کہ ایک عجیب احساس تنہائی نے اس کے دل کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ حالانکہ اس نے زندگی تنہائی کو ایک دوست کی حیثیت سے قبول کیا تھا اور خود کو کبھی تنہا محسوس نہیں کیا تھا۔ بہر حال اس نے اس احساس کو ذہن سے جھٹکا اور اپنی فحش کا تصور کیا۔ یہ بہت کامیابی تھی۔ اسے سکون محسوس ہوا۔ اس نے خود کو یاد دلایا کہ بین آئزک کے خواتین سے تعلقات کوئی بھی صورت اختیار کریں، اسے اس سے کوئی غرض نہیں چاہیے۔ اسے تو خوش ہونا چاہیے، اس کی اسٹیم کامیابی سے ہمکنار ہو رہی ہے۔ اور اس کامیابی کا سہرا بین آئزک کے سر تھا!

○-----○-----○

یوسف کی یہ بات درست ثابت ہو گئی تھی کہ جینا میکلم کے لئے کوئی کام دشوار ہے۔ میکلم ہیل میں ان کے قیام کو دو ماہ ہو چکے تھے۔ بین آئزک کو شناختی کاغذات پاسپورٹ میسر آ گیا تھا۔

لیکن یوسف کے لئے وہ عرصہ بے حد ناخوشگوار بلکہ اعصاب شکن ثابت ہوا تھا۔ خود پر حیران تھا۔ اسے اپنے خواب کی تعبیر مل گئی تھی۔ وہ ہاتھ پیر ہلائے بغیر پر تعیش لگی گزار رہا تھا لیکن اب اعصابی دباؤ اس حد تک بڑھ گیا تھا کہ خدشہ تھا، وہ خود ہی بے قریب کا پردہ چاک کر دے گا۔

بین آئزک اور راحیلہ ڈیشان کی قربت اس کے لئے تشویش کا باعث تھی۔

ایک شام اس نے راہ داری میں ان دونوں کو بے حد قریب دیکھا..... بے حد بد! اسے یہ دیکھ کر حیرت تو ہوئی مگر کوئی سکون نہ ملا کہ بین آئزک پیش قدمی کر رہا تھا۔ راحیلہ مزاحمت کر رہی تھی مگر وہ مزاحمت زبانی تھی۔

یوسف نے سوچا کہ اب اس سلسلے میں کچھ کرنا بہت ضروری ہو گیا ہے۔

لیکن اس کے لئے پریشانی کی بات یہ تھی کہ اسے ان کی قربت سے کیا تکلیف؟ ان کے باہمی تعلق سے کیا غرض! وہ جذبوں کے معاملے میں سرے ہی سے کورا تھا۔ بے انسان کے لئے کمزوری کی حیثیت رکھتے ہیں اور کمزوری کا وہ متحمل نہیں ہو سکتا۔

اب اچانک اسے یوں لگا جیسے اس کی زندگی خطرے میں پڑ گئی ہے۔ پیٹ بھرتے آسمانات میسر آتے ہی طرح طرح کے جذبوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا تھا۔ شور شیں کردی تھیں۔ پہلی بار اسے احساس ہوا کہ جسم و جان کی آسودگی فتنوں کو جنم دیتی ہے۔ اس خود سے خوف آنے لگا۔ زندگی میں پہلی بار وہ جذبہ رقابت سے آشنا ہوا۔ اس پوری زندگی مشاہدات اور محسوسات کا تجزیہ کرتے گزاری تھی۔ یہ رقابت کا جذبہ اپنے ہونے کا باعث تو نہیں تھا۔ اس کے پیچھے بھی تو کوئی اور جذبہ کار فرما ہوگا.....

اگرے تھے۔ اس معاملے میں وہ خواہ خواہ کی آسودگی محسوس کر رہا تھا۔  
اسے راحیلہ میکلم ڈیٹان پر حیرت تھی۔ برف کی وہ عورت، جس نے تحفظ کے  
حصول کے لئے انگلیوں بھری جوانی تجھے کا فیصلہ کیا تھا، ہمک رہی تھی۔..... پکھل رہی  
تھی۔..... اور وہ بھی ایک سڑک چھاپ لڑکے کے سحر کی اسیر ہو کر..... وہ یہ نہیں  
جانتا تھا کہ برف میں حرارت ہوتی ہے، وہ مزاجاً سرد نہیں ہوتی۔ بیرونی حدت کا تو صرف  
ہمانہ ہوتا ہے۔ اندر ہی اندر تو وہ اپنی حدت سے پکھلتی ہے۔..... رفتار کم ہی سہی۔

یہی سب کچھ سوچتے سوچتے وہ غصے کی شدت سے کھول اٹھا۔ اپنے غصے کی شدت  
نے اسے خوف زدہ بھی کیا اور وہ چونکا بھی ہو گیا۔ عقلی طور پر یہ بات اس کی سمجھ میں آتی  
تھی کہ وہ دونوں جو کچھ کر رہے ہیں، اس سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسے ان کے  
معاملات میں مداخلت کا کوئی حق نہیں۔ کم از کم اس وقت تک جب تک ان کا تعلق اس  
کی اسکیم پر منفی طور پر اثر انداز نہیں ہوتا۔

لیکن جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ اس کی سوچ غلط تھی۔ جو کچھ اس نے دیکھا اور  
سنا تھا، غلط تھا۔..... اس لئے کہ وہ بین آنزک کی لمحاتی لغزش تھی، جس پر راحیلہ نے  
اسے نرمی سے ٹوک دیا تھا۔..... صرف اس لئے کہ بین آنزک اسے اچھا لگتا تھا۔ وہ  
منفی مزاحمت نہیں تھی، جو جارج کو مزید کچھ کرنے پر..... پیش قدمی پر اکساتی ہے۔  
اگلے چند روز میں ثابت ہو گیا کہ ان کے درمیان ایک عجیب سی دوستی کا رشتہ استوار ہو  
رہا ہے۔

اب وہ پچھتا رہا تھا کہ کاش اس نے وہ سب کچھ نہ دیکھا ہوتا، نہ سنا ہوتا۔ اب  
اسے راحیلہ ڈیٹان کے چہرے پر جو تاثر نظر آتا تھا، اس سے ثابت ہوتا تھا کہ زندگی میں  
پہلی بار اس نے عورت کا روپ دھارا ہے، اپنی نسوانیت کو قبول کیا ہے اور اس کا یہ  
روپ بہت زیادہ دلکش تھا۔

اسے یاد تھا کہ اس روز وہ راہ داری میں نکلا تھا۔..... اور فوراً ہی اسے احساس  
ہو گیا تھا کہ وہ کسی خلوت گاہ میں داخل ہو گیا ہے۔ بین آنزک نے راحیلہ کو بانسوں میں  
تھام رکھا تھا۔ راحیلہ کا سر اس کے سینے پر تھا۔ بین آنزک سرگوشی میں کچھ کہہ رہا  
تھا۔..... اچانک راحیلہ بڑبڑائی۔ ”مجھے چھوڑ دو بین۔..... مجھے جانے دو۔.....“ لیکن  
اس نے خود کو چھڑانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

ان دونوں کو کچھ دیر تو اس کی موجودگی کا احساس ہی نہیں ہوا۔ پھر جیسے ہی انہیں

اور شاید اس کے پیچھے کوئی اور جذبہ..... کون جانے، یہ سلسلہ کہاں تک جا  
الٹال تو وہ صرف اتنا جانتا تھا کہ بین آنزک اور راحیلہ میکلم ڈیٹان کو یکجا.....  
دوسرے سے قریب دیکھ کر اس کے اندر ان دیکھے، خوف ناک سانپوں کی پھنکاریں  
لگتی ہیں۔ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا مگر شاید وہ دونوں ایک دوسرے کی مجر  
گرفتار تھے۔..... اور ان کی محبت کا تصور بھی اس کے لئے ناقابل برداشت تھا۔  
آرام سے کمر، آرام دہ بستر اور جب میں رقم کی حیات آمیز حدت..... تو اچھا  
خواہش ابھر آئی تھی جسے بقا کی جنگ نے کبھی سراٹھانے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔  
چاہے جانے کی خواہش..... اور وہ خواہش پوری شدت سے ابھری تھی۔ بد  
تقاضے اس کے لئے نئے نہیں تھے۔ اس کے نزدیک ان کی حیثیت پیٹ کے تقاضوں  
ہی تھی۔ کچھ مل گیا تو کچھ کھالیا، نہیں ملا تو بھوکے ہی سوغے، لیکن اس بار معاملہ  
تھا۔ اب جسم کے نہیں، دل کے، روح کے تقاضے سامنے آئے تھے، اس لئے کہ  
پہلی بار موقع ملا تھا سامنے آنے کا۔ وہ بین آنزک اور راحیلہ کی ممکنہ محبت سے جڑ  
اس لئے نہیں کہ راحیلہ اسے اچھی لگتی تھی یا وہ راحیلہ سے محبت کرتا تھا۔ محبت  
لطیف اور نازک جذبے کا تو وہ ابھی اہل ہی نہیں تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ راحیلہ اس سے  
کرے لیکن راحیلہ، بین آنزک کے قریب ہوتی جا رہی تھی۔ یہ اس کے لئے محرو  
م تھی اور ناکامی بھی۔ وہ ایک نئی طرح کی آگ میں جھلس رہا تھا۔

وہ سوچتا اور کڑھتا رہا۔ غضب خدا کا محبت کا یہ ٹانگ اس کی آنکھوں کے  
کھیلنا جا رہا ہے، اور یہ بین آنزک! اچانک ہی بین آنزک اس کے لئے بازی جیتنے کے  
استعمال کرنے والا تِرپ کا اکا نہیں رہا۔..... بلکہ ایک حریف..... ایک رقیب  
حیثیت اختیار کر گیا۔ اس نے اپنے اس جذبے کا تجزیہ کیا مگر وہ جذبوں کا آدمی  
تھا۔..... اس لئے نہیں جانتا تھا کہ اس معاملے میں اکثر تجزیے بے سود ثابت ہو  
ہیں۔ جذبوں میں بھی انسانوں کی طرح اپنے چہروں کو نقابوں میں چھپانے کی اہلیت  
ہے۔

اس نے خود کو سمجھایا کہ اسے بین آنزک اور راحیلہ کی قربت پر صرف  
اعتراض ہے کہ برنس اور تفریح کو یکجا نہیں ہونا چاہئے اور میکلم پیل میں ان کی موہ  
برنس سے تعلق رکھتی تھی۔ خود اسے تفریح کی سوجھتی تو وہ یقیناً باہر کا رخ کرتا لیکن  
عجیب بات تھی کہ رقابت کے اس تند جذبے کے رد عمل کے طور پر جسم کے تقاضے

ہوئی کی نہیں ہے۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ کام کے سلسلے میں عورت کو ملوث کر لیا جائے تو پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں اور کام بگڑ جاتا ہے۔ یہ ذہن میں رکھو کہ اس گھر میں ہماری موجودگی کا ایک مقصد ہے اور وہ مقصد دنیا کی حسین ترین لڑکی سے زیادہ حسین ہے۔ میری باتوں پر ٹھنڈے دل سے سوچنا۔ یہ کہہ کر وہ پلٹا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے کھڑکی کھولی اور کھڑکی کے ساتھ رکھی ہوئی کرسی کے ہتھے پر بیٹھ کر باہر دیکھتا رہا۔ وہ صورت حال پر غور کر رہا تھا۔

اس نے فیصلہ کیا کہ اسکیم پر عمل درآمد کا..... عملی قدم اٹھانے کا وقت آگیا ہے۔ جینا میکلم دشوار ثابت ہو رہی تھی..... مگر اس کی اسکیم کے لئے راحیلہ میکلم یثان اس سے زیادہ خطرناک تھی۔ وہ اس سے خوف زدہ تھی..... کیوں کہ اس نے راحیلہ کا دبا ہوا عدم تحفظ کا احساس ابھارا تھا۔ اس نے جینا میکلم کو متاثر کر کے راحیلہ کے زور و سوجھ کو بھی متاثر کیا تھا۔ اس نے پہلی جنگ میں راحیلہ کو شکست دی تھی۔ اسے یقین تھا کہ راحیلہ نے اس کے بارے میں یقیناً چھان بین کرائی ہوگی اور اب وہ جینا میکلم کے سامنے اس کا کپکا چٹھا کھولنے کے لئے کسی مناسب موقع کی منتظر تھی۔ بین آنزک سے اس کا اتحاد اس اقدام کے لئے مناسب ترین موقع ثابت ہو سکتا تھا۔ کیا پتا..... بین آنزک سے اس کی قربت کا سبب بھی یہی ہو۔

ایک پہلو اور تھا، جس کی خطرناکی کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا تھا۔ بڑا کھیل کھیلنے والوں کو عموماً اس بے یقینی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اپنا اہم ترین مہرہ بڑھاتے وقت کبھی کبھی دب میں بھی ڈالنا پڑتا ہے۔ مہرہ بے جان ہو تو اس کے حریف لشکر سے جاننے کا خطرہ ملتا ہے لیکن جہاں مہرہ ذی عقل انسان ہو اور سینے میں جذبات بھی رکھتا ہو، وہاں خطرہ چند ہو جاتا ہے۔ جینا اور بین آنزک کے درمیان جو تعلق استوار ہوا تھا، وہ اسکیم کے لئے بے حد خطرناک تھا۔ معاملہ ایک ایسی عورت کا تھا جو ازدواجی زندگی کی مسرتوں سے ہم آہم رہی تھی۔ کہتے ہیں کہ مائتا عورت کا جزو لازم ہوتی ہے۔ سو ایسی عورت، جسے کبھی ناکے اظہار کا موقع ہی نہ ملا ہو، کتنی بڑی محرومی کا شکار ہوتی ہے۔ جینا وہ عورت تھی، جس نے زنجیروں کی گرفت میں زندگی گزاری تھی۔ پہلے باپ کی اور پھر دولت کی زنجیر۔ مائتا محبت کی تھی مگر اسے دولت کی قربان گاہ پر جھینٹ چڑھا دیا تھا۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ بین آنزک کو دیکھ کر سوچتی ہو..... اگر میں نے شادی کر لی ہوتی تو آج میرا ایسا ایک بیٹا ہوتا۔ یوسف، جیسا کہ، نظر رکھو، یہ تھا..... تاکہ اندر باہر

احساس ہوا تو ان کا رد عمل وہ نہیں تھا، جو ایسے موقعوں پر محبت کرنے والوں کا ہوتا ہے۔ وہ تیزی سے..... افراتفری کے عالم میں علیحدہ نہیں ہوئے بلکہ بین آنزک نے بہت آہستگی سے..... بتدریج راحیلہ کو اپنی گرفت سے آزاد کیا۔ اس کے ہاتھ بدستور راحیلہ کے کندھوں پر نکلے رہے۔ وہ ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے رہے۔ یوسف خاموش رہا۔ جذیوں کا جاہل ہونے کے باوجود اسے احساس تھا کہ کہیں کہیں لفظ استنہ بے وقعت ہوتے ہیں کہ خاموشی آدمی کو کم از کم بیان کی عاجزی سے اپنی بے وقعتی سے بچا لیتی ہے۔ وہ خاموشی سے بین آنزک کے بدلے ہوئے چہرے کو دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں کی سیاہی گہری ہو گئی تھی۔ اس کی نگاہیں ایک تربیت یافتہ قاتل کی نگاہیں تھیں..... وہ قاتل جو اس کے اندر مگر اوپری، سطح کے بہت قریب چھپا رہتا تھا کہ ضرورت پڑتے ہی سامنے آجائے۔

وہ ان سب کے لئے ایک بے حد خطرناک لمحہ تھا۔

راحیلہ کے چہرے اور آنکھوں سے جھلکنے والی نساوینت کہیں گم ہو گئی تھی۔ اس نے یوسف کو گھور کر دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں حجاب بھی تھا اور اس کے لئے شدید نفرت بھی۔ ”کیوں؟“ اس نے بے حد تندہ لہجے میں کہا اور اپنے لہجے کی شدت پر خود بھی حیران رہ گئی۔ ”آخر تم ہی کیوں؟ اس لمحے میں مداخلت تم ہی کو کرنی تھی! کیوں؟“ یہ کہہ کر وہ پلٹی اور بھاگتی ہوئی دوسری راہ داری میں مڑ گئی۔

یوسف حیران تھا..... وہ ”آخر تم ہی کیوں؟“ کا مضمون سمجھنے سے قاصر تھا۔ ”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“ بین آنزک نے بھاری آواز میں پوچھا ”میری نگرانی کر رہے ہو تم؟ دیکھو مسٹر یوڈسن، میں تمہیں سمجھا رہا ہوں کہ میرا راستہ کاٹنے کی حماقت کبھی نہ کرنا۔“

”مجھے افسوس ہے بین آنزک!“ یوسف نے معذرت کی۔ ”میں تو اتفاقاً یہاں نکل آیا تھا.....“

بین آنزک کا لہجہ اب بھی سخت تھا۔ ”اتفاقاً نکل آنے کے لئے بھی تم نے مناسب وقت منتخب نہیں کیا۔“

”ابھی چند لمحے قبل تم پختہ کار مرد معلوم ہو رہے تھے..... بالغ۔“ یوسف نے سرد لہجے میں کہا۔ ”اب بچہ بننے کی کوشش مت کرو۔ زندگی تمہاری اپنی ہے اور یہ کھیل بھی تمہارا ہے۔ دونوں سے جس طرح چاہو کھیلو۔ بس یہ یاد رکھنا یہاں اہمیت صرف ایک

جیاباب ہے۔

ان دنوں اس کی سوچ محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ صرف یہی سوچتا رہتا تھا کہ جینا میلکم کو کس طرح خوش کرے۔ جینا کو خوش رکھنے کا ایک طریقہ تو اس نے سیکھ ہی لیا تھا۔ وہ اسے پرانی عربی شاعری سنانا۔ فلسطین کے گیت سنانا۔ ان مقامات کی منظر کشی کرتا، جہاں بھی اس کے قدم نہیں پہنچے تھے۔ اسے یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ اس طرح اس طویل عمری پر جینا کا یقین پختہ ہوتا جا رہا ہے، جس کا یوسف نے جینا سے وعدہ کیا ہے۔

وہ ہر قصے کا آغاز اس طرح کرتا..... ”پرانے زمانے میں جب ہمارے اجداد۔“ یا ”ہمارے انتہائی قبیلے میں.....“ اور وہ ایسا صرف اس لئے کرتا کہ یہ الفاظ سن کر جینا کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک لہرائی۔ اسے مسرت کہہ لویا خواب، بہر حال وہ یہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ آنکھوں میں نظر آنے والی وہ چمک اس جگہ گاہٹ کا استعارہ ہے، جو جینا کے سینے میں چراغوں کی طرح لہریں لہاتی ہے۔

جینا میلکم کو خوش رکھنے کی اہمیت اتنی زیادہ تھی کہ وہ اسے پولینڈ میں روسیوں کے ان مظالم کی کہانی بھی نہ سنانا جو انہوں نے اس کے لوگوں پر توڑے تھے، جس کا نشانہ اس کے ماں باپ بنے تھے۔ وہ اسے اپنے دکھ اور اپنی محرومیاں نہ سنانا..... بلکہ ان خوش آئند خوابوں کو حقیقت کی طرح بیان کرتا، جو باپ سے..... اور پھر اکل نتھانل سے کہائیاں اور گیت سننے کے نتیجے میں اس کی آنکھوں میں بے تھے۔

جینا میلکم ہمیشہ سحرزدہ سی اسے بولتا دیکھتی رہتی۔

یوسف ایسے میں جینا کو بغور دیکھتا۔ جینا کے چہرے کا تاثر دیکھ کر اسے شدید خطرے کا احساس ہوتا۔ اسے ایسا لگتا، جیسے اس کی بچائی ہوئی بساط پر فتح کے بہت قریب کوئی اور قابض ہو گیا ہے اور اب وہ محض ایک تماشائی ہے۔

”پہلے جینا..... اور اب راحیلہ“ اس نے خود سے کہا ”زرا دیکھ کر میاں یوسف..... ہوشیاری سے۔ ورنہ یہ بالشت بھر کا لڑکا تمہیں کلین بولڈ کر دے گا۔ گارڈ چمک کرتے رہو۔“

کھڑکی سے باہر اندھیرے میں دیکھتے ہوئے اس کے خیالات کی رود اچانک راحیلہ کی طرف مڑ گئی۔ چشمہ اتارنے کے بعد وہ یکسر بدل جاتی تھی۔ اچانک احساس ہوتا تھا کہ اس کی آنکھیں بے حد حسین ہیں۔ اس کی جلد میں لطافت تھی۔ رنگت شہد کی یاد دلاتی تھی۔ درحقیقت اس کی بے پناہ خوبصورتی یوسف کو اپنی طرف کھینچنے کے بجائے پرے

سے پتھر کی طرح سخت یہ عورت، بین آنزک کے لئے تھوڑی سی پکھل گئی ہے۔ مرز اندر سے سسی..... تھوڑی سی سسی لیکن گلیشئر بھی تو اندر سے تھوڑا تھوڑا کر پکھلتا ہے۔

یوسف دیکھتا رہا تھا، اور اسے اس وقت تک خاموشی سے دیکھنا تھا جب تک سب کچھ اس کی اسکیم کی موافقت میں جا رہا تھا۔ اس کی اسکیم میں بین آنزک کی حیثیت صرف چارے کی سی نہیں تھی بلکہ وہ عناصر میں کیمیائی رد عمل جگانے والے مادے، حیثیت بھی رکھتا تھا۔ کامیابی کا انحصار جینا کے اس یقین پر تھا کہ بین آنزک کی رگوں میں صدیوں زندہ رہنے والے لوگوں کا خون دوڑ رہا ہے..... اور وہی اسے جو ہر حیات تک پہنچا سکتا ہے۔

یہ کامیابی حاصل ہونے کی صورت میں اس کے لئے دشواریاں پیدا ہو گئی تھیں۔ اسے ان دشواریوں سے لڑنا تھا۔ یہ خالص ٹیکنیکی مسائل تھے مگر مشینی نہیں تھے۔ بین آنزک کی اہمیت اجاگر کرنے کے نتیجے میں وہ خود پس منظر میں چلا گیا تھا۔ جینا میلکم کے ذہن پر یقیناً اس کے لئے غیر ضروری ہونے کا تاثر مرتب ہو رہا ہوگا۔ یہ خطرناک بات تھی۔ جینا ایسی عورت نہیں تھی، جو غیر ضروری بوجھ اٹھاتی۔ چنانچہ اب اسے اپنی اہمیت اور افادیت اجاگر کرنا تھی۔ بین آنزک کی شخصیت کے پیش منظر میں یہ بے حد دشوار کا تھا۔

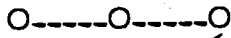
دوسری طرف بین آنزک کے لئے کھیل کی نوعیت ہی تبدیل ہو گئی تھی۔ وہ ہر مقصد بھول گیا تھا۔ اسے یہ خیال نہیں تھا کہ وہ آسائش کی اس چھت کے نیچے کیوں اور کیسے موجود ہے۔ دوسری طرف یہ بھی تھا کہ کاغذات کی موجودگی میں وہ بے وطن نہیں رہا تھا۔ فی الوقت اسے کوئی خطرہ بھی لاحق نہیں تھا۔ یوسف کے وعدے کے عین مطابق جینا میلکم نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ سب کچھ کر سکتی ہے۔ اس نے آزادی دلادنی تھی لیکن اس کے علاوہ بھی تو کچھ ہوا تھا اور اس کی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ جینا میلکم کے روپ میں اسے ماں مل گئی تھی۔

اس کے دل میں برسوں کی دہلی ہوئی محبت تھی، جسے کبھی باہر نکلنے کا راستہ نہیں ملتا تھا اور زندگی کی حقیقی خوشیوں سے محروم اس مضبوط اور سخت عورت میں وہی اوصاف تھے، جو خود اس میں بھی موجود تھے۔ اسے ایسا لگتا تھا کہ اگر وہ پولینڈ میں پیدا نہ ہوا ہوتا تو یقیناً ہندوستان میں بس جانے والی اس انگریز عورت کی کوکھ میں جنم لیتا اور ایسا ہی ہوتا

نہور میں راحیلہ کے اس لمحے کا عکس تھا، جب وہ بین آنرک کی بانہوں میں تھی اور ایک بالکل لڑکی نظر آ رہی تھی۔ اس لمحے اس نے فطرت کے ناقابل شکست تقاضوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ وہ سوچتا رہا کہ اس لمحے راحیلہ کی جو کیفیت تھی، اسے کیا کہا جاسکتا ہے؟ سپردگی؟ شاید نہیں۔

پھر اس نے سوچا کہ وہ سب کچھ کب تک برداشت کر سکے گا؟ خول تو اس کا بھی چن رہا تھا۔ خود غرضی اور مطلب پرستی کی تہوں سے چاہے جانے کی طلب جھانک رہی تھی۔

اس صورت حال میں فرار ہی بہتر تھا!



دو روز بعد جینا میکلم نے میکلم انٹرپرائز کے ذیلی ادارے بانیلکس ریسرچ کے ڈائریکٹر ڈیوڈسن کو اپنے دفتر میں طلب کیا۔ وہ بے حد خوش لباس اور بے فکر لگ رہا تھا۔ یوسف کو جینا کا سوال بے حد غیر متعلق معلوم ہوا۔ وہ اس کے لئے غیر متوقع بھی تھا۔

”فرض کر لو کہ ہم کامیاب ہو جاتے ہیں۔“ جینا میکلم نے کہا ”اس صورت میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کئی صدیوں تک، کئی نسلوں کے درمیان جینا..... اور زندگی گزارنا کیسا لگے گا؟“

یوسف کو فوری طور پر کسی بہت بڑی تبدیلی کا احساس ہوا۔ دہلی پتلی، عمر رسیدہ جینا میکلم، جس نے اپنی قوت ارادی اور مضبوط شخصیت کے زور پر ایک زبردست مالی مملکت قائم کی تھی، کسی بہت بڑی تبدیلی سے دوچار ہوئی تھی اور وہ تبدیلی راتوں رات رونما ہونے والی تبدیلی معلوم ہوتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ صبح اٹھتے ہی اچانک اسے احساس ہوا کہ رات کو سونے سے پہلے وہ جتنی بوڑھی تھی، صبح ہونے پر اس سے زیادہ بوڑھی اٹھی ہے، اور اس تبدیلی نے اسے خوف زدہ کر دیا ہے۔ یہ نہ سہی، کوئی نہ کوئی ایسی ہی بات تھی ضرور۔ کیا پتا اسے اپنے چہرے پر موجود جھریوں میں اضافہ محسوس ہوا ہو۔ اس کا انداز کسی پرانے زمانے کی ملکہ کا سا تھا، جس نے رات کو کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہو اور صبح ہوتے ہی اس کی وضاحت اور اپنی تسلی کے لئے شاہی جادوگر کو طلب کر لیا ہو۔

”اس صورت میں زندگی ایک ایسے شو کے مانند ہوگی، جو کبھی ختم نہیں ہوگی۔“ یوسف نے جواب دیا ”عام حالات میں زندگی ایک سنسنی خیز فلم کی طرح ہے۔ جیسے ہی

اس نے اس ناپسندیدگی کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی۔ شاید یہ اپنی ناکامی، محرومی کم زوری کا رد عمل تھا۔ عام طور پر مرد جس بنیادی کمزوری کا شکار ہوں، اسے عورتوں ہرگز قبول نہیں کرتے۔ جن عورتوں میں وہی کمزوری ہو، وہ ان سے بری طرح کھینچے برداشت کر ہی نہیں سکتے اسے۔ چنانچہ راحیلہ میکلم ڈیٹان کے لئے اس کی ناپسندیدگی تھی۔ راحیلہ ڈیٹان نے راحیلہ اور ڈیٹان میں حد فاصل کی حیثیت سے میکلم کا پیوند کر لیا تھا۔ کیوں؟ صرف تحفظ کی وجہ سے! وہ اپنے حسن سے بے نیاز ہو گئی تھی۔ اس فطری تقاضوں کو دبایا تھا۔ وہ اپنی خوشی سے ایک غبر، بد صورت اور زندگی سے محرومت سے وابستہ ہو گئی تھی..... یہ جانتے ہوئے بھی کہ زندگی سے محرومی بھی چھو کی بیماری ہے اور اڑ کر لگتی ہے۔ کس لئے؟ صرف اس لئے کہ اسے تحفظ درکار تہ تحفظ اور آسائشات کے عوض اس نے اپنی نسوانیت، اپنا عورت پن فروخت کر دیا تھا یہی مسئلہ اس کا اپنا بھی تھا..... تحفظ!

لیکن اور تمام معاملات میں اس کی نسوانیت مکمل تھی۔ وہ عورت تھی اور عورت نظر آتی تھی!

استدلال کی یہ کبھی عورت کے سوا اور کس مخلوق میں ہو سکتی ہے؟ ایک طرف تو اس سے نفرت کرتی تھی، اس سے خوف زدہ تھی کہ وہ ایک ایسا فراڈ آدمی ہے، جو اس ہستی کو دھوکا دے کر لوٹنا چاہتا ہے، اس کا خون چوسنا چاہتا ہے، جس سے اس کی وفاداری رشتہ ہے۔ دوسری طرف اس نے بین آنرک کو قبول کر لیا تھا، اس پر یقین رکھتے تھے..... اور کیا عجب، اس سے محبت کرتی ہو۔ کس قدر غیر منطقی رویہ تھا۔

اور یوسف طبعاً ایسا آدمی تھا، جسے اس طرح کے تضاد بری طرح کاٹتے تھے۔ بہار تو وہ ویسے ہی بے یقینی کی صورت حال سے دوچار تھا، جو اسے نروس کر رہی تھی۔ وہ خود کو غیر متوازن محسوس کر رہا تھا۔ ایسے میں راحیلہ کے رویے کا تضاد اس کے لئے بے حد حوصلہ شکن تھا اور اس کی خود اعتمادی کو بری طرح مجروح کر رہا تھا۔

اس نے سوچا، اس کا حل یہی ہے کہ بین آنرک کو لے کر یہاں سے نکل کھڑا ہو۔ اس نے پیکٹ سے ایک سگریٹ نکال کر سلگائی اور کھڑکی سے باہر اندھیرے میں جھانکتا رہا۔ اندھیرے کو دیکھ کر اس کے ذہن میں ہمیشہ مستقبل کا تصور ابھرتا تھا۔ نہ جانے وہ کتنی دیر اسی طرح بیٹھا رہا۔ آنکھیں کھلی ہوئی تھیں مگر وہ کچھ دیکھ نہیں رہا تھا۔ اس کے



زمین کے کسی خطے میں بھی ہو، آپ کی ملکیت ہوگی۔“  
ایسے انٹرویو کے موقع پر اسے ہمیشہ یہ لگتا تھا، جیسے وہ کسی جاں بہ لب مریض کو پانی  
شکر گھول کر دوا کے نام پر دے رہا ہو..... اس یقین دہانی کے ساتھ کہ یہ دوا اسے  
تباہ کر دے گی۔

جینا کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ آنکھوں میں آتش حیات کے شعلوں کا عکس نظر  
آ رہا تھا۔ وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی، جیسے کندھوں پر رکھے ہوئے عمر رفتہ کے بوجھ میں سے  
بک کئی برس کم ہو گئے ہوں۔ وہ تبدیلی، جو یوسف نے کمرے میں داخل ہوتے ہی  
دس کی تھی، ایک نکتہ معدوم ہو گئی۔  
’بڑی بی کو یہی جواب درکار تھا‘ اس نے دل ہی دل میں خود سے کہا، اب اس  
ب پر ایک تہ اور جملانی چاہئے۔“

”آخر میں یہ سب کچھ آپ کا ہو گا۔“ اس نے یقین دلایا۔ ”دولت دولت کو کھینچتی  
ہے۔ آدمی صرف موت سے ہار جاتا ہے۔ وہ قابو میں آ جائے تو بات ہی کیا۔ لوگ ختم  
ہوتے رہیں گے مگر آپ موجود ہوں گی اور آپ کی دولت ان کی دولت کو کھینچتی رہے گی۔  
ام کار سبھی کچھ آپ کا ہو گا۔“  
جینا میکلم کی آنکھوں کی چمک میں اضافہ ہوا۔ اس سے پتا چلتا تھا کہ وہ صحیح پٹری پر  
ہا ہے۔

”ٹیکس کی شرح بھی آپ کی دولت میں اضافے کی رفتار سے ہار جائے گی۔“ اس  
مزید کہا۔ ”آپ کی صدیوں پر محیط زندگی ساری دنیا کی دولت کو مقناطیس کی طرح اپنی  
بک کھینچ لے گی۔ ایسے جیسے سورج زمین کی ساری نمی چوس لیتا ہے۔ بینک میں موجود  
بٹ عددی اعتبار سے کہیں کے کہیں جا پہنچیں گے۔ انکم ٹیکس والے جاتے رہیں گے  
آتے رہیں گے۔ آپ اپنی جگہ موجود رہیں گی۔“

”ہاں، تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ جینا میکلم نے لذت آمیز سرگوشی میں کہا۔  
”سرمایہ برف کی گیند کی طرح لڑھکتا جائے گا اور اس پر سونے چاندی اور زرد مال  
تمیں چڑھتی جائیں گی۔ یہ بھی طے ہے کہ ایک وقت ایسا آئے گا، جب زمین پر موجود  
انسان آپ کا مقروض ہو گا۔ بچے بھی آپ کے مقروض پیدا ہوں گے۔ حکمرانی اور کسے  
تے ہیں؟ رعایا اور کیا ہوتی ہے؟“

جینا کسی سحر زدہ معمول کے سے انداز میں بیٹھی تھی۔ یوسف کی حیثیت ایک

آدمی اصل راز کو سمجھنے کے قریب پہنچتا ہے، کسی تاریک کونے سے موت اس پر چھڑ  
ہے، اور بس شو ختم۔ ہم کامیاب ہو گئے تو آپ کی حد تک ایسا نہیں ہو گا۔“

وہ وقت گزری کر رہا تھا، لفظوں کے ہیر پھیر سے کام لے رہا تھا کیونکہ وہ نہیں  
سمجھ پایا تھا کہ جینا میکلم کس موڈ میں ہے اور کیا سننا چاہتی ہے۔ اس کا تو کھیل ہی یہی تھا  
کہ جینا کی خواہش کے مطابق چلے..... چلنے کی اداکاری کرے..... وہ اس کی چاند  
پالنے کی بچکانہ خواہش سے کھیل رہا تھا۔ یہ کام اس وقت تک ضروری تھا جب تک  
تحقیق کے لئے فیلڈ ورک کا آغاز نہیں کرتا۔ ایک بار فیلڈ ورک شروع ہو گیا تو کوا  
دشواری نہیں رہے گی۔ وہ نہایت سکون سے یہ رپورٹس بھیجتا رہے گا..... ”ہم کامیاب  
کے بہت قریب پہنچ گئے ہیں۔“ وہ آس لگائے بیٹھی رہے گی، آس کا دامن کبھی نہیں  
چھوڑے گی..... اور آس اس کے لئے جوزف ڈیوڈسن کی بھیجی ہوئی رپورٹ کا  
ہو گا۔ فیلڈ ورک شروع ہونے تک اسے یہی بندر اور کیلے والا کھیل کھیلتا تھا۔ جہاں بندر  
نے بے چینی کا اظہار کیا، وہیں اسے ایک کیلا اٹھا دیا۔

اس کا خیال تھا کہ تحقیقی کام کی کامیابی کی امید جینا میکلم کو زندگی کے راستے پر کم از  
کم دس برس اور گھسیٹ جائے گی اور ان دس برسوں میں وہ خود شاہانہ انداز میں زندگی  
گزارے گا، لیکن جینا کو اس منزل تک لے جانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ قدم قدم پر  
تحیل کا بے دریغ استعمال کرنا پڑا تھا۔

”میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“ جینا میکلم نے کہا اور کرسی کی پشت گاہ سے ٹیک لگائی۔  
اس کی مٹھیاں بھینچ گئی تھیں، جس سے ہاتھوں پر ابھری ہوئی نیلی نیس اور ابھرائی تھیں۔  
اس وقت وہ بے حد ناتواں لگ رہی تھی۔ انسانوں کی طرح!

یوسف اب بھیجی ہوئی مٹھیوں کا مطلب خوب سمجھنے لگا تھا۔ وہ جینا میکلم کی حصول  
زندگی کی شدید طلب بلکہ ہوس کی علامت تھیں۔ چنانچہ اس بار جواب دیتے ہوئے اس  
نے نہ تو خود کو اندھیرے میں محسوس کیا اور نہ ہی اسے کوئی دشواری ہوئی۔ ”اس زمین پر  
آپ کی حیثیت ایک ملکہ کی سی ہوگی۔“ اس نے بلا جھجک کہا۔

جینا میکلم نے اپنی کرسی میں پہلو بدلا۔ اس کے انداز میں سکون سا جھلکا۔ یہ اس  
بات کا ثبوت تھا کہ یوسف کا جواب اسے پسند آیا ہے۔ وہ انداز اس بچے کا سا تھا، جو خود کو  
اپنی پسندیدہ کہانی سننے کے لئے تیار کر رہا تھا۔

یوسف نے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا ”باہر کی دنیا..... اور اس دنیا کی ہر چیز خواہ

بھینانے ہاتھ کے اشارے سے اسے خاموش ہونے کو کہا اور سر کی اٹبائی جنبش سے اشارہ کیا کہ وہ اس کی بات سمجھ رہی ہے۔ وہ ڈیک پر رکھے ہوئے چھوٹے ہائیکرو فون کی طرف متوجہ ہو گئی، جس کے ذریعے وہ پورے میکسم پٹیل میں کہیں بھی کسی سے بھی بات

یہ بھی ایک کمپلیکس تھا۔ وہ اور اس کے ڈیڑی ایک ہی تھے۔ ایک جان  
قالب..... اب اگرچہ میلکم کی موت کو مدت ہو چکی تھی مگر وہ جینا کے قالب میں  
بھی زندہ تھا۔

کر سکتی تھی۔ ”راحیلہ..... اور بین آئزک! تم جہاں بھی ہو فوراً میرے آفس! پہنچو۔ مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔“

چند منٹ بعد وہ دونوں مختلف دروازوں سے آفس میں داخل ہوئے۔ راحیلہ ہاتھ میں نوٹ پیڈ اور پنسل بھی تھی۔

جینا نے آئزک سے کہا ”لڑکے..... مسٹر ڈیوڈ سن نے بتایا ہے کہ اب تمہارے ان کے ساتھ فلسطین جانا ہو گا۔“

بین آئزک اس کی طرف بڑھا اور اس نے جینا کے گلے میں بانہیں ڈال دیر ”ٹھیک ہے ماں..... مگر میں آپ کے پاس واپس آؤں گا۔“ اس نے بے حد محبت کہا۔

یوسف، جینا میکلم کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ ان میں محبت کی چمک ابھری۔ اب لمحے کے لئے ان کی کرحقی دور ہوئی اور اس کی جگہ ایک اداس سی نرمی نے لے لی۔ ”مکلم نے پلکیں جھپکائیں اور انگلی سے بین آئزک کے رخسار کو نرمی سے چھوتے ہوئے کہ ”ممکن ہے“ تم واپس آئی جاؤ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ تم گھر پہنچ کر مجھے بھول جاؤ۔ گو پہنچ کر گھر سے برسوں کے پچھڑے کبھی لوٹ کر نہیں آتے۔ تاہم اس کی ضرورت نہیں، اس لئے کہ ہم تمہارے ساتھ چل رہے ہیں۔“

یوسف کو جینا کی بات سمجھنے میں کچھ دیر لگی..... اور جب اس کی سمجھ میں آ تو اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔

”میں اور راحیلہ..... ہم دونوں تم لوگوں کے ساتھ ہی چلیں گے۔“ جینا مزید کہا۔ اس بار وہ یوسف سے مخاطب تھی۔ ”اگر تم نے رواجی کے سلسلے میں اپنے پر کچھ انتظامات کئے ہیں تو انہیں منسوخ کر دو۔ اب تم جاؤ۔ اور راحیلہ! تم ذرا رکو۔ تمہیں ابتدائی انتظامات کے سلسلے میں ہدایات دیں گی۔“

کمرے سے نکلے ہوئے یوسف کے ذہن میں دو خیالات کلبلا رہے تھے..... ”دونوں میں سے کوئی ایک بھی اس کے لئے سکون بخش نہیں تھا۔ ایک تو یہ کہ جینا کی بات سن کر بین آئزک کے چہرے پر بے پناہ زردی کھنڈ گئی تھی..... اور دوسری چیز راج کے لبوں پر اچانک نظر آنے والی مسکراہٹ تھی۔

اس رات میکلم پیلس پر نسبتاً جلدی سکوت طاری ہو گیا۔ بین آئزک کا کہیں نہیں تھا اور راحیلہ بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ یوسف کے اعصاب چٹختے جا رہے تھے۔

اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑا تھا۔ ٹخلی منزل سے دلی دلی آواز سنائی دے رہی تھی، جہاں راحیلہ کا آفس تھا۔ لیکن یوسف کو کسی ان جانے خطرے کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ دبے قدموں بڑھا تاکہ ٹخلی منزل پر پہنچ کر ان آوازوں کے متعلق تفتیش کرے۔

اس کا اندیشہ درست ثابت ہوا۔ وہ دونوں وہاں موجود تھے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور یوسف انہیں واضح طور پر دیکھ سکتا تھا۔ وہ دونوں سر جوڑے بیٹھے تھے..... لیکن وہ کوئی روانوی انداز نہیں تھا۔ ٹیبل لیپ کی روشنی میں ان کے چہروں کی کشیدگی بے حد عیاں تھی۔ بین آئزک بے حد روانی سے گفتگو کر رہا تھا۔

یوسف آگے بڑھا اور دروازے تک پہنچ گیا تاکہ وہ گفتگو سن سکے۔ اگلا ہی لمحہ اس کے لئے زبردست صدمے کا باعث تھا۔ حالانکہ ایسا ہونا نہیں چاہئے تھا۔ بین آئزک اسے بچ رہا تھا۔

وہ چند لمحے دروازے پر کھڑا خاموشی سے سنتا رہا۔ اس کے نزدیک یہ کوئی معیوب حرکت نہیں تھی کیوں کہ جو کچھ کہا جا رہا تھا، وہ اسی سے متعلق تھا۔ اب اس کے سامنے اپنی بقا کا مسئلہ تھا، جس کے سامنے کسی چیز کی، کسی بات کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ پھر وہ آہستگی سے کمرے میں داخل ہوا اور اس نے تمام سوچ آن کر دیے۔ کرا ایک تخت روشنی میں نہا گیا۔

وہ تیزی سے آگے بڑھا اور اس نے تند لہجے میں کہا ”اور کل صبح مس میکلم کو کیا بتاؤ گے تم؟“

بین آئزک بری طرح اچھلا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اب وہ یوسف کے روبرو تھا۔ لیکن راحیلہ نے سنبھلنے میں حیرت انگیز تیزی دکھائی۔ اس کے انداز میں اس جواری کا سا اعتماد تھا، جس کے پاس تمام اہم پتے موجود ہوں اور جسے یقین ہو کہ وہ بازی جیت چکا ہے ”حقیقت سے تو میں بہت پہلے سے واقف تھی۔“ اس نے کہا ”اس کے باوجود میں نے تمہارے متعلق چھان بین کرائی۔ ثابت یہ ہوا کہ تمہارے بارے میں میرا ہر قیاس درست تھا اور اب بین آئزک نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔“

”مجھے معلوم ہے۔ میں نے اپنے کانوں سے سنا ہے۔“ یوسف نے خشک لہجے میں کہا۔

”جو کچھ سنا، پسند بھی آیا؟“ بین آئزک نے پوچھا۔ یہ بات نہیں کہ یوسف کو اس کی توقع نہ رہی ہو۔ اس کے باوجود اپنے خلاف ان

مجھے ایک گھر دیا ہے۔ انہوں نے مجھے انسان سمجھا ہے۔ شروع میں میں سمجھا تھا کہ اس طرح میں ان کی مدد کر رہا ہوں، انہیں خوشیاں دے رہا ہوں، وہ فرضی کہانیاں سنا کر، جن پر انہیں فوراً ہی یقین آ جاتا تھا۔ اب مجھے اندازہ ہوا کہ بات آگے جا چکی ہے۔ میں انہیں ایک فرضی کہانی کے زور پر در بدر نہیں پھرا سکتا۔ اور پھر راحیلہ کو حقیقت کا علم ہو گیا ہے۔ اب یہ معاملہ آگے نہیں بڑھ سکتا۔

”ہاں یہ تو ٹھیک ہے کہ راحیلہ کو حقیقت کا علم ہو گیا ہے۔“ یوسف نے کہا۔ وہ ٹکٹ خوردہ انداز میں کرسی پر ڈھس گیا۔ لیکن پھر اس نے بولنا شروع کیا۔ اس کی آواز دھیمی تھی اور لہجے میں پر فریب گرجوٹی تھی ”مجھے تمہارے ضمیر کی بیداری پر خوشی ہے بین آئزک۔ مجھے تم پر فخر ہے۔ اپنے ضمیر کو اور توانا کرو۔ کیونکہ یہ اس دنیا میں بہت بڑی نعمت ہے اور بہت کم یاب!“

”میرے ضمیر سے تمہارا کوئی تعلق نہیں۔“ بین آئزک نے تند لہجے میں کہا۔ ”ارے ہاں..... اور تمہیں اس سلسلے میں خاصا کام بھی کرنا پڑے گا۔ کسی دوسرے انسان کی تباہی پر اخلاقی بلندی کا مینار تعمیر کرنا آسان کام نہیں۔ اس کے لئے ضمیر سے زیادہ حوصلہ..... بلکہ ڈھٹائی کی ضرورت پڑتی ہے۔ صرف یہی نہیں، پتھر کا دل بھی چاہئے ہوتا ہے۔“

”تم اس کی باتیں مت سنو بین!“ راحیلہ نے چیخ کر کہا ”یہ لالچی، بدکردار اور بے رحم ہے۔ اس کی باتوں میں نہ آنا۔“

”ہاں.....“ یوسف نے قہقہہ لگا کر کہا ”میں لالچی بھی ہوں اور بدکردار بھی لیکن بے رحم نہیں۔ کیوں کہ اس کے لئے بے دل ہونا پڑتا ہے، اور خدا کا شکر ہے، میرے سینے میں پتھر بھی نہیں، خلا بھی نہیں، گوشت پوست کا دھڑکتا ہوا دل ہے۔“ اس نے سگریٹ سلگائی اور بین آئزک کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے بولا ”ذرا خود کو دیکھو اے شریف اور مثالی انسان۔ اور اس پر غور کرو کہ تمہارے اس اچانک پھولوں کی طرح بے داغ، پاک اور معصوم ہو جانے والے ضمیر کا اس عورت پر کیا اثر ہوگا، جس نے تم پر مہربانیاں کی ہیں اور جس کی محبت کا تم دعویٰ کر رہے ہو؟“

بین آئزک کا چہرہ تھمتھا اٹھا۔ اس نے کچھ کہنے کے لئے لب کھولے لیکن یوسف نے اسے کوئی موقع نہیں دیا۔ اب وہ اس پر پوری طرح سواری گانٹھنے کے موڈ میں تھا۔ ”جاؤ..... اور صبح مس جینا میلکم کے حضور جا کر اپنے گناہوں کا اعتراف کرلو۔ جب وہ

دونوں کے اتحاد نے اسے ہلا کر رکھ دیا۔ اس نے راحیلہ کو تو اپنا کھلا دشمن تسلیم کر لیا تو بدترین توقعات کے باوجود وہ بین آئزک کو اپنا شریک کار..... اپنا ساتھی سمجھنے نہ نہیں رہ سکا تھا۔

”اس کی پروا مت کرو کہ مجھے پسند آیا یا نہیں۔“ اس نے کاٹ دار لہجے میں ”اب ذرا تفصیل سے گفتگو ہو جائے۔ میں شروع کا حصہ نہیں سن سکا ہوں..... یہ کہ جینا میلکم کو کیا بتاؤ گے؟“ اس نے ہر کلف بالائے طاق رکھ دیا۔

”اگر سننا ہی چاہتے ہو تو سن لو۔ انہیں صاف صاف بتا دیا جائے گا کہ انہیں وقوف بنایا گیا ہے۔ وہ جان جائیں گی کہ تم بد معاش اور اچکے ہو اور میں پرلے در۔ بد دیانت اور جھوٹا ہوں، جو کبھی زندگی میں فلسطین کے قریب تک سے گزرا.....“

”نہیں بین! نہیں۔“ راحیلہ نے چیخ کر کہا۔ ”تم ایسے نہیں ہو۔ تمہیں اس برکایا تھا۔“

یوسف نے تیز نظروں سے اسے دیکھا اور نرم لہجے میں بولا ”ممکن ہے۔“ پھر بین آئزک کو گھورتا رہا۔ ”میں تمہیں سمجھ نہیں سکا لڑکے! میرا خیال تھا کہ تم میرا اشتراک سے خوش اور مطمئن ہو۔ پھر آخر ہوا کیا؟ یہ تبدیلی کیسی؟ کس چیز سے خوف ہو تم؟“

”یہ کسی چیز سے خوف زدہ نہیں۔“ راحیلہ نے تیز لہجے میں کہا۔

یوسف نے بھوہیں اچکا کر اسے دیکھا۔ گویا اتحاد حقیقی تھا۔

”جو..... یہ کھیل اب ختم سمجھو۔ ہم فلسطین میں..... میرا مطلب۔ اسرائیل میں مس میلکم کی موجودگی کے دوران اپنا بھرم تین دن بھی قائم نہیں رکھ سکا۔ سوچو تو..... انہیں پتا چل جائے گا کہ ہم نے انہیں پریوں کی کہانی سنا کر ہلایا تو ویسے بھی اب انہیں بے وقوف بنانے کی ضرورت نہیں۔ تم نے جیسا نقشہ کھینچا تھا کا..... وہ اس سے بالکل مختلف ہیں۔ اب صورت حال بدل چکی ہے جو!“

”اوہ..... صرف اس لئے کہ تمہیں شناختی کاغذات مل چکے ہیں۔ اب تمہیں کوئی خوف نہیں۔“ یوسف نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

لڑکے نے بغیر کسی پشیمانی کے سیدھے سے لفظوں میں جواب دیا۔ اس کے لہجے جذباتیت تک نہیں تھی۔ ”نہیں۔ اس لئے کہ میں ان سے محبت کرتا ہوں۔ انہوں۔

اچھی طرح جان گیا ہوں۔ تم صرف بزدل ہی نہیں، بھگڑی بھی ہو۔ تمہیں کبھی زندگی سے آنکھیں ملانے کی جرات نہیں ہوئی۔ تم حسین ہو، ذہین ہو، دلکش شخصیت کی مالک ہو، لیکن تم میں اتنی جرات بھی نہیں جتنی کسی کیمیکل کمپنی میں کام کرنے والی پیننگ گرل میں ہوتی ہے۔ تم نہ محبت کر سکتی ہو، نہ تمہیں کسی پر ترس آسکتا ہے کیوں کہ تم خود ترسی میں مبتلا ہو۔ تم نے خود کو ایک نارمل عورت بھی نہیں رہنے دیا۔ فطرت کو کچل ڈالا تم نے۔ تم تو صرف ایک خود غرض عورت ہو، جس نے تحفظ اور آسائش کی خاطر اپنے جسم اور اپنی روح دونوں کو گروی رکھوا دیا ہے۔ اور اس کے باوجود تم عدم تحفظ کا شکار ہو۔ کتنے گھائے کا سودا کیا ہے تم نے؟ جس تحفظ کے تصور کے لئے تم نے خود کو انسان سے مشین بنا ڈالا..... خود کو ختم کر دیا، وہ تمہیں خود بھی جھوٹا لگتا ہے.....

بین آئزک تیزی سے آگے بڑھا..... لگتا تھا، وہ کچھ کر گزرے گا۔ ”بس ج..... بہت ہو چکی۔“ اس نے نہایت برہمی سے کہا ”تم بہت کچھ کہہ چکے۔ اب اگر تم نے ایک لفظ بھی کہا تو میں تمہاری گردن.....“

”میری گردن توڑنے سے کچھ نہیں ہو گا بین!“ یوسف نے سرد لہجے میں کہا۔ وہ اپنی جگہ ڈٹا کھڑا تھا، جیسے کسی چیز سے خائف نہ ہو۔ تربیت یافتہ لڑاکے بین آئزک سے بھی نہیں۔ ”کچھ فائدہ نہیں بین، یہ جانتی ہے کہ میں درست کہہ رہا ہوں۔ یہ سب کچھ سچ ہے۔“

لیکن اتنی دیر میں راحیلہ خود کو سنبھال چکی تھی۔ اس نے سرد لہجے میں کہا ”میرے بارے میں تمہاری رائے علم نفسیات کی کتابوں میں چھپنی چاہئے۔ لیکن اس کے باوجود تم نے ایک بوڑھی عورت کو بے وقوف بنا کر اسے لوٹنے کے لئے جو نائنک رچایا تھا، اسے ختم سمجھو۔“

”ہوش کے ناخن لو لڑکی!“ یوسف کا لہجہ زہریلا تھا۔ ”تمہیں اس بات کی فکر نہیں کہ جینا میکلم میرے ہاتھوں بے وقوف بن کر چند لاکھ روپوں سے محروم ہو جائے گی۔ اس لئے کہ اس سے جینا کی دولت میں کوئی کمی واقع نہیں ہو سکتی۔ بات یہ نہیں۔ تمہیں پڑنا ہے کہ کیس میری ریسرچ کا کوئی مثبت نتیجہ نہ نکل آئے۔ میں جینا میکلم کو زندہ رکھنے کی کوشش کر رہا ہوں، جبکہ تم اسے مردہ دیکھنا چاہتی ہو۔“

راحیلہ کا چہرہ یوں سپید پڑ گیا، جیسے کسی نے اس کے جسم سے خون کا ایک ایک قطرہ ہٹا لیا ہو۔

تمہاری آنکھوں کے سامنے ٹوٹ کر بکھرے تو اپنے اس ضمیر کو..... اپنی حق کو چکارنا۔ تم اس عورت کے بے ضرر یقین کو تباہ کر دو..... اس سے اپنی عمر طبعی زیادہ جینے کی معصوم خواہش چھین لو۔ اس کے آنسو دیکھنا۔ اسے کپچی کپچی ہونے اور ممکنہ طور پر اسے اپنی آنکھوں سے موت سے پہلے مرتے دیکھنا اور پھر اپنے غیر لپٹ کر کنایاں قاتل نہیں ہوں۔ مجھے اس میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔“

”تم شیطان کے چیلے ہو۔ کس قدر فضول اور لغو باتیں کر رہے ہو!“ راحیلہ برہمی سے کہا ”صرف اس لئے کہ بین آئزک، مس میکلم کے رو بہ رو تمہارے اور مشترکہ جھوٹ کا اعتراف نہ کرے۔ لیکن تم بھول رہے ہو کہ اگر یہ مس میکلم نہ نہیں پہنچائے گا تو یہ کام میں کروں گی۔ میرے ضمیر پر ایسا کوئی بوجھ نہیں..... یہ وجود میں ایسا کوئی زہر نہیں، جس کا تم فائدہ اٹھا سکو۔ مجھے تو مدت سے اس موقع کا انتظار تھا۔“

”ہاں، میں یہ بات جانتا ہوں۔“ یوسف نے جواب دیا۔ ”تمہیں مدت سے موقع کا انتظار تھا۔“

راحیلہ نے چبھتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا ”کیا مطلب ہے تمہارا؟ میں تم؛ آدمی سے مس میکلم کا پیچھا چھڑانے کا یہ موقع ہرگز ضائع نہیں کروں گی..... بالخصوص اس صورت میں کہ میرے پاس بین آئزک جیسا گواہ موجود ہے۔ تم مجھے روک سکتے ہو نہیں، میں تمہیں نہیں روک سکتا۔ تم آپ ہی خود کو روک لو گی۔“

”میں خود کو روک لوں گی؟ یہ خیال تمہیں کیسے آیا؟“

”وہ اس لئے کہ تم بزدل ہو مس راحیلہ میکلم ڈیٹان۔“ یوسف نے بے حد سکو سے کہا ”تم جینا میکلم کو پہلے ہی دن مجھ سے بیش کے لئے محفوظ کر سکتی تھیں۔ تب صرف اتنا کرنا تھا کہ مجھے میکلم پپلس سے نکال دیتیں لیکن تم نے ایسا نہیں کیا، اس لئے تم میں جرات ہی نہیں تھی۔ میں نے تمہاری کمزوری سے فائدہ اٹھایا..... اور تم خود زندہ ہو گئیں کہ تمہاری ملازمت جاتی رہے گی۔ تمہیں بیش..... ہر وقت..... لمحے ہی خوف رہتا ہے۔“

”یہ سچ نہیں ہے!“ راحیلہ نے چیخ کر کہا۔ پھر اسے احساس ہو گیا کہ اس کا اندام مدافعت ہے۔

یوسف نے ایک لمحے اسے بہت غور سے دیکھا اور بولا ”یہ سچ ہے۔ میں نہیں

کہا۔ جبکہ حقیقی صورت حال بہت مخدوش ہے۔ جو کچھ ہم کر چکے ہیں، اسے لوٹا نہیں سکتے۔ بات بہت آگے جا چکی ہے۔“

راحیلہ نے کہا۔ ”میری تو کچھ سمجھ میں ہی نہیں آ رہا ہے۔“ اس نے دروازے سے دھکیلا اور اپنی آنکھیں خشک کرنے لگی۔

یوسف آگے کو جھک آیا۔ ”دیکھو..... جینا کو نہ جوانی کی آرزو ہے نہ حسن کی، انہیں اب حیات کی آرزو ہے۔ وہ تو اپنی دولت کو تحفظ دینے کے لئے زندہ رہنا چاہتی ہیں۔ اب مجھے بتاؤ کہ معجزوں کی اس سرزمین پر کیا یہ ناممکن ہے کہ ان کی مدد کی کوئی دلت نکل آئے؟ یہ تم لوگ یقین سے تو نہیں کہہ سکتے تھے۔ میں تو کہتا ہوں کہ ہماری اشیاء جینا کی زندگی بڑھا دے گی۔ ہمیں ان کی خاطر کوشش بہر حال کرنی چاہئے۔“

”میں انہیں خود ان سے بچانا چاہتی تھی۔“ راحیلہ نے بین آئزک سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”وہ بیمار ہیں۔ میرا مطلب ہے، ان کی روح.....“

بین آئزک نے کوئی جواب نہ دیا۔ یوسف کی منطق نے اسے ہلا دیا تھا۔ اب اسے ماس جرم ستا رہا تھا۔ جینا میکلم کی امیدیں راسخ کرنے میں سب سے بڑا ہاتھ تو اسی کا تھا۔ وہ جو گیت اور قصے کہانیاں اسے سناتا رہا تھا، انہوں نے ہی جینا کو ابدیت کے راستے پر لے لیا تھا۔

یوسف نے اپنی بات جاری رکھی، جیسے مداخلت ہی نہ ہوئی ہو۔ ”تم انہیں خود ان سے نہیں بچا سکتیں۔“ اس نے راحیلہ کی بات کا جواب دیتے ہوئے بات آگے بڑھائی ”سو بہترینی ہے کہ انہیں خوش رکھنے کی کوشش کرو۔ وہ اب صرف طویل عرصے تک رہنے کی ہی خواہش کی اسیر نہیں، ان کے دل میں بین آئزک کی محبت بھی گھر کر گئی ہے۔ بین اب ان کے لئے بیٹے کی طرح ہے۔ اب ہمارے لئے پیچھے ہٹنے کی گنجائش نہیں ہے تو بڑھا جاسکتا ہے۔ ان سے کچھ مت کہو۔ ہمارے ساتھ اسرائیل چلو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ وہاں پہنچنے کے بعد ان کے مقصد کے حصول کے لئے ان تھک کوشش کروں گا۔ بولو منظور ہے؟“

”بین آئزک، بولو کیا کریں؟“ راحیلہ کے لہجے میں التجا تھی۔

ادھر عمر لڑکا خود اذیت میں تھا۔ احساس جرم اس کے ذہن سے چٹ کر رہ گیا تھا۔ مسلسل کچے لگا رہا تھا۔ ”میرے خیال میں ہمارے سامنے کوئی اور راستہ ہے ہی نہیں انتخاب کا سوال اٹھے۔“ اس نے بے بسی سے کہا۔ وہ خود کو جذلوں، خواہشوں اور

یوسف نے اس بار اور گمراہی کا لگایا۔ ”تم سمجھ رہی ہو؟ میں تمہارے چہرے پر تحریر پڑھ سکتا ہوں۔ رات کو اپنے کمرے کی تنہائی میں، جہاں تمہیں کوئی نہیں دیکھ سکا، اپنے بستر پر لیٹ کر سوچتی رہتی ہو کہ آخر دولت اور حقیقی تحفظ کے حصول کے لئے تمہیں کب تک انتظار کرنا پڑے گا۔ تم نے اپنی جوانی درحقیقت اس امید کے فروخت کی ہے کہ جینا کے مرنے کے بعد تمہیں ترکہ ملے گا..... اور ہمیشہ کے تحفظ کا احساس۔ اور اب تمہیں موقع مل گیا ہے۔ تم جانتی ہو، یہ حقیقت جینا میکلم کو کہ ہم اسے دھوکا دے رہے تھے، اسے شوٹ کرنے کے مترادف ہو گا۔ وہ اس وار پانچ نہیں سکے گی۔ یوں تم اسے اس طرح قتل کر دو گی کہ کوئی تمہیں اس کا قاتل قرار نہ دے سکے گا۔ یہ سچائی کا خنجر ہے، جسے تم بڑی آسانی سے اس کے دل میں گھونپ کر ڈال سکتی ہو۔ وا..... کیا بے داغ قتل ہو گا یہ۔ دامن پہ کوئی چھینٹ نہ خنجر کا داغ۔ تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو۔“

راحیلہ اور بین آئزک پتھر کے مجسموں کی طرح ساکت تھے۔ خاموشی اتنی گہری تھی کہ اس پر موت کا گمان ہوتا تھا۔ سانس تک کی آواز نہیں تھی۔



راحیلہ نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپا اور بچوں کی طرح ہلکے ہلکے گئی۔ بین آئزک بیٹھا بے بسی سے ہاتھ مل رہا تھا۔

”میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ حقیقت یہ ہے۔“ یوسف نے کہا، ”میں بتا رہا ہوں کہ لوگ یہی سمجھیں گے۔“

اس صورت حال میں مدد اس سمت سے آئی، جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ بین آئزک اٹھا اور جا کر راحیلہ کی کرسی کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ راحیلہ کا ہاتھ تھام لیا۔ ”تم اس کی باتوں پر یقین نہ کرنا۔ لیکن اس کی ایک بات ہے۔ ہم اب جینا مال کو حقیقت نہیں بتا سکتے۔ بہت دیر کر دی ہم نے۔“

یوسف موقع ضائع کرنے کا قائل ہی نہیں تھا۔ ”اب تم نے کی ہے سمجھ دا بات۔“ اس نے جلدی سے داد دی۔ اس کا لہجہ نرم تھا لیکن اس میں زور بھی تھا۔ ”دیکھو۔ ہم سب ایک ہی کشتی میں سوار ہیں۔ راحیلہ تم، بین آئزک، میں اور جینا۔ سمجھنے کی کوشش کرو کہ اب واپسی کا کوئی سوال نہیں۔ دیکھو، اگر جینا بہت زیادہ سخت ہوتی اور اس بچ کو جھیل بھی جاتی تو آئندہ کبھی تم پر..... بلکہ کسی پر بھی بھروسہ



آئندہ کے لئے بغاوت کا امکان ختم کر دیا تھا اور دوسرے اپنی کھوئی ہوئی اہمیت حاصل کر لی تھی۔ حیرت انگیز بات تھی کہ جس چیز سے اسے ڈرایا جا رہا تھا، اب مستقبل میں ضرورت پڑنے پر وہ اسی کے زور پر ان دونوں کو دھمکا سکے گا۔ یعنی جینا میلکم کو حقیقت بتانے کی دھمکی دے کر، لیکن اسے یقین تھا کہ اس کی نوبت نہیں آئے گی۔

مگر اپنے کمرے میں پہنچ کر اسے حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک عجیب سی اداسی نے بے اس کے دل کو اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ اندر جیسے اداسی کی کمراتر آئی تھی۔ دھنچ جانے کہاں جا سویا تھا۔ وہ ایک کرسی پر ڈھس گیا۔ اس نے پاؤں پھیلا لئے۔ دڑی سینے سے جا لگی۔ وہ سوچ رہا تھا۔ کیسی فتح ہے یہ اور میں کیسا آدمی ہوں۔ میں ان افراد کو تباہ کر رہا ہوں، جن کی میں نے پروا کی ہے۔ ان سے پہلے تو کبھی کسی کی پروا ہی نہ تھی مجھے۔ واہ..... کیسا زبردست آدمی ہوں میں.....!



تین دن بعد وہ امریکا کے لئے روانہ ہو گئے۔

واشنگٹن میں قیام کے دوران یوسف کو صحیح معنوں میں جینا میلکم کے اثر و رسوخ کا اندازہ ہوا۔ وہ تو واقعی اب بھی ملکہ ہی کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس کی وجہ سے اسے اور آئزک کو بہت جلد گرین کارڈ مل گیا۔ پھر پاسپورٹ بنے۔ ویزے لگنے میں بھی کوئی تاخیر نہیں ہوئی۔

اور اس وقت یوسف حیفہ میں ہوٹل میگیڈو میں اپنے سوئٹ کی ٹیرس سے پھولوں، روش کو دیکھ رہا تھا۔ وہ بے حد خوشگوار موڈ میں تھا۔ وہ دل ہی دل میں خود کو مبارکباد دے رہا تھا۔ وہ خوش تھا کہ اس کی ذہانت رنگ لائی تھی۔ اب وہ بادشاہوں کی سی زندگی گزار رہا تھا۔ ابھی چند ماہ پہلے قاتلوں کی نوبت آچکی تھی لیکن اب.....

وہ سان فرانسسکو سے ایک چھوٹے بحری جہاز میں روانہ ہوئے تھے۔ وہ جہاز خاص پر جینا میلکم کے لئے بک کرایا گیا تھا۔ جہاز پر ان کے لئے جیپس، کاریں، لگژری رزائے آلات اور وہ تمام ضروری سامان تھا، جس کی ماہرین آثار قدیمہ کو کسی تحقیقی مہم دوران ضرورت پڑ سکتی ہے۔

سفر کے دوران کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا۔ راحیلہ کا انداز ایسا تھا جیسے وہ اختلافات بھلا چکی ہے۔ لیکن یوسف کو کوئی خوش فہمی نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس راحیلہ کو جس انداز میں اپنی سازش میں شریک کیا ہے وہ اسے کبھی نہیں بھولے گی۔

پچھتاووں کے ایسے جال میں پھنسا محسوس کر رہا تھا، جس سے نکلنے کا موہوم سا راہ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن ساتھ ہی وہ پیدائشی فائٹر تھا۔ موہوم ترین امید کی بنیاد پر منصوبے کی عمارت کھڑی کر سکتا تھا اور وہ موہوم ترین امید یوسف نے ایک طرح اسے سوچ دی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ انبیاء کی سرزمین پر معجزہ رونما ہونا بات نہیں۔ وہ خود جھوٹا تھا لیکن خدا کی عدالت میں واقعی شادقوں کی بنیاد پر فیہ سنائے جاتے۔ وہ تو نیتوں کو جانتا ہے اور ان کی بنیاد پر آدمی کو بخشا ہے۔ کون جا میں سے کسی کی نیت کی سچائی خدا کی رحمت کو پکار بیٹھے اور خدا کی رحمت جوڑ جائے تو جینا کے لئے سو پچاس سال کی اضافی مہلت عطا ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں ”ہاں بھی..... بولونا۔“ یوسف نے راحیلہ سے کہا۔

راحیلہ سوچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ یوسف نے جس طرح صورت وضاحت کی تھی، اس میں تو کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا، کوئی متبادل صورت نہیں فراڈ کو موقوف کرنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ لیکن راحیلہ کو احساس ہو رہا تھا کہ یو منطق میں کہیں نہ کہیں کوئی جھول ہے، کہیں نہ کہیں یوسف نے اپنی فطری ذریعے کسی حقیقت کو منطق کے زور پر مسخ کیا ہے، لیکن وہ اسے تلاش نہیں کر پائے دوسری طرف اسے ایک اور جھکا لگا۔ اس احساس کے ساتھ اس کے اندر سانسوں اور طمانیت گھر کر گئی تھی کہ ان کا اشتراک ختم نہیں ہو رہا ہے.....! رہے گا اور یہ کہ اب سب کچھ پہلے ہی جیسا ہو جائے گا۔ وہ اسرائیل جانے کی میں لگ جائیں گے۔ اب وہ سوچ رہی تھی کہ کیا وہ واقعتاً اتنی ہی بزدل ہے، جتنا نے زور بیان کے ذریعے ثابت کیا ہے یا کہیں کوئی اور گڑبڑ ہے، جس وجہ سے شخص کا شکار بنی ہے..... اس کے ہاتھوں کھلونے کی طرح استعمال ہوئی ہے؟ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے جو۔“ بالآخر وہ بولی۔

”اس کا مطلب ہے کہ تم رضامند ہو۔“ یوسف نے جلدی سے کہا ”بہت اب ہم سب سکون سے سو سکیں گے۔ چاہو تو اس سلسلے میں مزید گفتگو کل صبح ہو گی۔ اس وقت تک تم بے فکر رہو اور سب مجھ پر چھوڑ دو۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھا اور کر دیکھے بغیر رخصت ہو گیا۔ وہ دونوں خاموش بیٹھے اسے جانا دیکھتے رہے۔ اس نے کارڈور عبور کیا۔ زینوں پر چڑھتے ہوئے اس کا سینہ احساس فتح سے گیا۔ اس مختصر سی جنگ سے اس نے اپنے لئے دو مثبت نتائج حاصل کئے تھے۔

بڑی بی کی طرف سے کوئی پریشانی؟“

”نہیں۔ بین آئزک..... وہ غائب ہے۔ میں نے روم کلرک سے معلوم کیا تھا اس سے پتا چلا کہ بین آئزک رات کرا خالی کر گیا ہے۔ اپنا بیگ وہ ساتھ لے گیا ہے۔ اس نے کوئی پیغام بھی نہیں چھوڑا۔“ راحیلہ نے ایک ہی سانس میں یہ سب کہہ دیا۔ پھر بولی ”مجھے ڈر لگ رہا ہے جو۔ اب ہم کیا کریں گے؟“

یوسف نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ سوچ رہا تھا، کیا کامیابی کی حدود میں داخل ہونے کے بعد بھی یہ بلبلے کی سی کیفیت رہتی ہے؟ بلبلہ اچانک ہی پھوٹ جاتا ہے۔ ابھی ایک لمحہ پہلے محسوس ہو رہا تھا کہ دنیا میرے قدموں کے نیچے ہے اور اب.....؟ اب ایسا لگ رہا ہے کہ کسی نے زمین قدموں کے نیچے سے کھینچ لی ہے۔ اس احساس سے بھی اسے زیادہ طمانیت نہ ملی کہ اس کے اور راحیلہ کے درمیان ایک نئے تعلق کا آغاز ہو رہا ہے۔ وہ اس سے سہارے کی طلب گار تھی..... اس پر انحصار رہی تھی۔ ”ہم کیا کر سکتے ہیں؟“ بالآخر اس نے دھیمی آواز میں کہا ”لڑکا کا غائب اور شاید لعل ختم۔“ دل میں اس نے کہا۔ ”بسمی کچھ ختم سمجھو۔“

کچھ دیر خاموشی رہی۔ دونوں اپنے اپنے طور پر کچھ سوچتے رہے۔ پھر یوسف ہی نے لب کشائی کی۔ ”جینا کو معلوم ہے یہ بات؟“

راحیلہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں۔ لیکن یہ بات زیادہ دیر تک چھپی تو نہیں رہے۔ دوپہر کے کھانے پر وہ یقیناً اسے پوچھیں گی اور پھر انہیں بھی معلوم ہو جائے گا۔“ اس نے ایک لمحے توقف کیا پھر پوچھا ”جو..... آخر کیوں؟ وہ ہمیں اس طرح کیوں چھوڑ لیا؟“

یوسف نے متعجب نگاہوں سے اسے دیکھا۔ ”مذاق کر رہی ہو؟ اس نے وہی کیا؟ جو سے کرنا چاہتے تھے۔ اگر میں کامیابی کے نشے میں خود ستائی میں مصروف نہ ہوتا تو مجھے غمازہ ہو گیا ہوتا کہ اب یہی ہونے والا ہے۔ میں سمجھ رہا تھا کہ میں اسے چت کر چکا ہوں مگر اب وہ الٹا مجھے چت کر گیا۔ دیکھو..... سوچنے کی بات ہے۔ اسے جس چیز کی ضرورت تھی، مل گئی۔ کاغذات، پاسپورٹ اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ اسرائیل پہنچ لیا۔ اب اسے کیا پڑی تھی کہ ہمارے درد سر میں شریک ہو۔“

راحیلہ نے پلکیں جھپکا کر اپنے آنسو روکنے کی کوشش کی۔ ”لیکن اسے مس میکلم سے ملنے کی سی محبت.....“

البتہ ایک بات خوش آئند تھی۔ راحیلہ کی فطرت کا عملی پہلو یوسف کے نقطہ نظر کا آمد تھا۔ اسی کی وجہ سے اب جبکہ وہ اس کی حلیف بن چکی تھی تو اس نے اس حقیر کو قبول بھی کر لیا تھا۔ بین آئزک بھی ٹھیک ٹھاک جا رہا تھا۔

یوسف کا منصوبہ بے حد سادہ تھا۔ ابھی اس کے منصوبے کی جزئیات مکمل نہ تھیں۔ اب اس کا انحصار جینا میکلم کے رد عمل پر تھا۔ قوی امکان یہ تھا کہ مقدس سرزمین کی کشش اور اس کے اسرار مل کر اس کے وجود میں نئی روح پھونک دیں گے۔ مشن کامیابی پر اس کا یقین اور پختہ ہو جائے گا۔ طویل زندگی کی امید اور جاں فزا ہو جائے گا ابھی یہاں آئے صرف دو دن ہوئے تھے اور جینا کے چہرے پر رونق بڑھ گئی تھی۔

یوسف نے سوچا تھا کہ سرزمین بیت المقدس کے مظاہر دکھا کر جینا میکلم کے یقین پکا کرنے کے بعد وہ اسے وطن واپس جانے پر رضامند کرے گا۔ اتنی بڑی کاروباری ملک کو اس کے حال پر تو نہیں چھوڑا جاسکتا تھا۔ جینا کی وہاں موجودگی بہت ضروری تھی۔

اپنی کارکردگی پر خوش اور مطمئن یوسف نے اپنے لائحہ عمل کو ذہن میں پھر کیا۔ راحیلہ کو اس نے شکار کر لیا تھا، جال میں پھنسا لیا تھا۔ بین آئزک، جینا میکلم کی وجہ سے اسے خاموش رہنے پر مجبور تھا۔ یوسف کو یقین تھا کہ اب جینا اپنی وصیت میں آئزک کو ہر حال میں شامل کرے گی۔ اس نے سوچا، بین آئزک سے اپنے سے متعلق بات ابھی کر لی جائے۔ دلیل اس کے پاس موجود تھی۔ اسکیم اس نے سوچی تھی، عمل بھی اس نے کیا تھا۔ ورنہ بین آئزک خواب میں بھی جینا کے قریب نہیں ہٹتا تھا۔ اس اعتبار سے وہ کم از کم نصف کا حق دار تھا۔

آخری خیال بے حد طمانیت بخش تھا۔ صورت حال پوری طرح اس کے قابو میں تھی۔

کمرے میں فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے سوچا، یہ بین آئزک ہو گا۔ گزشتہ رات سے اب تک اس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اس نے اندر جا کر کال ریسیو کی۔ دوم طرف راحیلہ تھی۔ اس کے لہجے میں پریشانی تھی۔ ”جو..... فوراً نیچے آ جاؤ۔ میں کا ٹیل بار میں ہوں۔“

”ٹھیک ہے، میں ابھی آیا۔“ یوسف نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔ وہ نیچے سنسان لاؤنج میں پہنچا، راحیلہ ایک گوشے میں بیٹھی نظر آئی۔ وہ پریشان رہی تھی۔ اس وقت صبح کے دس بجے تھے۔ ”کیا بات ہے راحیلہ؟“ اس نے پوچھا

”کہا ہو سکتا ہے، جلد ہی میں تمہیں خوشخبری سناؤں۔“

○-----○-----○

اس معاملے کے آغاز کے بعد سے اب تک یہ پہلا موقع تھا کہ یوسف خود کو ملت کے بہت قریب محسوس کر رہا تھا۔ اس کے انداز میں رجائیت کے بجائے قنوطیت تھی۔ اسے احساس تھا کہ بین آئزک کو ڈھونڈ نکالنا آسان کام نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ اس کا انداز نیم دلانہ تھا۔ یہ کام اسے تنہا کرنا تھا..... اور پہلی بار اسے تنہا ہونا برا لگ رہا تھا۔ وہ خود کو دشمنوں میں گھرا محسوس کر رہا تھا۔ اب پہلی بار اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ سلطان ہے اور یہودیوں کے ملک میں ہے۔ لوگ اجنبی، زبان نامانوس..... بس ایک حارس تھی کہ وہ بیت المقدس میں ہے۔ مسلمانوں کی وہ مقدس سرزمین، جس پر یہودیوں نے غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے۔ اس خیال کے ساتھ ہی اس کے اندر عجیب سا دغلی جذبہ امنڈتا تھا، جسے وہ پوری طرح سمجھ بھی نہیں پاتا تھا۔

اسے احساس تھا کہ بین آئزک کو ڈھونڈ نکالنے کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔ ابھی وہ کوشش کر رہا تھا کیونکہ یہ ضروری تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ناکامی کی صورت میں خود کو یہ الزام دیتا نظر آئے کہ اس نے کوشش نہیں کی..... ہاتھ پیر نہیں مارے۔ ابچھٹائے پالنے کا قائل نہیں تھا۔

وہ باہر نکلا تو زبان کی رکاوٹوں نے اسے ہراساں کر دیا۔ اسرائیل میں سرکاری زبان برائی کے علاوہ کئی اور زبانیں بولی جاتی تھیں۔ انگریزی، ہولنوں اور شاہنگ سینٹرز تک غدد تھی۔ پورے دن کی خواری کے بعد اسے صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ بین آئزک کے لئے کے ایک شخص کو گزشتہ رات قتل ایبیب جانے والی بس میں سوار ہوتے دیکھا گیا ہے۔ ابھی یہ یقین نہیں تھا کہ وہ بین آئزک ہی ہوگا۔ اسرائیل میں بین آئزک جیسے بہت تھے۔

قتل ایبیب پہنچ کر بین آئزک کے ملنے کی رہی سہی امید بھی ختم ہو گئی۔ وہاں تو اس کے لئے کسی چھوٹے سے ہوٹل میں اپنے لئے مناسب کمر لیتا بھی مسئلہ بن گیا۔ راستے سے معلوم نہیں تھے اور اپنا مافی الضمیر واضح کرنا بہت ہی بڑا مسئلہ تھا۔ اسے ابتدا ہی میں غمازہ ہو گیا کہ ۳۵ لاکھ کی آبادی کے اس شہر میں بین آئزک کو تلاش کرنا ممکن نہیں، یہ لگ بات کہ اتفاقاً کہیں اس سے سامنا ہو جائے۔

پھر بھی وہ مزہ ایک دن (دو دن) رکھا۔ اس نے مارکر، اسٹریٹ کے تمام بڑے بڑے

”محبت تو اسے تم سے بھی تھی!“ یوسف نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔ ”وہ؟“ بھی چھوڑ گیا۔ سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اب اسے جینا میلکم کے سامنے بچ بولنے عذاب سے نجات مل گئی۔ ایسے لوگ ترجیحات کا تعین اسی طرح کرتے ہیں..... بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔ دوسری بات یہ کہ اسے اندیشہ رہا ہو گا کہ میں اسے ڈبل کر اس کروں گا۔ سو اس نے اس سے پہلے ہی کام دکھا دیا۔“

”تو سب کچھ ختم ہو گیا۔ ہے نا؟“

یوسف نے کوشش کر کے خود کو سنبھالا ”ایسی کوئی بات نہیں۔“ اس نے لہجے زور پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ”تم کسی طرح فی الحال جینا کو بھلائے رکھو۔ انہیں پتا ہم ایک اہم سراغ کا پیچھا کر رہے ہیں۔ اگر انہیں یہ معلوم ہو کہ میں اور بین آئزک ساتھ ہیں تو کم از کم چند روز تو وہ بے فکر رہیں گی۔ میں اسی دوران میں بین کو تلاش کرنے کی کوشش کروں گا۔“

راجیلہ تنگی سے ہنسی۔ ”میرا تو خیال ہے کہ اب تم بھی فرار ہو جاؤ گے!“ اس آنکھوں میں مایوسی تھی۔

یوسف چند لمحوں سے بغور دیکھتا رہا۔ اب تک تو یہ خیال اس کے ذہن میں نہ آیا تھا لیکن سچ یہ ہے کہ خیال برا نہیں تھا۔ اس نے راجیلہ کے ہاتھ کو تھپتھپاتے ہوئے کہا ”یہ ناممکن نہیں لیکن تم فی الوقت ایسا مت سوچو۔“ پھر اچانک اس کا موڈ خراب ہو گیا۔ ”کاش“ اس ضبیث لڑکے نے میرے نام کوئی رقعہ ہی چھوڑ دیا ہوتا۔ چاہے اس نے لکھا ہوتا..... جوزف ڈیوڈسن، اب تم جہنم میں جاؤ۔ مجھے جنت مل گئی ہے۔“

”تو تمہیں بھی اس کی پروا تھی۔ زیادہ نہ سہی، بہر حال تھی۔“ راجیلہ نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ یوسف نے کوئی جواب نہ دیا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی ”گڈبائے جو۔“ یوسف نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”تمہیں میرے بھاگنے کا کتنا ہی یقین سہی لگ مشورہ ہے کہ گڈبائے کے بجائے ”پھر ملیں گے“ کہہ کر رخصت ہو۔“ اس نے نرم لہجے میں کہا۔

”سب بیکار باتیں ہیں۔“ راجیلہ نے شکستہ لہجے میں کہا ”تم خود کہہ چکے ہو کہ عقل مندی اسی میں ہے۔“

”جب تک ذرا سا امکان بھی موجود ہو، میں بھاگنے کا قائل نہیں۔“ یوسف نے کہ اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ ”اور اپنے اعصاب پر قابو رکھنا بی۔“ اس نے پلٹ کر

ہوٹل کھال ڈالے، ساحلوں کے چکر لگائے۔ پھر اسے خیال آیا کہ لڑکا کہیں فوج بھرتی نہیں ہو گیا۔ امریکا میں قیام کے دوران وہ امریکی لہجے میں انگریزی بولنے پر قادر تھا پھر اس کا پاسپورٹ امریکا کا تھا اور تمام کاغذات اسے امریکی ثابت کرتے تھے۔ چہ بڑے اعتماد سے آرمی ہیڈ کوارٹر پہنچ گیا لیکن وہاں بھی اس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔

اب اسے یقین ہو گیا کہ بین آنزک تل ایبب آیا ہی نہیں۔ اس یقین کا ٹھوس وجہ نہیں تھی، بس ایک توانا سا احساس تھا، جو اسے یقین دل رہا تھا۔ اگلی صبح وہ ڈان ہوٹل کی ٹیرس پر بیٹھا بحیرہ روم کے سینے پر تھرتے اسٹیمرز کو دیکھتا رہا۔ دو گھنٹے گئے۔ وہ اپنے آپ سے بحث کرتا رہا۔ بین آنزک کے بغیر اسکیم جاری رکھنے کا کوئی سوچتے سوچتے اس کا دماغ شل ہو گیا، لیکن اس کی تھوڑی پر جینا کا یقین اور بین آ آپس میں لازم و ملزوم بن کر رہ گئے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ بین آنزک کے غائب ہو۔ خبر سنتے ہی جینا اپنا یقین کھو بیٹھے گی۔ یعنی کھیل ختم ہو چکا تھا۔ عقل مندی کا تقاضا یہی جو کچھ میسر ہے، اسے لے کر کھسک لیا جائے۔

راحیلہ ذی شان کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ وہ اس وقت بھی نکل بھاگنے پر غور تھا، جب راحیلہ نے یہ خدشہ ظاہر کیا تھا۔ اب یوسف نے اس پر عملی انداز میں ہر زاویہ سے غور کرنا شروع کیا۔

نکل بھاگنا بھی خاصا خوشگوار تھا۔ اس کے پاس کافی رقم تھی، امریکا کی شہریت اور وہ لیڈا انرپورٹ سے زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ امریکا پہنچنے میں ڈیڑھ دن لگتا اور یہ بات یہیں ختم ہو جاتی۔ راحیلہ اسارٹ ہوتی تو اپنا منہ بند رکھتی، کہ اس نے اب تک کیا تھا اور وہ اس طوفان سے بھی کسی نہ کسی طرح بچر و عافیت جاتی۔

لیکن ان لوگوں کو چھوڑ بھاگنے ہر صورت یوسف کے لئے بڑا اذیت ناک اور باہر شرمندگی تھا۔ کیوں..... کیسے؟ یہ وہ سمجھ نہیں رہا تھا۔ جب کچھ سمجھ میں نہیں آتا اس نے اسے جذباتیت کے کھاتے میں ڈال دیا۔ اس نے خود سے کہا ”جینا یوسف، تم پڑتے جا رہے ہو، بودے ہو گئے ہو۔ ارے..... تمہیں آج نہیں تو کبھی نہ کبھی تو اپنا چھوڑ کر بھاگنا ہی ہے۔ جتنی جلدی بھاگو گے، جینا اور راحیلہ کو اتنی ہی کم تکلیف ہوگی اسی میں ان کی بہتری ہے۔“

مگر پھر اس کے تصور میں راحیلہ در آئی..... میکیدو، وٹل کے بار میں بیٹھ

وہ بہت اداس اور خوفزدہ لگ رہی تھی۔ جب وہ اسے چھوڑ کر آ رہا تھا تو اس کی ہونٹوں میں کیسی التجا تھی، اور یوسف کو یاد تھا، راحیلہ نے پوچھا تھا۔ ”اب ہم کیا کریں گے؟“ اس وقت اس کے لہجے میں کتنی اپنائیت تھی۔ اس نے جمع کا صیغہ استعمال کیا تھا۔ وہ اس کا ساتھی اور شریک سمجھ رہی تھی.....!

لیکن کھیل ختم ہو گیا تھا۔ اس کا خوبصورت اور اسٹروک والا بیٹ ٹوٹ چکا تھا۔ اب راحیلہ بانگ کے سامنے خالی ہاتھ ڈٹے رہنے کا کیا سوال تھا۔ یہ تو احقانہ جذباتیت ہے راحیلہ زندگی کے کھیل میں احقانہ جذباتیت کا تحمل نہیں ہو سکتا۔

پھر اس نے خود سے کہا کہ نہیں۔ ایک باریکی سی۔ میرا اس میں کیا بگڑے گا۔ باہر چکے..... سب کچھ ختم ہو چکا تو اسپورٹس مین اسپرٹ کے مظاہرے میں میرا کیا ہے۔ یہ تو ایسا ہی ہے، جیسے میچ میں شکست کے بعد آدمی مخالف ٹیم کے کھلاڑیوں سے ملتا ہے انہیں..... مبارکباد دیتا ہے۔

یہ خیال اسے دلچسپ بھی لگا اور اس نے اسے پر سکون بھی کر دیا۔ ایک بات اور ہوئی لیکن وہ اس کا اعتراف خود سے بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ یہ کہ اس خیال سے اس نمبر پر سے بوجھ بھی ہٹ گیا۔

وہ اٹھا، اپنا بیگ لیا، ہوٹل کے کاؤنٹر پر ادائیگی کر کے وہ باہر نکلا اور حیفہ جانے والی پر سوار ہو گیا۔

مینہ میں اس نے سیوٹائے ہوٹل سے راحیلہ کو فون کیا۔ ”ٹیکسی پکڑو اور یہاں آئے۔ تم سے بات کرنی ہے۔“ اس نے کہا۔

وہ ہوٹل کے لاونج میں ملے۔ یوسف نے ٹرکس کافی کا آرڈر دے دیا تھا۔ کافی پینے دوران اس نے راحیلہ کو اپنی ناکامی کا احوال سنایا۔ ”میں نے اپنی طرف سے ہر کوشش کر لی لی۔ اگر وہ سامنے نہیں آتا چاہتا تو اسے تلاش کرنا ہمارے بس کی بات نہیں۔ آئی ہوئی لی لی! کھیل ختم ہو چکا ہے۔“

راحیلہ کچھ دیر خاموش بیٹھی دل ہی دل میں جیسے تباہی کا تخمینہ لگاتی رہی، پھر اس کے کی طرف جھک کر اس کے چہرے کو بغور دیکھا ”جو..... تمہیں واپس آنے پر بالکل مجبور کیا؟“ اس نے پوچھا۔

یوسف کا رد عمل بے حد شدید تھا۔ اس نے سوچا..... یہ لڑکی مجھ پرے کو اچھا لگے کے پھر میں نہ لگ جائے۔ اس نے فوراً ہی تیز لہجے میں کہا ”اس سے فرق کیا پڑتا

ہاں غرض کا کچا رشتہ تھا۔ سمجھیں کچھ؟“ اس نے آخر میں فاتحانہ لہجے میں کہا۔ پھر لڑا اور اس نے جوابی حملہ کیا۔ ”اب میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم کس طرح روت ہو؟ میں نے جینا میکلم کی سلطنت میں نقب لگائی اور کھس گیا، تم تماشا دیکھتی رہو! رکھائی کرنے والے کتے ایسے تو نہیں ہوتے۔“ راحیلہ کا چہرہ سپید پڑتا دیکھ کر خوش ہوئی۔ چلی تھی اسے سیدھے راستے پر لگانے! ایسے لوگوں سے وہ ہمیشہ سے آقا تھا۔ شاید اس لئے کہ اچھا بننے کی خواہش اس کی وہ کمزوری تھی جسے اس نے پردوں میں چھپا کر رکھا تھا۔ اس کے باوجود ذرا سی ترغیب پر وہ خواہش بری طرح غمی۔ چنانچہ اسے وہ لوگ بہت برے لگتے تھے جو اس کے اندر اچھائی تلاش کرنے کی ش کرتے تھے۔ ”بولو نا، چپ کیوں ہو گئیں؟“

راحیلہ کو خود پر لگنے والے چ کے سے بالکل تکلیف نہیں ہوئی تھی۔ اپنی حقیقت پہلے ہی تسلیم کر چکی تھی۔ البتہ جوزف نے اپنی شخصیت کا جو خاکہ پیش کیا تھا، وہ اس لئے بے حد تکلیف رہا تھا۔ چنانچہ اس نے بے حد خوشگوار لہجے میں جواب ”میرے بارے میں تو تم کراچی میں سب کچھ جان گئے تھے۔ میں بزدل ہوں، تحفظ کی اہوں۔ میری ماں نے مجھے یہی تعلیم دی تھی۔ میں نے اپنے باپ کو سفید پوشی کا بھرم کی جدوجہد میں جان سے گزرتے دیکھا اور سمجھا کہ زندہ رہنا کتنا مشکل کام ہے۔ بچپن ناآسودہ خواہشوں کے کھلونوں سے کھیلنے گزرا۔ اب ایسی کوئی بات نہیں، اب ہر خواہش پوری ہوتی ہے۔“ وہ مسکرائی۔ ”تم نے چھان بین کا تذکرہ کیا تھا۔ یہ کتنی عجیب ہے کہ تمہارے متعلق سب کچھ معلوم ہو ہی نہیں سکتا۔ چھان بین کرنے لے یقین سے نہیں بتا سکتے کہ تم جوزف ڈیوڈسن ہو یا یوسف۔ کرچن ہو یا مسلمان؟ اب اخذ ہی بتا دو۔“

”فی الوقت تو میں عقیدہ ضرورت کا پیروکار ہوں۔“ یوسف نے زہریلے لہجے میں ”جب کچھ بن جاؤں گا تو ضرور بتاؤں گا کہ میں کیا ہوں۔“

دونوں خاموش بیٹھے اپنی اپنی کمزوریوں کی نہ پائی جانے والی خلیج کے پار ایک اسے کو دیکھتے رہے۔ پھر راحیلہ نے پوچھا ”اب ہمیں کیا کرنا ہے؟“

”جا کر مس میکلم کا سامنا کریں گے تاکہ یہ کہانی اختتام کو پہنچے۔“

”اور پھر؟“

”تمہیں کبھی بے روزگاری کا تجربہ نہیں ہوا؟“ یوسف نے پوچھا۔

”ہے؟“ اندر کی برہمی کو اس کے لہجے نے سرد کر دیا تھا۔ ”اگر جانتا ہی چاہتی، مجھے تجسس واپس لایا ہے۔ میں مس میکلم پر اس ناکامی کے اثرات دیکھنا چاہتا ہوں تو میرے بارے میں چھان بین کرائی تھی۔ تمہیں کسی نے نہیں بتایا کہ میں ہوں اور کہانی نویس بھی۔ اب بولو، تسلی ہو گئی؟“

اگر راحیلہ کو اس کے جواب سے مایوسی ہوئی تھی تو اس نے اسے چھپایا تھا۔ چہرے کے تاثرات سے ظاہر نہیں ہونے دیا تھا لیکن اس کی نگاہیں یو پار دیکھتی محسوس ہو رہی تھیں ”تم کس طرح کے انسان ہو یوسف؟ انسانوں انہیں توڑنا اور پھر ان کا رد عمل دیکھنا، یہ کہاں کی انسانیت ہے؟“ راحیلہ نے کار میں کہا۔

یوسف کی برہمی معدوم ہو گئی۔ شرمندگی چھپانے کے لئے ہمیشہ کی طرح سگریٹ کا سہارا لیا۔ بڑے اہتمام سے سگریٹ ہونٹوں میں دبا کر دیا سلائی؟ ہاتھوں کے پالے میں چھپا کے اس نے اطمینان سے سگریٹ سلگائی پھر بولا ”میرے بارے میں بہت کچھ معلوم نہیں کر سکی ہو۔ دیکھو..... یہ ناہموار معاشرہ تخلیق نہیں کیا ہے۔ میں زندہ ہوں تو اس کے لئے بہت کم عمری میں میں خود غرض معاشرے میں زندہ رہنا سیکھ لیا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ لوگ ایک دو کمزوریوں کو بھانپتے، ان سے فائدہ اٹھا کر اپنے لئے مطلوبہ نتائج حاصل کرتے لئے میں کسی چیز کو اپنی کمزوری نہیں بناتا۔ دولت کو بھی نہیں۔ میں استعمال نہیں کیونکہ جو استعمال نہیں ہوتے، وہی دوسروں کو استعمال کرنے کے اہل ہوتے! میں نے مس میکلم کی کمزوری کو کیش کرنا چاہا۔ ناکام ہوا۔ کوئی بات نہیں۔ اگر دولت کمزوری ہوتی تو میری عقل اس مرحلے پر جواب دے جاتی، کمزوری حاوی آجا سب کچھ ختم ہو جانے کے باوجود اس چوہین سے چٹنے رہنے کی کوشش کرتا اور ہے، اسے بھی گنوا بیٹھتا۔“ کتے کتے اسے خود ایک خیال آیا۔ اس نے اس انداز نوچا ہی نہیں تھا۔ ”اگر میں بھی بین آنزک کی طرح بھاگ جاتا۔“ اس نے کچھ توڑا بعد پھر کہا۔ ”تو بھی مجھ سے سب کچھ چھن جاتا۔ جو عورت مجھے امریکی شہریت ہے، وہ اسے منسوخ بھی کرا سکتی ہے۔ وہ اپنے وسائل کے ذریعے مجھے کہیں ڈھونڈ سکتی ہے۔ میرا معاملہ بین آنزک سے مختلف ہے اسلئے کہ میرے اور مقاصد جدا تھے۔ پھر بین آنزک سے جینا کا املا کا رشتہ استوار ہو گیا تھا جبکہ میرے

ہوئی۔ میں اسرائیل میں آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔“ پھر اس نے شرمیلے انداز میں اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو دیکھا ”میں آپ سے ہاتھ نہیں ملا سکوں گا۔ ابھی دو گھنٹے پہلے میں اپنی زمین پر کام کر رہا تھا۔ آلو نکال رہا تھا زمین سے۔“

”اور ڈاکٹر لیوی! یہ ہیں جوزف ڈیوڈسن۔ میری مہم کے منیجر۔“ جینا نے یوسف کی طرف اشارہ کیا۔

ڈاکٹر لیوی، یوسف کی طرف مڑا۔ ”تو یہ ہیں مسٹر ڈیوڈسن، جنہوں نے قدیم نسل کی لہلہ العری سے متعلق ذہانت آمیز تھیوری پیش کی ہے۔“ اس نے دوستانہ لہجے میں کہا۔

”بین آئزک نے مجھے آپ کے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔“ اس نے یوسف سے ہاتھ لایا۔ اس کی گرفت میں سختی تھی۔

”ڈاکٹر لیوی بے حد مہربان اور بہت قابل آدمی ہیں۔“ جینا میکلم کہہ رہی تھی۔

”بین آئزک نے انہیں یہاں ہماری آمد کا مقصد بتا دیا ہے۔ ڈاکٹر لیوی نے وعدہ کیا ہے کہ ہمارے مطلوبہ مقام تک ہماری رہنمائی کریں گے۔“

یوسف کو اپنی پشت پر روئیں کھڑے ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔ صورت حال غیر متوقع تھی اور وہ اس کے لئے تیار نہیں تھا۔ ”آپ کا مطلب ہے تاریخی اہمیت کے کسی مقام پر کھدائی کے سلسلے میں ڈاکٹر لیوی ہماری مدد کریں گے؟ کیونکہ ہم یہاں اسی مقصد سے آئے ہیں۔“ اس نے کہا۔

جینا نے اسے تیز نظروں سے دیکھا ”ہرگز نہیں۔“ وہ بولی۔ ”ڈاکٹر لیوی اس مقام سے واقف ہیں، جہاں کے لوگ شجر زندگی کا پھل کھاتے ہیں۔ یہ ہمیں وہاں لے جائیں گے۔“

یوسف پھٹ پڑا۔ ”کیا؟ کہاں لے جائیں گے؟“ درحقیقت اسے بہت بڑا شاک لگا۔

قدیم بین آئزک اور وہ بڑھا فراڈ کتنی صفائی سے اس کی اسکیم کو لے اڑے تھے۔ غضب خدا کا! انہوں نے کوئی جگہ بھی منتخب کر لی تھی اور اب بے وقوف بڑھیا کو وہاں لے جانے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ اسی لئے تو بڑھیا کا چہرہ اتنا چمک رہا تھا۔ وہ دونوں غیبت اس کی سونپی ہوئی اسکیم پر پوری طرح قابض ہونے کے چکر میں تھے ”ایک منٹ خاتون!“ اس نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا ”بات صاف ہو جانی چاہئے۔“ یہ کہہ کر وہ بڑھے فراڈ ڈاکٹر لیوی کی طرف مڑا۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ بین آئزک اسے ڈبل کر اس کرنے کے لئے جانے کمال سے اسے پکڑ لایا ہے۔ ”آپ کتے ہیں کہ آپ بین آئزک کے انکل ہیں؟“ اس

”نہیں۔“ راحیلہ نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا ”اور حیرت انگیز طور پر موقع ہے کہ میں خوف زدہ نہیں ہوں۔ اچھا۔۔۔۔۔ ایک بات بتاؤ۔ مس میکلم کو صدے سے بچانے کی کوئی صورت نہیں؟“

”دکھ اور صدے سے بچانے کی۔۔۔۔۔؟“

”ہاں“ میں جانتی ہوں کہ کاروباری معاملات میں وہ بے حد سفاک ہیں۔ ان کے ہاتھوں لوگوں کو اذیت پہنچتے دیکھی ہے۔ خود مجھے بھی کئی بار انہوں نے دی۔ سو انہیں پہنچنے والے مالی نقصان کی مجھے کبھی پروا نہیں ہوگی لیکن اپنی خواہ زنداں میں وہ بنیاد ہیں۔۔۔۔۔۔۔ بچنے کی طرح بے بس ہیں۔ میں انہیں اس معاملہ اذیت سے دوچار ہوتے نہیں دیکھنا چاہتی۔ اور وہ میری پھوپھی بھی ہیں۔“

”ٹھیک ہے“ میں کوشش کروں گا کہ ایسا نہ ہو۔ تم یہ معاملہ مجھے ہینڈل کر اور اپنے اعصاب پر قابو رکھنا۔“

لیکن جب وہ جینا میکلم کا سامنا کرنے کی غرض سے میکلم دھوٹل پہنچے تو ہتھ دہاں ایسے معاملات درپیش ہیں، جنہیں یوسف بھی ہینڈل نہیں کر سکتا۔ انہیں کاؤنٹر پتا چلا کہ جینا میکلم اب تک تین چار بار انہیں طلب کر چکی ہے اور اس نے حکم دیا۔ وہ جیسے ہی واپس آئیں، انہیں اس کے سوئٹ میں بھیج دیا جائے۔



اس کمرے میں، جسے جینا میکلم بطور آفس استعمال کر رہی تھی، تین افراد موجود تھے۔ ایک تو جینا خود تھی۔ وہ اپنی کرسی پر شاہانہ انداز میں تن کر بیٹھی تھی۔ اس کے با سے توانائی پھونتی محسوس ہو رہی تھی۔ چہرے اور آنکھوں پر فاتحانہ چمک تھی۔ اس قریب ہی بین آئزک کھڑا تھا۔ تیسرا ایک بوڑھا شخص تھا، جس کا سر جسم کے مقابلے بڑا لگ رہا تھا۔ اس کی نیلی آنکھوں میں دوستانہ تاثر تھا۔ لباس سے وہ کوئی دہقان لگتا تھا۔ انہیں دیکھ کر وہ اٹھا۔ وہ کھڑے قد اور کسرتی جسم کا مالک تھا۔ شخصیت میں عجیب سا وقار تھا۔ دیکھنے میں وہ دہقان لگتا تھا مگر انداز حکمرانوں کا سا تھا۔ ٹھوڑی کی بناوٹ ذہن دلی کی غمازی کر رہی تھی۔

”آؤ بھئی۔۔۔۔۔۔۔“ جینا نے چمک کر کہا ”مس میکلم یہ ہیں ڈاکٹر نتھان لیوی۔۔۔۔۔۔۔ بین آئزک کے بچا۔“

ڈاکٹر لیوی دوستانہ انداز میں مسکرایا ”مس راحیلہ میکلم! آپ سے مل کر خوش



نے کہا۔

”ہاں، اور میں اپنے بچے کو زندہ سلامت دیکھ کر بڑی سنسنی محسوس کر رہا ہوں۔“  
 ”اور آپ جانتے ہیں کہ ہم یہاں کیوں آئے ہیں اور ہمیں کس چیز کی تلاش ہے؟“

ڈاکٹر لیوی مسکرایا۔ ”ہاں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ انسان تو طویل عرصے سے ا  
چیز کی جستجو کر رہا ہے.....“ وہ ہنسی بھرا، پھر دوبارہ مسکرایا۔ ”شاید اس وقت سے‘ ج  
اسے جنت سے دیس نکالا ملا تھا۔“

”اس کا نام کیا ہے؟“

”اس کے کئی نام ہیں۔ مختلف وقتوں میں وہ مختلف روپ میں سامنے آتی رہے۔“ ڈاکٹر لیوی نے کہا ”لیکن یہاں، جہاں اے یاد رکھا گیا، اسے شجر زندگی کا پھل کہ جاتا ہے۔“

”اور اسے کھا کر آدمی پانچ سو سال تک جی سکتا ہے؟“ یوسف کو اس کی ڈھٹائی حیرت ہو رہی تھی۔ اسی کی باتوں کو اس کے سامنے بڑی ڈھٹائی سے دہرایا جا رہا تھا۔ جبکہ وہ خود جانتا تھا کہ یہ جھوٹ جینا میلکم کو بھلانے کے لئے..... پھنسانے کے لئے اس گھڑا تھا۔ اب اسے یہ دیکھنا تھا کہ بڑھاپہ فراڈ کس حد تک آگے جانے کے موذ میں ہے۔

ڈاکٹر لیوی نے اسے بہت غور سے دیکھا۔ شاید اسے اس کے لہجے میں متسخر محسوس ہو گیا تھا لیکن اس کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ اس پر برہم نہیں ہے۔ ”ہاں۔ روایات ایسی ہی کہتی ہیں بشرطیکہ ان پر یقین کر لیا جائے۔“ اس نے کہا۔ پھر اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک لہرائی۔ ”اور یہ وہ سرزمین ہے، جہاں بیشتر روایات پر یقین کیا جاتا ہے کیونکہ عام طور پر ان کی بنیاد میں سچائی ہوتی ہے۔ یہاں کے لوگوں کو بہت کچھ یاد ہے، اور یہ لوگوں کی صوابدید پر منحصر ہے کہ وہ کیا یاد رکھتے ہیں اور کیا بھول جاتے ہیں۔“

یوسف نے سر کو تھیمی جنبش دی۔ ”جی ہاں۔ اب یہ بتائیں کہ وہ چیز ملے گی کہاں؟“

ڈاکٹر لیوی چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا۔ ”کون ہرمن کی ڈھلوانوں پر ایک پوشیدہ گاؤں ہے جو بیت الجبل کہلاتا ہے۔ عام لوگ اسے نہیں ڈھونڈ سکتے۔ میں برسوں پہلے ایک بار وہاں گیا تھا۔ اسے بزرگوں کی سرزمین بھی کہا جاتا ہے کیونکہ اس گاؤں کے بہت سے لوگ بہت زیادہ معمر ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ شجر زندگی کا مقدس راز ان کے قبضے میں ہے۔ اگر

”ہم خوش قسمتی سے وہاں پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تو.....“  
 ”ہم وہاں ضرور پہنچیں گے..... ہمیں پہنچنا ہو گا۔“

ہٹ کاٹ دی۔ ”تم نے کہا ہے کہ تم ایک بار وہاں جا چکے ہو.....“

ڈاکٹر لیوی نے سرگھما کر جینا کو دیکھا۔ اس کی نظروں میں عجیب سی نرمابھٹ اتر آئی تھی، لیکن یہ دس بارہ سال پہلے کی بات ہے۔ اب وہ گاؤں ایک ایسے ملک کی سرحد پر ہے، جس سے ہماری سرحد جنگ چل رہی ہے لہذا دشواریاں تو ہوں گی۔ مگر.....“

ہائے ان سے گزر جایا جائے۔“

یوسف اندر ہی اندر کھولتا رہا۔ منصوبہ سادہ لیکن کھلم کھلا احقانہ اور ناقابل یقین غلام..... بے وقوف بنانے والا۔ ایک ایسا گاؤں، جہاں پہنچنا ناممکن ہے! کم بختوں نے کوئی نئی بات پیش کرنے کی بھی زحمت نہیں کی تھی۔ وہ بین آنرک کی طرف مڑا۔ ”اس شخص کو تم نے کہاں سے ڈھونڈ نکالا؟“

بن آزرک نے تیز لہجے میں کہا ”بد تمیزی سے بات مت کرو۔“ اسے یوسف کی بے یقینی اور معاندانہ رویے کا احساس ہو گیا تھا اور اسے اس پر غصہ آ رہا تھا۔ اس سے پہلے وہ اس کرشمے پر خوش تھا کہ قدرت نے بچپن کے پچھڑے ہوئے چچا سے اسے ملا دیا ہے، لیکن یوسف کے رویے نے اس کی خوشی کو ملیا میٹ کر دیا تھا۔

”میں نے تم سے کچھ پوچھا تھا؟“ یوسف نے اسے یاد دلایا۔

”شمال کے علاقے میں..... میتلا کے مقام پر۔“ بین آئزک نے جواب دیا۔  
 منہ سے نکل کر اس نے سیدھا ویزمین انسٹیٹیوٹ کا رخ کیا تھا۔ وہاں استفسار پر اسے  
 معلوم ہوا کہ ڈاکٹر تنہا نیل لیوی نے اپنی پوزیشن اور تمام ٹائٹلز کو خیر یاد کہہ دیا ہے اور لبنانی  
 بارڈر کے قریب کہیں فرضی نام ہے زندگی گزار رہا ہے۔

”یہ تمہیں ملے کسے؟“

”تلاش کرنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے۔“

بس کے ذریعے اور پیدل سفر کر کے بین آئزک نے اس علاقے کو چھان مارا۔ بالآخر میٹلا کے باہر ایک قطعہ زمین پر ایک بڑھا شخص زمین کے سینے سے آلو نکالتا نظر آیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو پہلی ہی نظر میں پہچان لیا۔

اپنے ہاتھوں سے مٹی جھاڑتے ہوئے ننھا نیل لیوی نے پکار کر کہا ”بین

ہمارے لفظوں کو خدا کی رحمت سے بچ ثابت کر دیں۔ شمال کی طرف ایک دیباہی قبیلہ آباد ہے، جیسا تم نے ضرورت مند خاتون کے سامنے بیان کیا تھا۔ اگر ہم خاتون کو وہاں پہنچا دیں تو کم از کم وعدے کا ایک حصہ تو ایفا کریں گے۔“

”لیکن انکل، میں نے تو اس سے ابدی زندگی کی بات کی تھی۔ اس کا کیا ہو گا؟“  
 بوڑھا چچا کچھ دیر گہری سوچ میں ڈوبا رہا۔ ”وہ تو بہت مشکل ہے۔ موت سے کسی کو مفر نہیں۔ یہ تو خدائی حقیقت ہے۔“

جوزف ڈیوڈسن کا کلاٹ دار لہجہ بین آئزک کو حال میں کھینچ لایا۔ وہ کہہ رہا تھا ”مجھ سے دل کی بات مت کرو ڈاکٹر۔ مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارے ذہن میں کیا ہے؟“

اب اس کا رویہ جینا میکلم کی برداشت سے باہر ہو گیا۔ ”مسٹر ڈیوڈسن!“ اس نے سرد لہجے میں کہا ”میں تم سے مطالبہ کرتی ہوں کہ ڈاکٹر نتھائل لیوی کے ساتھ احترام سے پیش آؤ۔“

”مس میکلم! میں مم کا انچارج ہونے کے ناطے آپ کو تحفظ فراہم کرنا میرا فرض ہے۔ اور یہ شخص.....“

”بس، بہت ہو چکی مسٹر ڈیوڈسن!“ جینا نے سخت لہجے میں اس کی بات کاٹ دی۔  
 ”اب تم ڈاکٹر لیوی کے احکامات کے مطابق عمل کرو گے۔ کھدائی کے آلات اور ہم سب کا خیال رکھنا تمہاری ذمہ داری ہوگی لیکن انچارج ڈاکٹر لیوی ہوں گے، وہ بھی اس شرط پر کہ تمہارا رویہ مندرجہ ذیل ہے۔ اس صورت میں ہمارے درمیان جو شرائط طے پائی تھیں، ان پر میری طرف سے عمل ہوگا۔ سمجھ گئے؟ ڈاکٹر لیوی بعد میں تمہیں تفصیلات سے آگاہ کریں گے۔ اب تم جاؤ۔ مجھے ضروری امور پر ڈاکٹر لیوی سے تبادلہ خیال کرنا ہے۔“

○-----○-----○

یوسف میرس پر ٹپل رہا تھا۔ وہ برہم بھی تھا اور پریشان بھی۔ اسے جینا میکلم کے کمرے سے واپس آئے ایک گھٹنا ہو چکا تھا۔ وہ اس لمحے کی کڑیاں ملانے اور اسے سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ایک حقیقت سے بہر حال انکار ممکن نہیں تھا۔ شکست کے قریب ترین لمحے میں بین آئزک کی واپسی اسے دوبارہ کھیل میں واپس لے آئی تھی، اور وہ واپسی بے حد غیر متوقع تھی، لیکن کھیل میں وہ واپسی بھی کیا واپسی تھی! ایک بڑے مداخلت کار نے جو جینا فراڈ تھا، اسے کیپٹن شپ سے ہٹا کر بارہواں کھلاڑی بنا دیا تھا۔ شاید بین آئزک کو

آئزک..... یہاں تک پہنچنے میں تمہیں بہت عرصہ لگا۔ بہر حال خوش آمدید.....  
 پھر اس نے بین آئزک کو اپنی بانسوں میں بھیج بھیج کر خوب پیار کیا۔ بین آئزک کو پہلی احساس ہوا کہ وہ گھر پہنچ گیا ہے۔

”اور تم کہتے ہو کہ یہ تمہارے سائنس دان اور اسکالر انکل ہیں۔“ یوسف۔ سخت لہجے میں کہا ”جن کا تم نے کراچی میں مجھ سے تذکرہ کیا تھا۔“

”ہاں، یہ وہی انکل نتھائل ہیں۔“  
 ”اس کا کیا ثبوت ہے تمہارے پاس؟“

بین آئزک کا چہرہ غصے سے تھما اٹھا۔ اس کی آنکھوں میں خطرناک چمک ابھری لیکن ڈاکٹر لیوی نے بڑے سکون سے کہا۔ ”ثبوت تو بڑی آسانی سے مل جائے گا بشرطیکہ ہمارے دلوں میں جھانک سکو۔“

بین آئزک کے دل میں بڑھے چچا کے لئے محبت کی ایک موج سی اٹھی۔ اسے محبت اور اعتبار ہی کے زور پر تو اس نے چچا کو جینا میکلم کی کمزوری اور جوزف ڈیوڈسن کی فراڈ کی اسکیم کے متعلق سب کچھ بتایا تھا۔ اس نے چچا کے سامنے ضمیر کا وہ بوجھ ہلکا کر دیا تھا جو جینا کو بے وقوف بنانے کے سلسلے میں وہ محسوس کرتا تھا۔

ڈاکٹر لیوی خاموشی سے سنتا رہا تھا۔ بغیر ایک حرف ملامت ادا کئے اس نے شرور سے آخر تک پوری کہانی بغور سنی تھی۔ اس کے خاموش ہونے کے بعد ڈاکٹر لیوی نے پوچھا تھا۔ ”کیا وہ عورت اب بھی خدا پر ایمان رکھتی ہے؟“  
 ”جی ہاں۔ وہ ہر روز بائبل کا مطالعہ کرتی ہے۔“

”تم بہت مشکل حالات سے گزر رہے ہو بین آئزک۔ اپنی سناؤ، تمہارا خدا پر یقین باقی ہے؟“ چچا نے پوچھا تھا۔

”جی ہاں انکل۔ میں خدا پر یقین رکھتا ہوں۔ میں اس سے دعا کرتا ہوں اور انا کے لئے لڑتا ہوں۔ میرے اجداد کی طرح وہ میرا بھی خدا ہے۔“

ڈاکٹر لیوی نے مسکراتے ہوئے کہا ”تم داؤد کے لڑاکوں کی طرح بات کر رہے ہو۔“ پھر وہ دیر تک خاموش رہا۔ وہ دونوں چھوٹے سے مکان کی نشست گاہ میں بیٹھے تھے۔ بالآخر ڈاکٹر لیوی نے ایک گہری سانس لی اور اٹھا ”بین آئزک اٹھو، ہم اس کے پاس بائیں گے۔“ اس نے کہا ”میں یہاں پر سکون زندگی گزار رہا ہوں، ترکاریاں اگا رہا ہوں، لیکن تم نے اسے زبان دی ہے، اور وعدہ کیا جائے تو پورا بھی ہوتا چاہئے۔ ممکن ہے،“

یوسف نے فیصلہ کیا کہ اسے بہت احتیاط سے کام کرنا ہوگا اور صبر و تحمل سے کام لینا ہوگا۔



یوسف اور ڈاکٹر لیوی یروٹلم میں کنگ ڈیوڈ ہوٹل کی ٹیرس پر بیٹھے دوستانہ ہم نشینی میں مصروف تھے۔ سامنے قدیم شہر کے آثار، دیواریں اور مینار نظر آرہے تھے۔ ان دونوں کا انداز بظاہر دوستانہ تھا لیکن یوسف کے ذہن میں دوستی کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ وہ تو بچے شو کرانے کے موڈ میں تھا۔

جینا میکلم اپنے کمرے میں تھی اور غصے میں تھی۔ ڈاکٹر لیوی نے اس پر زیارتیں توپ دی تھیں۔ جبکہ وہ جلد از جلد اپنی منزل پر پہنچنا چاہتی تھی۔ اس تاخیر پر وہ برہم تھی۔ ڈاکٹر لیوی نے اس کا دباؤ قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ مصر تھا کہ وہ عام سیاحوں کی طرح سفر کریں گے تاکہ ان کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا نہ ہوں۔ اسی لئے انہوں نے سب سے پہلے یروٹلم کا رخ کیا تھا۔ اب وہ یہاں اپنے خطوط کے جوابات کا منتظر تھا جو اس نے مینا پوسٹ کئے تھے۔

یوسف فکر مند تھا۔ اسے ڈر تھا کہ خراب موڈ میں جینا اس پر الٹ پڑے گی۔ اب وہ اس کے لئے غیر ضروری جو تھا۔ وہ کسی بھی وقت اسے نکال سکتی تھی۔ اس لحاظ سے یوسف کے لئے ضروری تھا کہ وہ دوبارہ اپنی اہمیت ثابت کرے۔ ایسے میں اسے ایک پرانی کماوت یاد آئی۔ جب کسی کو شکست نہ دے سکو تو اس کے حلیف بن جاؤ۔

اسی کماوت پر عمل کرتے ہوئے اس نے ڈاکٹر لیوی کو دعوت دے ڈالی۔ اب وہ ٹیرس پر بیٹھے پی رہے تھے۔ یوسف دہسکی سے شغل کر رہا تھا جب کہ ڈاکٹر لیوی کے ہاتھ میں مارٹنی کا جام تھا۔ وہ جام کو پرستائش نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہر انداز سے خوشی ہو رہا تھا۔

”بہت خوب!“ ڈاکٹر لیوی کہہ رہا تھا۔ ”برسوں بعد میں نے مارٹنی چکھی ہے۔ بلکہ اسرائیل آنے کے بعد یہ پہلا موقع ہے۔ میں تمہارا شکر گزار ہوں مسٹر ڈیوڈسن۔“

یوسف نے رسمی باتوں میں وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ ”میں سوچ رہا ہوں ڈاکٹر لیوی کہ مجھے اپنے کھیل میں شامل کرنے کا اس سے مناسب وقت اور کیا ہو سکتا ہے۔“ اس نے کہا۔

ڈاکٹر لیوی کا رد عمل یوسف کی توقع کے مطابق نہیں تھا۔ نہ تو اسے الفاظ کے

یقین تھا کہ وہ ایک دہقان کو اسکا رہنا کر پیش کرے گا تو اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔ یوں وہ پورے میدان پر قابض ہو جائے گا۔

یوسف کو اس امر میں ذرا شبہ نہیں تھا کہ ڈاکٹر لیوی فراڈ ہے۔ اس نے جینا کو دیوالیائی ناموجود گاؤں لے جانے کا خواب دکھایا تھا، جو پہلی بار خود یوسف نے ہی سوچا تو ظاہر ہے ایسے گاؤں کی تلاش میں تو برسوں گزر سکتے تھے۔ پھر وہاں وہ ناموجود شے تلاش کرنا جس کی مدد سے جینا کی عمر طویل ہو جائے! ہاں..... یہی تو خود اس کا پروگرام تھا لیکن بڑھا فراڈ اس کو ہائی جیک کر چکا تھا اور اب وہی مہم کا انچارج تھا۔

ایسا لگتا تھا کہ وہ ذرا سی ہی دیر میں جینا میکلم کو پوری طرح قائل کر چکا ہے اسے اپنی افادیت اور اہمیت کا یقین دلایا تھا۔ اس سے ثابت ہوتا تھا کہ وہ یوسف کیسے بڑھ کر چرب زبان ہوگا۔ صورت حال وہی کی وہی تھی، منصوبہ بھی وہی تھا۔ فراڈ صرف اتنا تھا کہ اب صورت حال پر یوسف کا کنٹرول نہیں رہا تھا۔ وہ اس کھیل میں اب بھی موجود تھا تو صرف اس لئے کہ وہ جینا میکلم پر اپنی انتظامی صلاحیت ثابت کر چکا تھا لیکن اس سے کب تک کام چلا؟ اسے یقین تھا کہ بین آنرک اور ڈاکٹر لیوی یا وہ جو کوئی ہے، موقع ملے ہی اس سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کریں گے۔

اب یوسف راحیلہ کی پوزیشن کے متعلق سوچ رہا تھا۔ اس بدلی ہوئی صورت حال میں جبکہ اس کی پھوپھی کی دولت پر حملہ ایک طرف سے نہیں، دوسری طرف سے ہو رہا ہے اس کا ساتھ دے گی؟ اس کا جواب بے حد آسان تھا۔ جہاں اسے زیادہ فائدہ نظر آئے گا..... یعنی بین آنرک کے کارنر میں..... اور اگر اس عمل میں جوزف ڈیوڈسن حصے میں ذلت آتی ہے تو یہ بات راحیلہ کے لئے طمانیت بخش ہوگی۔

لیکن اگر وہ لوگ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ جوزف ڈیوڈسن اتنی خاموشی سے..... بچہ کچھ کئے زندگی کی سب سے اہم دوڑ میں شکست تسلیم کر لے گا تو وہ امتحان کی جنت میں رہتے ہیں۔ جوزف ڈیوڈسن زندگی کے سب سے بڑے داؤ میں بچے شو کرانے بغیر مار نہیں مائے گا۔

افسوس اسے سب سے زیادہ اس بات کا تھا کہ اس جیسے عقل مند اور جہاں دی آدمی کو ایک عام سے پناہ گزین نے لوٹ لیا تھا۔ اس نے اس کے بچوں سے اس کی زندگی کا سب سے قیمتی شکار چھین لیا تھا اور ایک امکان یہ بھی تھا کہ ڈاکٹر لیوی بچے ڈاکٹر نتھائل لیوی ہی ہو۔

نے کارا دہ رکھتے ہو؟

”بیت الجبل، جسے بزرگوں کی سرزمین کہا جاتا ہے۔“

”یہ کہاں ہے؟“

”سرحد کے پار..... شام کی حدود میں..... کوہ ہرمن کی ڈھلوانوں پر۔“ ڈاکٹر ی نے جام سے ایک اور گھونٹ لیا۔ ”تمہیں تو اس روایت کے متعلق علم ہو گا۔ طوفان کے دوران دو پہاڑ ایسے تھے، جہاں سیلاب کا پانی نہیں پہنچ سکا تھا۔ ایک تھا کوہ رات اور کہا جاتا ہے کہ دوسرا کوہ ہرمن تھا۔“

”سرحد پار کرنا خطرناک ہے؟“

”یہ تو میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں۔ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔“

”تو پھر شام کی طرف سے کیوں نہ داخل ہوا جائے؟“

”بات مقول ہے۔“ ڈاکٹر لیوی نے اثبات میں سرہلاتے ہوئے کہا ”لیکن مسئلہ یہ کہ ہم تیکنیکی اعتبار سے اس وقت شام کے ساتھ حالت جنگ میں ہیں۔ مجھے شام داخل ہونے کی اجازت نہیں ملے گی۔“

”ہمیں تو مل جائے گی۔“ یوسف نے اطمینان سے کہا ”اور ہم تمہارے بغیر بھی جا رہے ہیں۔ تم ہمیں ہدایات دے دو..... راستہ سمجھا دو۔“

”یہ بات اتنی مقول نہیں۔“ ڈاکٹر لیوی نے کہا پھر بولا ”ایک اور جام منگوا لو؟“ ل کا ترسا ہوا ہوں۔ تمہارے لئے اسکاچ کا آرڈر دے دیتا ہوں۔“ اس نے ویٹر کو سے بلایا اور اس سے رواں عبرانی میں کچھ کہا پھر وہ یوسف کی طرف متوجہ ہوا۔ ”تو میں کہہ رہا تھا کہ یہ عقل مندی نہیں۔ تم اس علاقے سے ناواقف ہو۔ وہ گاؤں تلاش کرو گے؟ اور اگر تم نے گائیڈز کی خدمات حاصل کیں تو اپنے سفری غرض و کو نہیں چھپا سکو گے۔ پھر وہاں ایسے قبائل بھی موجود ہیں جو مس میلکم کے زبردستی ناہن کر تاوان وصول کرنے کی سعادت ضرور حاصل کریں گے۔ اور آخری..... اگر تم اتفاق سے بیت الجبل پہنچ بھی گئے تو وہاں کے لوگوں سے کس زبان میں لو گے؟ انہیں کیسے بتاؤ گے کہ تم کیوں آئے ہو؟“

”تو تم نے ہر بات کا خیال رکھا ہے۔ ہر بات کا جواب ہے تمہارے پاس؟“ یوسف ہلے لہجے میں کہا۔

”تم ٹھیک سمجھ ہو۔“ ڈاکٹر لیوی نے سادگی سے کہا۔

نامناسب چٹاؤ پر غصہ آیا، نہ ہی اس نے تجاہل عارفانہ سے کام لیا۔ اس نے بڑے سکور سے جام سے ایک گھونٹ لیا اور جام کو میز پر رکھ دیا۔ ”مجھے یقین ہے کہ تم لفظ ”کھیل“ استعمال نہیں کرنا چاہتے تھے۔“ اس نے نرم لہجے میں کہا۔

”کھیل کہہ لو، شعبہ کہہ لویا فراڈ۔ جو جی چاہے کہہ لو۔ میں صرف یہ جانتا چاہتا ہوں کہ تم آخر ہو کس چکر میں۔ اگر بات مقول ہے تو ہم مل کر کام کر سکتے ہیں۔ میں تمہاری مدد کروں اور تم میری مدد کرو لیکن میں اپنی پوزیشن بہر حال جانتا چاہتا ہوں۔“ ڈاکٹر لیوی نے سر کو تھیمی جنبش دی۔ ”ویسے تمہاری تشویش میری سمجھ سے باہر ہے۔ پھر بھی کہو، کہاں سے شروع کروں؟“

”خود سے شروع کرو۔ یہ کسان والا کیا چکر ہے؟ ڈاکٹر نتھانیل لیوی اور سبزیوں کی کاشت! تم کسے بے وقوف بنا رہے ہو اور مقصد کیا ہے تمہارا؟“ یوسف نے ہر کلف بالائے طاق رکھ دیا۔ ”بین آئزک نے مجھے بتایا تھا کہ اس کا چچا ربی رہ چکا ہے، ماہر آثار قدیمہ ہے اور یونیورسٹی میں پڑھاتا ہے۔ اس کے پاس یورپ کی ممتاز یونیورسٹیوں کی اسناد موجود ہیں.....“

ڈاکٹر لیوی نے سر کو اثباتی جنبش دی۔ اس کی آنکھوں میں اداسی در آئی ”یہ درست ہے کہ میرے پاس ڈگریاں ہیں مگر بد قسمتی سے زراعت کی ڈگری نہیں ہے میرے پاس جبکہ اس وقت سب سے زیادہ ضرورت اسی ڈگری کی ہے۔“

”اگر تم بین آئزک کے بچا نتھانیل لیوی ہو تو شمال کے اس گاؤں میں تمہارا کیا کام؟ تمہیں تو مل ایبب یونیورسٹی میں یا کسی اور انسٹی ٹیوٹ میں درس و تدریس میں مصروف ہونا چاہئے تھا۔“ یوسف نے اعتراض کیا۔

ڈاکٹر لیوی نے یوسف کو بغور دیکھا۔ ”نوجوان، تمہیں یہاں آئے دیر ہی کتنی ہوئی ہے کہ سمجھ سکو۔ لیکن میں سمجھ گیا ہوں۔ اسرائیل کو کسی قلعے کی نہیں، سب سے زیادہ ضرورت غذا کی ہے۔ میں وہ کام کر رہا ہوں، جس کی میرے خیال میں سب سے زیادہ اہمیت ہے۔ بہر حال اگر تمہاری نسلی کے لئے یہ ضروری ہے تو میں پہنچ کر تمہیں اپنی ڈگریاں بھی دکھا دوں گا۔ اور بتاؤ..... کیا الجھن ہے تمہیں؟“

یوسف کو ایسا لگا جیسے وہ مذاق بن رہا ہے۔ اسے احساس ہو گیا کہ ڈاکٹر لیوی کوئی سادہ لوح دھقان نہیں..... وہ ذہین تھا..... تعلیم یافتہ تھا اور شاید اس سے بڑھ کر عیار بھی تھا۔ ”الجھن تو بہت سی ہیں۔“ اس نے کہا ”مثلاً یہ کہ تم مس میلکم کو کہاں لے

”مجھے اندازہ نہیں۔“ ڈاکٹر لیوی نے کہا ”بہر حال وہ بیت الجبل کے بزرگ ترین لوگوں میں سے تھا۔ اسے خود بھی اپنی عمر کے متعلق معلوم نہیں تھا لیکن یادداشت اس کی سب کی تھی..... بہت زیادہ پرانی باتیں بھی اسے یاد تھیں۔“

یوسف اگر خود پر قابو نہ پاتا تو یقیناً آپے سے باہر ہو جاتا۔ بڑھا اسے بالکل ہی بے زلف سمجھ رہا تھا۔ اب یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ بین آئزک اور بڑھے فراڈ نے مل کر بدست ہڈیاں پکائی ہے۔ پہاڑ کی ڈھلوان پر گشہ گاؤں، جس کا پتا صرف ایک شخص کو معلوم تھا۔ پراسرار کھمبی اور وہ راز جس کی حفاظت کی جاتی تھی، جسے کسی پر افشا نہیں کیا جاتا۔ اب اگلے مرحلے میں بڑھا فراڈ ایک پرانا بوسیدہ نقشہ پیش کرے گا، جس پر پوشیدہ بے میں داخلے کے مقام پر دو ہڈیاں اور ایک کھوپڑی بطور علامت بنے ہوں گے.....

ڈاکٹر لیوی نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا ”میرے پاس بیت الجبل کے راستے کا ایک نقشہ موجود ہے۔“ اس نے کہا ”وادی بیت الجبل میں داخلے کا راستہ عام نظروں سے پوشیدہ ہے۔ میں نے دس سال پہلے وہاں سے واپس آتے ہوئے یہ نقشہ بنایا تھا۔“

یوسف نے نقشے کا جائزہ لیا۔ ہڈیاں اور کھوپڑی نادر تھیں۔ باقی وہ دیا ہی تھا، جیسا اس نے سوچا تھا۔ اس کے ہونٹ سکر گئے۔ اس کے اندازے درست ہونے کا مطلب تھا کہ فراڈ بے حد روایتی انداز میں کیا جا رہا ہے۔ کم بحث اور بحثی کا خیال بھی نہیں رکھئے۔ ذہانت کا مظاہرہ بھی نہیں کر پا رہے ہیں۔ یہ بات اور واضح ہو گئی تھی کہ بین آئزک نے بڑھے کو سب کچھ بتا دیا ہے۔ اسے اعتماد ہو گا کہ جینا پر اپنے بھرپور تاثر اور ڈاکٹر لیوی کی سادگی کی بنیاد پر یوسف ان کا راستہ نہیں روک سکے گا..... اور وہ جینا کو اس کی دولت سمیت اس کی ناک کے عین نیچے سے لے اڑیں گے۔

اس نے جام کو اتنی سختی سے بھیجا کہ اس کی پوروں پر سفیدی ابھر آئی۔ ”ڈاکٹر دی، آپ بہت تیز ہیں۔ آپ بھی اور آپ کا بھتیجا بھی۔ میں یہ بات تسلیم کرتا ہوں۔ آپ کو بتاؤں کہ آپ کے بارے میں میرا کیا خیال ہے؟“

”میں ضرور سنتا چاہوں گا لیکن پہلے میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔“

”ضرور پوچھیں۔“

”تمہیں طویل العمری کی اس تھیوری کا خیال کیسے آیا؟ اس سے تمہاری ذہانت ثابت ہوتی ہے۔ کروڑوں انسان بائبل پڑھتے ہیں لیکن ان میں تم دوسرے آدمی ہو، میری معلومات کی حد تک جس نے باضابطہ طور پر اس کی جستجو کی تجویز پیش کی ہے۔ تم سے پہلے

”اچھا اس گاؤں میں ہے کیا؟“

”کچھ چھوٹی جھونپڑیاں ہیں، پتھر کے مکانات ہیں، کچھ غار ہیں، بہت سے معر اور عورتیں ہیں..... یہ وہ لوگ ہیں، جو اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ انہوں نے ڈاکٹروں کی نبیل العمری کا راز پالیا ہے۔“

یوسف سوچ رہا تھا، بڑھا واقعی بہت تیز ہے۔ میری پوری تھیوری اور گھڑی، مکمل کہانی پر قابض ہو بیٹھا ہے۔ ”یہ بتاؤ، کیا ان کا خیال درست ہے؟ کیا وہ واقعی طویل العمری کے راز سے واقف ہو گئے ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”یہ تو مجھے معلوم نہیں۔“

”اور وہ مادہ کس نوعیت کا ہے؟“

”کھمبی کی طرح کی کوئی چیز ہے۔ میرا خیال ہے، غاروں میں اگائی جاتی ہے۔“

”تم وہاں جا چکے ہو؟“

”ہاں۔“

”کیوں گئے تھے؟“

ویٹر ڈرنکس لے آیا۔ ڈاکٹر لیوی نے جیب سے چمڑے کا پرس نکال کر ڈرنکس اداہنگی کی پھر اس نے جام بلند کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری صحت کے نام مسٹر ڈیوڈن پھر اس نے یوسف کے سوال کا جواب دیا۔ ”تم بھول رہے ہو کہ میں سائنس داں ہوں میری فطرت میں تجسس بہت زیادہ ہے۔“ اس کی آنکھوں میں شرارت چمکی۔ ”اور اوجہ اور بھی تھی۔ میں وہاں بارزی لئی نام کے ایک شخص سے ملنا چاہتا تھا۔“

یوسف تہیہ کئے بیٹھا تھا کہ کچھ بھی ہو، وہ خود پر قابو رکھے گا۔ لیکن یہ نام اس کو اپنے رد عمل پر قابو نہیں رہا۔ ”بارزی لئی؟“ اس نے تقریباً چیختے ہوئے کہا ”تم مطلب ہے، وہاں جیج بارزی لئی نام کا کوئی آدمی موجود ہے؟“

ڈاکٹر لیوی کو اس کے تعجب پر کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ ”یہ کوئی ناموس نہیں..... خاص طور پر ہمارے خاندان میں۔“ اس نے کہا ”یہی وجہ ہے کہ میں بھی کہیں یہ نام سنتا ہوں تو ملاقات کے لئے بے چین ہو جاتا ہوں۔“

یوسف اب تک اتنی بری طرح نہیں دہلا تھا۔ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا بارزی لئی کا نام اس نے گھڑا تھا یا بین آئزک نے۔ ”اس بارزی لئی کی عمر کتنی تھی اس نے پوچھا۔“







وہ یروٹلم کی جس سڑک سے نکلے، وہ انہیں سوڑاؤں کے درے تک لے آئی۔  
زورہ اور تمناث سے گزر کر وہ سنگھار اور بے آب و گیاہ پہاڑیوں کے دوسری طرف  
وادی الجاہ میں پہنچے۔

اس قافلے میں دو ڈالر تھے، جنہیں جیپیں کھینچ رہی تھیں۔ ان میں سے ایک جینا  
ور راجیلہ کے لئے تھا اور دوسرے میں ڈاکٹر لیوی، بین آنزک اور یوسف تھے۔ اس کے  
علاوہ ایک اسٹیشن وگن تھی، جس میں سامان رسد تھا۔ جینا کی ذاتی بڑی لیوزین تھی جسے  
بوز ڈرائیو کر رہا تھا۔ قافلے میں باورچی کے علاوہ دوسرے ملازمین بھی تھے جو کیمپ لگانے  
اور اکھاڑنے کا کام کرتے تھے، اس کے علاوہ دیگر خدمات بھی انجام دیتے تھے۔

قافلے کی رفتار بہت ست تھی، وہ جگہ جگہ رکتے بھی تھے۔ ڈاکٹر لیوی اس تاثر کو  
بند کرنا چاہتا تھا کہ جینا ایک دولت مند عیسائی عورت ہے، جس کی اسرائیل آمد کا مقصد  
قدس مقامات کی زیارت اور بعض مقامات پر کھدائی کرنا ہے۔

ابتدا میں اس دکھاوے کی وجہ سے ہونے والی تاخیر جینا میکلم کو بے حد گراں گزری  
لیکن وہ یہ سوچ کر چپ رہی کہ آہستہ روی سے سہی، بہر حال اپنی منزل کی طرف بڑھ تو  
رہی ہے۔ وہ جب بھی کہیں رکتے تو اس سرزمین کا جادو سرچڑھ کر بولنے لگتا۔ خود جینا  
بھی اس کے سحر سے نہ بچ پاتی۔ پھر ڈاکٹر لیوی جیسا آدمی ان کے ساتھ تھا۔ وہ ہر مقام کے  
تاریخی حوالے کو یوں بیان کرتا کہ سنا باندھ دیتا۔ وہ ماضی سے عشق کرتا تھا اس لئے  
ایسے موقعوں پر اس کے بیان میں عجیب سا حسن اور رنگینی آ جاتی تھی۔

زورہ اور تمناث یادداشت کو جھنجھوڑنے والے نام نہیں تھے۔ زورہ عربوں کا ایک  
پہاڑی گاؤں تھا۔ وہاں ایک سینٹ فیکٹری تھی، جس کی عمارات نیچے وادی میں تعمیر کی گئی  
تھیں۔ تمناث چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کے درمیان واقع تھا۔

وہ سب جینا کے ساتھ اس کی لیوزین میں سفر کر رہے تھے۔ جینا سینٹ فیکٹری میں  
دیکھی لئے بغیر نہ رہ سکی۔ ”اس کا نام شمعون“ کے نام پر رکھا گیا ہے۔“ ڈاکٹر لیوی نے  
تلا۔ ”میں وہ پیدا ہوئے تھے اور اس پہاڑی کے قریب ہی کہیں دفن ہیں۔“

جینا نے بے دھیانی سے اثبات میں سر ہلایا۔ کار کچھ آگے گئی تو اس نے پلٹ کر  
دیکھا اور بولی ”تم نے سمسن ہی کہا تھا؟“

”جی ہاں۔ شمعون اور سمسن ایک ہی بات ہے۔“

کر سکتے ہیں۔ انتظامات کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ مس میکلم کی طرف سے بے فکر  
میں انہیں سنبھال لوں گا۔ اپنے ہدف کی طرف بڑھتے ہوئے وہ بالکل پریشان کن  
ہوں گی۔ میں نہیں چاہتا کہ اسرائیلی حکومت کو..... بلکہ کسی کو بھی اس بات کی  
ملے کہ درحقیقت ہم کہاں اور کس مقصد کے تحت جا رہے ہیں۔ خود تم نے بڑی ذہا  
سے اپنی مہم کو ایک آڑ فراہم کی تھی۔ ہم اسی آڑ سے استفادہ کریں گے۔ اچھا۔  
اب تم مطمئن ہو نا؟“

یوسف نے ایک گہری سانس لی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی اور ڈاکٹر لیوی کی جنگ ا  
ختم نہیں ہوئی ہے لیکن عقل مندی کا تقاضا یہی تھا کہ فی الوقت جنگ بندی کر لی جا۔  
اس نے کہا ”میں ایک بات اور جانا چاہتا ہوں۔ تم اتنی زحمت کیوں کر رہے ہو؟ اپنا  
چھوڑ چھاڑ کر اتنی دشواریاں جھیلتے ہوئے جینا میکلم کو بیت الجبل کیوں لے جا رہے ہو؟“  
ڈاکٹر لیوی جواب دینے سے پہلے چند لمحے اسے دیکھتا رہا، پھر اس نے ایک سر  
بھر کر کہا ”تم عجیب آدمی ہو مسٹر ڈیوڈسن۔ تم نے پرانے واقعات سے ایک قرن یا  
نظریہ اخذ کیا، پھر تم نے اس پر عمل کے لئے ایک دولت مند عورت کو آمادہ کیا۔ جو  
حیات کی تلاش کے سلسلے میں تم اس عورت کو فلسطین لے آئے۔ اب جبکہ تم اچھا  
کامیابی سے بہت زیادہ قریب پہنچ گئے ہو تو..... اتنے نزوس، اتنے ناخوش لگ رہے  
ہو۔“

”مجھے چھوڑو۔“ یوسف نے کہا ”میں تمہارا زاویہ نظر جاننے میں دلچسپی ر  
ہوں۔ تمہیں اس مشقت سے کیا حاصل ہو گا۔“

ڈاکٹر لیوی نے چند لمحے سوچنے کے بعد جواب دیا ”دیکھو..... میرے بھتیجے۔  
مس میکلم سے کچھ وعدے کئے، اپنے تخیل کے زور پر اسے کچھ خواب دکھائے۔ میں ا  
کا انکل ہوں..... خاندان کا بڑا۔ سو یہ میری ذمہ داری ہے کہ میں امکان کی حد تا  
اس کا قرضہ چکاؤں۔ یہ ہے اس معاملے میں میری دلچسپی کا سبب۔“

یوسف نے کندھے جھٹک دیے۔ ”اگر تم کہتے ہو تو یہی سہی“ اس نے کہا لیکن  
اسے یقین تھا کہ ڈاکٹر لیوی نے اسے سب کچھ نہیں بتایا ہے۔

ڈاکٹر لیوی نے جام خالی کر کے رکھ دیا۔ ”مسٹر ڈیوڈسن، برسوں کے بعد میں نے ا  
اچھا وقت گزارا ہے..... اتنا انجوائے کیا ہے۔“ اس نے بڑی سچائی سے کہا۔ اس ا  
آنکھوں میں معصومیت تھی۔ ”میں اس کے لئے تمہارا شکر گزار ہوں۔“

”یہاں ایک صاحب ایمان شخص نے اپنے سے کہیں طاقتور ایک گھمنڈی اور شیخی  
رے کاغذور خاک میں ملایا تھا۔“ ڈاکٹر لیوی نے جواب دیا۔

یوسف نے بڑھے اسکار کو گھور کر دیکھا۔ اسے اس کا جملہ ذومعنی محسوس ہوا تھا۔  
نے اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ ڈاکٹر کہیں اس پر طنز تو نہیں کر رہا ہے لیکن ڈاکٹر  
نے اس کے چہرے پر صرف معصومیت تھی۔ وہ وادی کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن درحقیقت  
اس کی نگاہیں دور بہت ماضی میں جھانکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

”یہ وہ مقام ہے، جہاں داؤد نے دست بدست لڑائی میں گولائے کو ہلاک کیا تھا۔“  
اس سادہ سے جملے میں جیسے کوئی سحر تھا جس نے سب کو اسیر کر لیا۔ یوسف نے  
جسم میں سنسنی دوڑتی ہوئی محسوس کی۔

”کیا..... کیا کام تم نے؟ کوئی جگہ ہے یہ؟“ جینا نے چونک کر پوچھا۔  
”درہ ایلاہ کے اوپر وادی السنہ کے اس سرے پر بنو اسرائیل تھے جو وحشیوں  
مات جنگ میں تھے۔“ ڈاکٹر لیوی نے کہا۔

”واقعی؟“ راحیلہ نے پر اشتیاق لہجے میں پوچھا۔  
ڈاکٹر لیوی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے وادی کی طرف اشارہ کیا۔ ”دونوں  
ان کے جنگ سے گریز کو سمجھنے کے لئے فوجی ماہر ہونا ضروری نہیں، یہ بات ایک عام  
لی بھی سمجھ سکتا ہے۔ بنو اسرائیل اس طرف والے پہاڑ پر تھے جبکہ دوسری چوٹی پر  
لی قابض تھے۔ وادی اتنی تنگ تھی کہ صرف قتل عام کے لئے ہی موزوں سمجھی جاسکتی  
تھی۔ کوئی فوج بھی اپنی بلندی کی پوزیشن سے دستبردار نہیں ہونا چاہتی تھی اور حملہ کرنے  
لئے نیچے اترنا ضروری تھا۔ ہم اس وقت جہاں کھڑے ہیں، یہاں سے دیکھ کر بھی  
اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ بنو اسرائیل نسبتاً مضبوط پوزیشن میں تھے اسی لئے وحشیوں نے  
ان طرف سے ایک ایک منتخب جنگجو کے درمیان مبارزت کی تجویز پیش کی۔ انہیں یہ  
رہنمی تھا کہ ان کے پاس گولائے جیسا دیو پیکر اور طاقتور لڑاکا موجود ہے۔.....“  
”تو..... تو وہ لوگ حقیقت تھے..... سچ سچ کے تھے؟“ راحیلہ کے  
میں حیرت تھی۔

”بین آئزک نے خفگی سے کہا ”تو کیا تم انہیں افسانوی کردار سمجھتی رہی ہو؟“  
راحیلہ گڑبڑا گئی۔ ڈاکٹر لیوی، ”بین آئزک کی برہمی پر مسکرایا، ”اب تصور کرو۔ پھر  
مذہم ہو چکا تھا، وہ دھات کا زمانہ تھا۔ جنگجو آہنی نیزوں، ڈھالوں اور خودوں سے لیس

وہ تمنائے پہنچے تو ڈاکٹر لیوی نے کھنڈرات کی طرف اشارہ کیا ”کبھی یہ جگہ سر  
تھی۔ یہاں جامنی انگوڑوں کی بیللیں تھیں۔ آپ نے بائبل میں اس کا تذکرہ پڑھا ہوگا  
وہ جینا سے مخاطب تھا۔

جینا نے نفی میں سر ہلایا۔ اس کا ذہن تو شمال کی آرزو میں الجھا ہوا تھا، جہاں لوگ  
کے پاس شجر حیات کا راز موجود تھا..... جہاں کے لوگ بے حد طویل عمریں پاتے تھے  
”بائبل میں اس کا تذکرہ کچھ یوں ہے کہ شمعون تمنائے واپس آئے۔ انگوڑ  
باغ کے قریب ان کا ایک شیر سے سامنا ہوا اور انہوں نے شیر کی گردن یوں مروڑ دی  
جیسے وہ کسی بچے کی نازک سی گردن ہو۔“ ڈاکٹر لیوی نے کہا ”اور یہی وہ مقام ہے، جہاں  
وہ واقعہ پیش آیا تھا۔ اس وقت یہ جگہ سرسبز تھی مگر اب سنگلاخ زمین ہے۔ اب یہاں  
دھول اڑتی ہے لیکن ایک بار پھر یہ زمین ابلھائے گی۔“ اس کے لہجے میں یقین تھا۔  
جینا نے پھر اثبات میں سر ہلایا۔

ڈاکٹر لیوی نے آگے جھک کر عبرانی میں ڈرائیور سے کچھ کہا۔ ڈرائیور نے گاڑی  
سڑک سے اتار لی۔ وہ سڑک انہیں شمال میں لیڈا کی طرف لے جاتی۔ اب گاڑی کے  
راستے پر دوڑ رہی تھی۔ وہ راستہ انہیں دوبارہ پہاڑوں میں لے جا رہا تھا۔ ایک چٹانی چیم  
کے پاس پہنچ کر ڈرائیور نے کار روک دی۔ وہ ایک تنگ ریتیلی وادی تھی، جسے دو چشمور  
نے تقسیم کر دیا تھا۔

ڈاکٹر لیوی نے بین آئزک سے کہا ”جانتے ہو، اس وقت کہاں کھڑے ہو؟“  
”نہیں۔ کیا یہاں جنگ ہوئی تھی؟“  
”یہ وادی ایلاہ ہے۔“

بین آئزک کے حلق سے ہلکی سی چیخ نکلی۔ ”اوہ..... مجھے سمجھ جانا چاہئے تھا۔“  
اس نے جلدی سے کار کا دروازہ کھولا اور جینا سے بولا ”پلیز ماں..... یہاں تھوڑی دیر  
ٹھہر جائیں۔ آہ..... میں نے کتنی بار اس جگہ کو خواب میں دیکھا ہے۔“  
یوسف نے جینا کی بد مرگی بھانپ لی ”کیوں بھی..... کیا خاص واقعہ پیش آیا تھا  
یہاں؟“ اس نے زہریلے لہجے میں پوچھا۔

وہاں تین جانب پہاڑیاں تھیں۔ نیچے درمیان میں ایک گھاٹی تھی اور ریل میل  
چوڑی سطح زمین کی ایک پٹی تھی، جہاں گندم اور جو کاشت کی گئی تھی۔ ایک چھوٹے سے  
قطرے پر سورج مکھی کے پودے تھے۔

زردوں نے طاقتوروں کو زیر کیا تھا۔ وہ اب داؤد کا خطاب دہرا رہا تھا۔ ”تم میرے اہلے میں تلوار، نیزہ اور ڈھال لے کر آئے ہو جبکہ میں خدائے پاک کی طرف سے آیا ہوں جس کے تم منکر ہو۔“

جینا محرزہ سی سن رہی تھی۔ اب جیسے اسے بیت الجبل پہنچنے کی جلدی نہیں تھی شاید اس لمحے اسے بیت الجبل یاد بھی نہیں تھا۔

”سو آج کے دن خدائے پاک نے مجھے تم پر فوقیت عطا فرمائی۔ میں تمہیں زیر ہوں گا۔“ خاک میں ملاؤں گا اور آخر میں تمہاری گردن تن سے جدا کر دوں گا۔“

آنکھ دہرا رہا تھا۔ اس کے لمبے میں عجیب سا دبہ تھا۔ جینا کو اب اس سرزمین کے سحر نے پوری طرح اسیر کر لیا تھا۔ پہلی بار اسے احساس رہا تھا کہ وہ جو خدا کو مانتی تھی تو اس یقین میں بھی ایک طرح کا پھیکا پن تھا۔ بے لگتھی۔ خدا اس کے لئے اب تک محض ایک لفظ رہا تھا۔ سفید کانڈ پر چھپا ہوا نام جو کتب کی جلد کے درمیان مقید تھا، لیکن اب پہلی بار اسے احساس ہو رہا تھا کہ نایک متحرک قوت ہے۔

”ہمیں لچ لید میں کرنا ہے۔“ یوسف نے یاد دلایا۔

محر جیسے ٹوٹ گیا۔ وہ سب گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔ سفر شروع ہو گیا۔

وہ عجیب سرزمین تھی۔ وہاں قدیم و جدید آپس میں گھل مل جاتے تھے۔ گاؤں میں ف سحرے مکانات تھے۔ بنگلے، جن کے سامنے پھولوں کی روشیں تھیں۔ جا بجا چھوٹے رے باغ تھے، مغرب کی طرف بہت اونچا ٹیلا تھا جہاں کھدائی کی گئی تھی وہاں سے ہڈیاں انک رہی تھیں۔ وہاں کھڑے ہو کر انہوں نے دیواروں کے آثار دیکھے۔ یہ وہ دیواریں تھیں جہاں سول اور اس کے بیٹوں کو قتل کیا گیا تھا اور ان کی سریریدہ لاشیں لٹکی ان کے منوں کی بے رحمی اور سفاکی کی کہانیاں سناتی رہی تھیں۔ یہ مقام بیت اشمن تھا۔ یہ سفر دوران پہلا مقام تھا جہاں عہد نامہ قدیم و جدید یکجا ہوتے نظر آئے تھے۔

وہ اس ٹیلے سے واپس آرہے تھے، جو در حقیقت مدفن تھا کہ ڈاکٹر لیوی نے اچانک لہ ”یسوع مسیح“ بھی یہاں ایک بار آئے تھے۔ انہوں نے یہاں دو کوڑھیوں کو خدا کی مٹی سے شفا بخشی تھی۔“

جینا حیرت سے اسے دیکھتی رہی۔ ”یہاں! یسوع مسیح!“

”ہاں“ وہ اس مقام سے واقف تھے۔ نزارتھ یہاں سے بمشکل پندرہ میل دور

تھے۔ دونوں طرف ہزاروں جنگجو تھے، جو نہ پہل کرنا چاہتے تھے اور نہ محاذ چھوڑنے لئے تیار تھے۔“

ڈاکٹر لیوی کی آواز اور لہجہ تخیل کو ممیز کر رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان سب نگاہوں کے سامنے دو قدیم فوجیں صف آرا ہو گئیں۔ فوجوں کی نقل و حرکت کے نتیجے اٹھنے والے گردوغبار کے بادل تک جیسے مجسم ہو گئے۔ ریت پر منعکس ہوتی دھوپ ڈھالیں چمکانے لگیں۔

ڈاکٹر لیوی نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”یوں نو عمر چرواہا آگے آیا۔ اس کے پا ایک غلیل، پانچ گول ہموار چھوٹے پتھر اور خدا پر یقین کامل کے سوا کچھ بھی نہیں امکان یہی تھا کہ وہ پتھر اس نے یہیں چشمے کے کنارے سے اٹھائے ہوں گے۔ یہیں کے درمیان مقابلہ ہوا۔۔۔۔۔۔ شاید اسی جگہ، جہاں مندیم کی فصل اور سورج مکھی کے کے درمیان دیوار ہے۔ دیو قامت گولانٹھ نوٹ کا تھا۔۔۔۔۔۔“

”تمہیں یقین ہے اس پر؟“ یوسف نے مزاحیہ لہجے میں دریافت کیا۔

ڈاکٹر لیوی نے سرگھما کر اسے دیکھا۔ ”تم سے زیادہ تو نہیں ہو گا۔“ اس نے جواب دیا ”تم ہی نے تو بین آنکھ کو بتایا تھا کہ پرانے ڈھانچے کی دریافت سے پرانے لوگوں۔ دیو قامت ہونے کی تصدیق ہوئی ہے۔“ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ”گولانٹھ کے بار۔ میں میرا اندازہ ہے کہ وحشی اسے اس انداز میں استعمال کرتے ہوں گے، جیسے اب دنیا استعمال کئے جاتے ہیں۔ اسے روکنے والی کوئی طاقت نہیں تھی لیکن جذبہ ایمانی کے زور غلیل سے پھینکے گئے ایک چھوٹے سے پتھر نے اسے تباہ کر دیا۔“ اس نے توقف کیا اور پھر جینا میلکم کی طرف مڑا۔ ”میرا خیال ہے، اب واپس چلیں۔“

وہ پہلا موقع تھا کہ جینا کے انداز میں غلج نہیں تھی۔ وہ کوئی جواب دینے بجائے نیچے وادی میں چشمے کے کنارے کو دیکھتی رہی۔۔۔۔۔۔ جیسے اس کی آنکھوں سامنے اس قدیم معرکے کا منظر ہو۔ پھر اس نے کہا ”مجھے سب کچھ سناؤ۔“

ڈاکٹر لیوی نے بین آنکھ سے کہا ”تمہیں یاد ہے؟“

بین آنکھ ایک چٹان سے ٹیک لگائے، ایک جنگجو کے نقطہ نظر سے اس مبارزہ کا تجزیہ کر رہا تھا۔ وہ دونوں فوجوں کی عسکری پوزیشن کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ڈاکٹر لیوی کی آواز سن کر وہ چونکا ”وحشیوں کی جانب سے گولانٹھ آگے بڑھا۔ اس کا قد۔۔۔۔۔۔ وہ خواب ناک لہجے میں دنیا کی اس قدیم ترین جنگ کا احوال بیان کرتا رہا، جس میں

اب اسے لگ رہا تھا کہ اس نے کچھ بھی نہیں دیکھا۔ اسے اپنی دنیا بہت چھوٹی لگنے لگی تھی۔ اسے اپنے وجود میں بڑے بڑے خلا محسوس ہو رہے تھے اور اس بات کی خوشی تھی کہ اب وہ خلا آہستہ آہستہ بھر رہے ہیں۔

وہ جانتی تھی کہ خدا ہر جگہ موجود ہے اور ہر چیز میں جلوہ نما ہے لیکن مایا جال میں بھی نگاہ اسے دیکھ نہیں پاتی۔ لیکن یہاں اس سرزمین پر آنکھ سب کچھ دیکھنے لگتی ہے۔ اب کچھ سمجھ میں آنے لگتا ہے۔ ہر طرف جلوہ نما..... ہر طرف..... ہر طرف۔

اور وہاں کام ہو رہا تھا۔ جوان اور بوڑھے..... سب مل کر کام کر رہے تھے۔ وہ ملیں اگا رہے تھے۔ برہنہ، بے آب و گیہا پہاڑوں پر شجرکاری ہو رہی تھی۔ پانی کے مولے لے لئے کھدائی کی جا رہی تھی۔ کہیں کوئی فیکٹری تعمیر ہو رہی تھی تو کہیں مکانات لے جا رہے تھے۔

مگر ایک بات اسے بری لگی۔ اس سرزمین کے باشندوں کو ترقیاتی کاموں میں لانا دیا گیا جا رہا تھا۔ فلسطینی مسلمانوں کے گاؤں بد حالی کی بدترین مثال تھے۔ وہاں غربت تھی۔ جینا جیسی بے نیاز عورت کو بھی ان کی غربت کا اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی اور انے اس کا نظارہ بھی کر دیا۔

”یہ ست لوگ ہیں۔ کچھ کرنا ہی نہیں چاہتے۔“ ڈاکٹر لیوی نے بتایا۔

”غربت کے مارے ہیں، وسائل کی کمی ہے۔ اگر انہیں وسائل میسر ہوں..... انہم کر دیے جائیں.....“

”تب بھی کچھ نہیں ہوگا۔“ ڈاکٹر لیوی نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”یہ نہ بھولیں کہ یہ صدیوں اس سرزمین کے مالک رہے ہیں۔ ان کی کابلی اور تانکارہ پن نے اس زمین کو صحرا بنا کر رکھ دیا ہے، اجاڑ دیا ہے اسے۔ ہم اس زمین کو اس کی شادابی لوٹانے کے لئے جان مار رہے ہیں۔“

”لیکن یہ ہے تو انہی کی۔“ یوسف نے بے ساختہ کہا۔ اس نے خود کو قابو میں کئے کی کوشش کی تھی لیکن وہ چپ نہ رہ سکا۔

”ان کی نہیں..... یہ زمین پوری دنیا کے لوگوں کی ہے.....“

”لیکن انہی پر تنگ کر دی گئی ہے۔“ یوسف نے کہا۔ وہ اب بھی اس گفتگو کو ایات کی حدود سے دور رکھنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ تم لوگوں نے ناپ زمین تنگ کر دی ہے لیکن اس نے عین وقت پر الفاظ تبدیل کر دیے تھے۔ وہ جانتا

”نزار تھ!“ جینا نے دہرایا اور گرد و پیش کا یوں جائزہ لیا، جیسے اس مقام کو پہلی دیکھ رہی ہو۔ جیسے دنیا ہی بدل گئی ہو۔ وہ کھیت، وہ پہاڑیاں، وہ مکان..... ”نزار تھ قریب ہے!“ اس کی مٹھیاں بھینچ گئیں۔ پھر اس نے ایک ہاتھ اپنے سینے پر رکھ کر ”نزار تھ کیوں نہ چلیں ڈاکٹر؟“ اس نے کہا۔

یوسف نے جلدی سے کہا ”وہ ہمارے راستے سے ہٹ کر ہے مس میکم۔ وہاں پہنچنے کے لئے ہمیں راستہ بدلنا پڑے گا اور اگر ہم نے قیام کیا تو ایک اور دن ضائع جائے گا۔ ہمیں تو ٹائمرس سے گزرنا ہے اور ہم جس قدر جلد.....“

جینا نے اثبات میں سر تولا دیا لیکن درحقیقت وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔ وہ ڈاکٹر لیوی کی طرف مڑی۔ ”کیوں ڈاکٹر، نزار تھ راستے سے ہٹ کر ہے؟“

ڈاکٹر لیوی چند لمحے اس سوال پر غور کرتا رہا۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی بالآخر اس نے کہا ”نزار تھ کچھ لوگوں کے دلوں میں ہوتا ہے، ان کے لئے یہ مسافت ایک قدم کی ہوتی ہے اور کچھ ایسے ہوتے ہیں جو اس کے لئے ہزاروں میل کا سفر طے کر۔ ہیں، پھر بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔“

”ایک قدم..... اور ہزاروں میل.....“ جینا نے خواب ناک لہجے میں دہرایا۔

وہ سب جینا کو بغور دیکھ رہے تھے۔ پہل راحیلہ نے کی۔ اس نے کہا ”فاصلہ زیادہ تو نہیں مس میکم! ہمیں وہاں جانا چاہیے۔“

جینا نے ایک لمحے اسے حیرت سے دیکھا۔ پھر سخت لہجے میں بولی ”میں نزار تھ جا چاہتی ہوں مسٹر ڈیوڈسن!“

یوسف نے کندھے جھٹک دیے۔ وہ راحیلہ کے رویے کا تجزیہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔



سفر جاری تھا۔ اس دوران فلسطین کی منفرد اور انوکھی فضا جینا میکم پر اثر انداز رہی تھی۔ اس نے اپنی شخصیت پر جو خول چڑھایا ہوا تھا، وہ چٹ رہا تھا۔ اس نے زندگی صرف دولت کماتے، دولت بڑھاتے گزاری تھی۔ سفر اس نے متعدد کئے تھے لیکن پر تعیش۔ اور وہ ہمیشہ شہروں میں رہتی تھی۔ اس نے صحرا نہیں دیکھے تھے، جنگل نہیں دیکھی

رہے ہیں۔ حقائق ہمیں غائب نہیں، فلسطینیوں کو لاپچی اور کامل ثابت کرتے ہیں۔  
 ”اول تو مجھے اس بات پر یقین نہیں۔“ یوسف نے تیز لہجے میں کہا۔ اسے اب خود  
 جرت ہو رہی تھی۔ اسے بین آنزک سے اپنی پہلی ملاقات یاد آئی۔ بین آنزک  
 فلسطینیوں سے بحث کر رہا تھا۔ ایسے میں اس نے بین آنزک کو سمجھاتے ہوئے کہا  
 ..... ”یہ مت بھولو کہ تم اس وقت ایک جذباتی قوم کے درمیان ہو۔“ اس وقت  
 کا انداز ایسا تھا جیسے وہ اس قوم کا فرد نہیں۔ لیکن اب وہ خود جذباتی ہو رہا تھا۔ ایسا پہلے  
 ہی نہیں ہوا تھا۔ اس وقت وہ تقریباً اسی پوزیشن میں تھا جس میں بین آنزک کو کراچی  
 دوچار دیکھا تھا۔ وہاں بین آنزک کے چیتھڑے اڑ سکتے تھے تو یہاں وہ خود اسی نوعیت  
 کے خطرے سے دوچار تھا۔ اس کا دماغ تو کام کر رہا تھا لیکن اسے اپنی زبان پر اختیار نہیں  
 تھا۔ ”اور اگر یہ درست بھی ہے تب بھی تم جانتے ہو کہ یوں نہ ہوتا تو یہ کام کسی اور  
 ج ہوتا۔ اسرائیل تو ایک بین الاقوامی سازش کے تحت قائم ہوا ہے۔“  
 ”حقائق میں اگر مگر کی گنجائش نہیں ہوتی۔“ ڈاکٹر لیوی نے سرد لہجے میں کہا ”اور  
 اپنی بات ثابت کر سکتا ہوں لیکن مجھے اندازہ نہیں تھا کہ امریکا میں کوئی ایٹنی اسرائیل  
 ابھی موجود ہے۔“

گفتگو اب نہایت خطرناک مرحلے میں داخل ہو گئی تھی۔ یوسف کو اپنے ہاتھ پاؤں  
 دھوتے ہوئے محسوس ہوئے تاہم اس نے جواب دینے میں دیر نہیں لگائی۔ ”امریکا  
 جمہوری ملک ہے، وہاں اظہار رائے کی آزادی حاصل ہے، اور یہ سوچ رکھنے والا میں  
 مد آدمی بھی نہیں ہوں وہاں۔“

”چھوڑو اس بحث کو۔“ جینا نے حکمانہ لہجے میں کہا۔ پھر وہ ڈاکٹر لیوی کی طرف  
 لہ۔ ”مگر میں اتنا ضرور کہوں گی کہ تم لوگ مقامی لوگوں کو، عرب بستیوں کو نظر انداز  
 کے زیادتی کر رہے ہو۔ ان کے ساتھ بھی اور اپنے ساتھ بھی۔“

”میں یہ بات تسلیم کرتا ہوں اس لئے کہ مجھے اس سرزمین سے ہی نہیں، اس کے  
 غلاموں سے بھی محبت ہے۔“ ڈاکٹر لیوی نے نرم لہجے میں کہا ”لیکن میں بااثر لوگوں کے  
 لئے اپنا موقف دہرانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا۔ اسرائیل بھی ایک جمہوری ملک  
 ہے۔“

یوں بات ختم ہو گئی۔ پہلی بار یوسف کو ڈاکٹر لیوی پر فتح کا احساس ہوا۔ ڈاکٹر لیوی  
 فطرتاً انداز اختیار کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ مگر دل ہی دل میں وہ یہ تسلیم کرنے پر مجبور تھا

تھا کہ اس کے لئے اس بحث میں پڑنا نہ صرف فضول بلکہ مخدوش ہے۔ اس سرزمین پر  
 اسے جوزف ڈیوڈسن ہی رہنا تھا۔ اس کے یوسف ہونے کا راز کھل جاتا تو شاید وہ زندہ  
 نہ بچتا لیکن وہ اپنی ماں کی خواہش کے عین مطابق خالص مسلمان تھا اسی لئے اس  
 مسلمانوں کی برائی نہیں سنی جا رہی تھی۔

”زمین تو یہاں ہم پر تنگ کر دی گئی تھی.....“ ڈاکٹر لیوی نے کہا۔

”میرا خیال ہے، آپ کے اجداد خود یہ زمین چھوڑ بھاگے تھے اور وجہ وہی تھی  
 اب آپ فلسطینیوں سے منسوب کر رہے ہیں۔ آسمانی کتابیں گواہی دیتی ہیں کہ آپ کا  
 اور ناکارہ تھے۔ آپ لوگ تو یہ چاہتے تھے کہ آپ کی جنگ بھی خدا لڑے.....“

”یہ درست ہے۔“ ڈاکٹر لیوی نے اداس لہجے میں کہا ”لیکن مجھے خوشی ہے  
 میری قوم نے صدیوں کی بے گھری سے سبق سیکھ لیا۔ یہ زبانی بات نہیں، اس کا  
 مظاہرہ تم خود قدم قدم پر دیکھ رہے ہو۔ اب ہم محنت کرتے ہیں اور جو غلطی ہم کر  
 رہے تھے، وہ اب عرب مسلمان کر رہے ہیں.....“

”لیکن کہلاؤ گے تو غائب ہی۔“ یوسف ایک کیفیت میں بولے جا رہا تھا.....  
 چاہنے کے باوجود۔

”کیوں؟ اس زمین پر ہمارا حق نہیں؟“

”جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، صلیبی جنگیں“ یوسف نے بروقت خود کو روک لیا  
 وہ کہنا چاہ رہا تھا کہ صلیبی جنگیں ہم نے لڑی ہیں۔ عیسائیوں کے ساتھ۔ ایک لمحے  
 توقف کے بعد اس نے اپنا جملہ پورا کیا۔ ”ہم نے مسلمانوں سے لڑیں۔ تم نے تو  
 زحمت نہیں کی۔ اور تم جانتے ہو کہ اسرائیل کیسے وجود میں آیا۔ تم غائب نہ  
 تو.....“

”بے خبر لوگ ہمیں غائب کہیں تو مجھے برا نہیں لگتا۔“ ڈاکٹر لیوی نے سادہ  
 میں کہا ”لیکن کم از کم فلسطینیوں کو ہمیں غائب نہیں کہنا چاہئے۔ جانتے ہو، دولت  
 یہودیوں نے جب فلسطین کا رخ کیا تو فلسطینیوں کی زمینیں خریدیں۔ فلسطینیوں نے ان  
 بے وقوفی پر مسکراتے ہوئے ہنسی خوشی اپنی زمینیں انہیں بیچ دیں۔ یہ سوچ کر کہ انہیں  
 اور ناکارہ زمین کے دام مل رہے ہیں۔ انہیں یقین تھا کہ آخر میں وہی زمین انہیں  
 واپس مل جائے گی کیونکہ یہودیوں کو بالآخر مایوس ہو کر واپس جانا ہے، لیکن  
 فلسطینیوں ہی کے حصے میں آئی۔ تم نے دیکھ ہی لیا کہ یہودی کتنی محبت اور محنت سے

قرب کھڑے ایک اور شخص نے کہا ”یہ کئی دن سے اس کے لئے پریشان تھا۔  
اپے جیسے یہ کوئی نھنھی کو نھل نہیں، اس کا نوزائیدہ بیمار بیٹا ہو۔“  
وہ سب مکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

چینا نے کہا ”اے میری طرف سے مبارکباد دو۔ کہو کہ اس نے بہت بڑی جنگ  
جیتی۔ بہت بڑی کامیابی حاصل کی ہے۔“

”اور اسے یہ بھی بتاؤ کہ اس درخت سے سایہ حاصل کرنے تک یہ بہت بوڑھا ہو چکا ہو گا۔“ یوسف نے کہا۔

اس بار روسی یہودی نے زوردار قہقہہ لگایا پھر اس نے عبرانی میں ہی جواب دیا۔  
 ”یہ کہہ رہا ہے کہ پودا میں نے اپنے لئے نہیں لگایا۔“ ڈاکٹر لیوی نے ترجمانی کی۔  
 ”یہ اس نے اپنے بیٹے کے لئے لگایا ہے۔“ پھر وہ یوسف سے مخاطب ہوا۔ ”جو قوم محنت  
 کرتی ہے، اس کے لئے عمر کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی، وہاں صرف تسلسل ہوتا ہے.....  
 زندگی کا تسلسل!“

ان کی گاڑی آگے بڑھی تو بین آئزک نے سیلیوٹ کے انداز میں روسی کی طرف توجہ بلند کیا۔ ان کی نظریں ملیں۔ دونوں کی آنکھوں میں شناسائی چمکی پھر روسی نے جواباً سیلیوٹ کہا۔

گلابی ذرا آگے بڑھی تو ڈاکٹر لیوی نے یوسف سے کہا ”مسٹر ڈیوڈسن، تم پاکستان  
 لپیدا ہوئے ہو نا؟“

”لپیدا ہوئے ہو تا؟“

”جی ہاں۔“

”تو تم نے اقبال کو یقیناً پڑھا ہو گا۔“

”کون اقبال؟“

”اقبال..... شاعر، مفکر اقبال۔“

یوسف گمراہ ہوا گیا مگر اس نے تیزی سے خود کو سنبھالا۔ ”اقبال کو ہر پاکستانی پر دھتا ہے“ اس نے جواب دیا۔

”لیکن عمل نہیں کرتے۔“

”کیا مطلب؟“

”یہ ایرانی، وہ تورانی، یہ ہندی، وہ خراسانی  
تو اے شرمندہ ساحل اچھل کر بے کراں ہو جا“

کہ ڈاکٹر لیوی بھی کسی حد تک درست کہہ رہا ہے۔ پانی کی تلاش میں زمین کا سینہ کے لئے ضروری نہیں کہ بھاری وسائل موجود ہوں۔ دو مضبوط بازو، ایک کدال پھاوڑا اور کچھ کرنے کا جذبہ بھی کرشمہ دکھا سکتا ہے۔ فلسطین کی زبوں حالی کے ذہ خود فلسطینی تھے اور ان کے عرب حکمران۔ انہوں نے اس سرزمین کی دیکھ بھال دیانت داری سے ادا نہیں کیا تھا۔

اب وہ جس سڑک پر سفر کر رہے تھے اس کے اطراف میں درخت لگائے جا تھے۔ پودے ابھی بمشکل ایک فٹ اونچے ہوئے تھے۔ صحرا کی تپتی دھوپ میں شجر کا کام ہو رہا تھا۔ بائیسوں اور ڈیوں میں پانی بھر بھر کے لایا جا رہا تھا۔ کام کرنے والے بدن سے ننگے تھے۔ ان کے جسموں پر ہینہ چمک رہا تھا۔ چشموں اور کنوؤں سے بڑے ڈرموں میں پانی لانے کا کام ٹرکوں سے لیا جا رہا تھا۔

وہ جو وہ کا علاقہ تھا، جسے اگلے پچیس برس میں جنگلاتی علاقہ بنانے کا پروگرام تھا راستے میں ان کا قافلہ جا بجا رکتا رہا۔ ڈاکٹر لیوی رک کر کام کرنے والوں سے کرتا، کچھ پوچھتا اور ان کی حوصلہ افزائی کے لئے کچھ نہ کچھ کہتا۔ اسے جیسے وہاں جانے والے ہر کام میں دلچسپی تھی۔ وہ جیسے بیک وقت تین دنیاؤں میں رہ رہا تھا۔ میں، جو ان ٹیلوں کے پیچھے مدفون شہروں اور قلعوں میں دھڑک رہا تھا۔ حال میں، جو کی نگاہوں کے سامنے تھا اور مستقبل میں جو اس کے تصور میں تھا۔ یوسف اس چڑنے کے باوجود اسے پسند کرنے پر مجبور تھا۔

ایسے ہی ایک موقع پر انہیں ایک قوی الجبہ، بارش رومی نظر آیا۔ اس کا بالائی بدن دھوپ میں متمتا رہا تھا۔ رنگت جھلس گئی تھی۔ وہ زمین سے سر نکالتے ہو ایک ننھے سے پودے پر جھکا ہوا تھا۔ اجڑی ہوئی اس زمین پر وہ بھری بھری نئی نیلی کو مستقبل کی علامت معلوم ہو رہی تھی۔ وہ رومی یسودی پودے کے ارد گرد کی مٹی چھتھپتا رہا تھا۔ پھر اس نے چھوٹے سے ڈبے سے مٹی پر پانی ڈالا۔

ان کی موجودگی کا احساس کر کے روسی اٹھا اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس کا چہرہ میں نہا رہا تھا۔ پسینے کے قطرے پودے کے ارد گرد کی نرم مٹی پر ٹپک رہے تھے۔ اس آنکھوں میں افتخار تھا۔ اس نے جینا کو دیکھ کر عبرانی زبان میں کچھ کہا۔ اس کی بات سن ڈاکٹر لیوی نے قہقہہ لگایا۔ ”یہ کہہ رہا ہے، تم پر سلامتی ہو چھوٹی ماں۔ جنگ بہت تھی لیکن میں جیت گیا ہوں۔ یہ پودا شجر بن کر رہے گا۔“ اس نے جینا کو بتایا۔



اپنی تکلیف نہیں ہوتی۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس کے اندر آہستہ آہستہ ایک انقلاب  
لہان کی طرح سر اٹھا رہا ہے۔

تمام راستے وہ یہی کچھ دیکھتے رہے۔ ایک مملکت تعمیر کے مرحلے سے گزر رہی  
نہی۔ وہاں کوئی شخص بیکار نہیں تھا۔ ہر شخص کام کر رہا تھا، ایسے جیسے برسوں کے کسی بے  
مرد کوئی جھوپڑی مل جائے تو وہ اسے پہلے کچا اور پھر پکا مکان بنانے کی کوششوں میں لگ  
جاتا ہے۔ پھول پودے اگانے کی کوشش کرتا ہے۔ جب بے گھری کے بعد یہ حال ہوتا ہے  
تو بے وطنی..... اور وہ بھی صدیوں کی بے وطنی تو بہت بڑی محرومی ہوتی ہے۔ یہ اس  
بے وطنی کا رد عمل تھا اور ان محنت کرنے والوں کے چہرے فخر سے چمک رہے تھے۔ آدمی  
بے گھری کے بعد گھر بناتا ہے تو کتنا فخر محسوس کرتا ہے۔ تو ایک ملک تعمیر کرنے والوں کے  
لڑکی کوئی حد ہو سکتی ہے۔

جینا کو وہ سب کچھ دیکھ کر آزادی کے بعد کا پاکستان یاد آگیا۔ اس وقت لوگوں نے  
کس جذبے سے ملک کی معیشت کی تعمیر کا کام کیا تھا مگر نہ جانے کیوں، اب وہ جذبہ سرد  
ہوا تھا۔ جینا کو پہلی بار احساس ہوا کہ انگریز والدین کی بیٹی ہونے کے باوجود وہ پاکستانی  
ہے..... اور نہ جانے کب سے ہے۔ اب اسے احساس جرم ہو رہا تھا کہ دولت  
دہانے کی دھن میں وہ سب کچھ بھول گئی تھی۔ اس نے کچھ بھی تو نہیں کیا تھا جو اسے  
لانا چاہئے تھا۔ پاکستان اس کا ملک تھا..... وہ پاکستانی قوم سے تھی..... لیکن اس  
نے استطاعت کے باوجود اپنے لوگوں کے لئے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔

جینا میکم بھی اس مقدس سرزمین پر ایک بہت بڑے باطنی انقلاب سے گزر رہی  
تھی۔ اس کے پتھر دل میں جو تک لگ رہی تھی!

دھوپ میں نہائی ہوئی چیزیل کی وادی سے نکل کر وہ گیلی لی کی تپتی پہاڑیوں کے  
ایمان مل کھاتی سڑک پر بڑھے، جو نزار تھ کی طرف جا رہی تھی۔ چھ بجے کے بعد وہ  
نارتھ پینچے تو سورج غروب ہونے والا تھا۔ قدیم شہر کے چاروں طرف پہاڑوں پر  
نمیرے نے بیرا کرنا شروع کر دیا تھا۔

وہ گیلی لی ہوٹل پہنچے جو درحقیقت ایک قدیم کارواں سرائے تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے  
پتھر عرب بچوں اور عرب گائیڈوں میں گھر گئے۔ وہ سب انہیں جوزف کی کار پینٹر  
لپ اور سینٹ جوزف چرچ دکھانے کے درپے تھے۔ ایک گائیڈ انہیں مقدس کنواری کا  
ٹمرا دکھانا چاہتا تھا، جو اب بھی بہتا تھا۔ سڑک پر گرد اور گرمی کے بگولے اٹھ رہے تھے۔

یہ اقبال ہی کا شعر ہے نا؟

”جی ہاں۔“

”اور..... ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے۔ نیل کے ساحل سے۔“

تباہ خاک کا شعر..... یہ بھی اقبال ہی نے کہا تھا؟

”جی ہاں۔“

”یعنی ملت کا یہ تصور پاکستان میں پیش کیا گیا لیکن پاکستانی مسلمان اب تک،

پنچان، سندھی، بلوچ اور مہاجر ہیں۔“

”ہوا کریں، مجھے کیا۔“ یوسف نے بے پروائی سے کہا لیکن اندر سے وہ زخم

تھا۔ ”میں تو کرچن ہوں۔“ اس کے لہجے میں عجیب سادھ اتر آیا۔ اس کے اندر کوئی

لگاؤ نہ رہی تھی..... مصلحت کا غلام سہی لیکن میں مسلمان ہوں، پھر وہ بولا ”لیکن

نظریہ تو اچھا ہی کھلائے گا خواہ کسی نے پیش کیا ہو۔“

”میں تم سے متفق ہوں۔ یہی تو میں کہنا چاہ رہا تھا۔“ ڈاکٹر لیوی نے کہا ”ہر

اقبال کے نظریہ ملت پر عمل کیا ہے۔ اسرائیل میں اتنی قومیتوں کے یہودی آباد ہیں

ان کی تعداد کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ یہاں اتنی زبانیں بولی جاتی ہیں کہ پورے

اسلام میں نہیں بولی جاتیں لیکن یہاں نہ کوئی روسی ہے، نہ امریکی، نہ سویڈش نہ ناروے

نہ ولندیزی۔ یہاں سب اسرائیلی ہیں۔ ان کے لئے ایک قومی زبان کی ضرورت تھی۔

ہم نے ایک مردہ زبان کو زندہ کیا۔ یہ کوئی معمولی کام نہیں تھا۔ اس زبان کی مدد سے

نے سب کو ایک ڈوری میں پرو دیا، اور یہ اسرائیل تک ہی محدود نہیں، دنیا میں

کیس کوئی یہودی ہے، سب سے پہلے وہ اسرائیلی ہے پھر کچھ اور۔ یہ ہے اقبال کے

ملت پر عمل۔ ہماری تعداد کم سہی لیکن ہم شرمندہ ساحل اچھل پڑے ہیں۔ بے

بھی ہو جائیں گے۔“

ایک ٹانائوس دکھ کی لہر نے یوسف کو اندر سے بھگو دیا لیکن وہ کہہ کچھ بھی

سکتا تھا۔

زندگی میں پہلی بار یوسف اس انداز میں سوچ رہا تھا کہ وہ مسلمان ہے۔

پاکستانی ہے۔ ورنہ پوری زندگی اس نے صرف ضرورت مند بن کر سوچا تھا اور ضرورت

مند کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ پہلی بار اسے پتا چلا تھا کہ انسان میں دینی، قومی حیثیت

ہوتی ہے اور اس پر ضرب لگے تو اتنی تکلیف ہوتی ہے کہ تین دن کے فاقے سے

بچے گندے تھے۔ وہاں کھینوں کی بھرمار تھی۔ شور و غل ایسا تھا کہ سر میں درد ہو جا پہلا عرب قصبہ تھا، جہاں وہ ٹھہر رہے تھے۔

وہ منہ ہاتھ دھونے اور کھانا کھانے کی غرض سے ہوٹل میں گئے۔ لابی میں قسم کی مذہبی یادگاری اشیاء کا اچھا خاصا بازار لگا تھا۔ چربی میں کچھ تلے جانے کی خُ طرف سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ ہوٹل کی طعام گاہ سنان تھی۔ میزوں کے گرد پوشوں پر کھیاں، بھنھنا رہی تھیں۔

کھانا کھانے کے بعد یوسف، راحیلہ اور بین آنزک یادگار مقامات دیکھنے کے نکلے۔ جینا اور ڈاکٹر لیوی ہوٹل ہی میں رک گئے۔ جینا کو گرمی، تھکن اور اس نے بڑھال کر دیا تھا، جو اسے یہ قدیم قصبہ دیکھ کر ہوئی تھی۔ یہ وہ قصبہ تھا، جس کا کرہیشہ اس کے دل میں عجیب سی تڑپ اٹھتی تھی۔

جوزف کی مفروضہ کارپینٹر شاپ کی طرف بڑھتے ہوئے یوسف کو ایک احساس فتح ہو رہا تھا۔ اس کارپینٹر شاپ پر ہی سینٹ جوزف کا چرچ تعمیر کیا گیا تھا۔ وہ سڑکوں سے گزر رہے تھے۔ سڑکوں پر میلی عبا میں پنپنے بڑھوں اور بیمار آنکھوں بچوں کا ہجوم تھا۔ یوسف کن آنکھوں سے راحیلہ کو دیکھتا رہا۔ وہ اس نظارے پر رد عمل دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کی وجہ اس کا یہ احساس تھا کہ وہ ایک ایسی مسابقت میں ہو گیا ہے، جس کی نوعیت کم از کم فی الوقت اس کی سمجھ سے باہر ہے۔ اسے بس اتنا تھا کہ اسے مقابلہ کرنا ہے۔ کس سے؟ یہ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ یہ مقابلہ اس انتظار متعلق تھا، جو اس کے باطن میں کروٹیں لے رہا تھا۔ بیت الشین میں وہ جینا کو شال سفر کرنے پر اکسانے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن ڈاکٹر لیوی نے راحیلہ کی مدد سے دل میں نزارتھ جانے کی آرزو کو بھڑکا دیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ ڈاکٹر لیوی نے ایسا کے تحت کیا ہے کیونکہ اب اسے یقین ہو چلا تھا کہ بڑھا بیودی کوئی کام بغیر کسی نہیں کرتا۔ وہ دھوپ میں بیٹھ کر کچھ دیر ستائے تو اس کا بھی کوئی سبب ہوتا ہے۔ اور اگر یہ درست تھا تو نزارتھ ڈاکٹر لیوی کی دوسری ناکامی تھی۔ پہلی اس کے دوران شکست تسلیم کرنا تھا۔ یوسف کو یقین تھا کہ جینا کے لئے اس جس دن میں ایک رات گزارنا قیامت سے کم نہیں ہوگا۔ صبح سویرے ہی وہ روانگی کے تاب ہوگی اور اس تجربے کے بعد آئندہ اس کی پیش کردہ کسی تجویز کو آسانی سے نہیں کرے گی۔

عرب گائیڈ جدید طرز کا بھڑکیلا لباس پہنے ہوئے تھا۔ اس کے انداز میں بدتمیزی یوسف کو یہ بات بہت بری لگی۔ اسے ایسا لگا جیسے عرب گائیڈ کے رویے پر بین آنزک اسے تفحیک آمیز نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔ یوسف کی ڈانٹ سن کر گائیڈ فوراً ہی بدھا ہو گیا۔

چرچ کا اندرونی حصہ بے حد بد نما اور بھدا تھا۔ نہ اسے آرٹ کا نمونہ کہا جاسکتا نہ ہی وہ روح میں تموج کا باعث تھا۔ جوزف کی کارپینٹر شاپ چرچ کے تہ خانے میں بک علی غار کی طرح تھی، جس کا فرش بہت گندا تھا۔

”مد ہو گئی بے وقوف بننے کی!“ یوسف نے منہ بنا کر کہا۔ ”میں اس چرچ پر ڈاکٹر کی کا تبصرہ ضرور سنتا چاہوں گا۔“

”شاید اسی لئے وہ آئے نہیں یہاں۔“ بین آنزک نے برامانے بغیر صفائی پیش کی۔ ”انہیں وہ چیزیں، وہ جگہیں اچھی نہیں لگتیں، جو اصلی نہ ہوں۔“

راحیلہ بھی بدمزہ اور اداس نظر آ رہی تھی۔ عرب گائیڈ چرچ اور کارپینٹر شاپ کے قصیدے پڑھ رہا تھا۔

”یہ ہے نزارتھ!“ یوسف نے اس سے کہا ”تسلی ہو گئی؟“

وہ اتنی ناخوش تھی کہ کوئی کاٹ دار جواب بھی نہ دے سکی۔ وہ روہانسی ہو رہی تھی ”ممکن ہے“ پرانے وقتوں میں یہ کوئی قابل دید جگہ ہو۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا ”ذرا تصور کرو، یہاں چوب کاری کے اوزار ہوں گے، ککڑی ہوگی۔“

لیکن بات نہیں بنی۔ وہ ڈاکٹر لیوی تھا، جو ایک بے رنگ منظر میں بھی اپنی علیت اور زور بیان سے جان ڈال دیتا تھا۔

”اب نکلو یہاں سے۔“ یوسف نے کہا ”ممکن ہے دوسرا چرچ دیکھ کر جی خوش ہو جائے۔“ لیکن اسے ایسی کوئی امید تھی نہیں۔

وہ دس بجے سے ذرا پہلے ہوٹل واپس آئے۔ انہیں حیرت ہوئی کیونکہ جیب اور نازار ہوٹل کے سامنے موجود نہیں تھے۔ یوسف، ڈاکٹر لیوی کو نزارتھ پر اپنا تبصرہ سنانے کے لئے بے تاب ہو رہا تھا۔ اسے مایوسی ہوئی۔

ہوٹل کے کمرک نے وضاحت کی۔ ”وہ دونوں پہاڑیوں کی طرف چلے گئے ہیں۔ اگر آپ لوگ بھی جانا چاہیں تو باہر کار بھی موجود ہے اور ڈرائیور بھی۔ خاتون نے کہا تھا آپ لوگ نہ آنا چاہیں تو یہیں قیام کریں۔ وہ صبح واپس آئیں گی۔“

بارے بہت روشن نظر آرہے تھے۔ آسمان نیچی چھت کے شامیانے کی طرح لگ رہا تھا۔  
 انا نکلا کہ وہ ہاتھ بڑھا کر اسے چھو سکتی تھی۔ ادھر ادھر دھندلے سے سائے بن رہے  
 تھے۔ کچھ چیزیں نیم واضح طور پر نظر آرہی تھیں۔ سفید عمارتیں، مینار، زیتون کے درختوں  
 کا ایک جھنڈ اور اس کے درمیان بل کھاتی سڑک..... شہر چٹانی چھجوں کے قد بچے  
 اڑتے..... نیچے جاتا محسوس ہو رہا تھا اور وہ اسے اپنے قدموں میں نظر آ رہا تھا۔ بجز بلی  
 بڑک، پھروں کے مکان، سلاخوں والی کھڑکیاں اور چھتوں پر رکھے گلوں میں موجود پودوں  
 کی پھولوں سے لدی شاخیں۔

اس کی نگاہیں جیسے ہی اس نیم تاریکی سے ہم آہنگ ہوئیں، اسے ستارے اور  
 روشن لگنے لگے۔ اس کا جھٹ نظر اور پھیل گیا۔ ہر چیز اور واضح نظر آنے لگی۔ ہر طرف  
 سکوت تھا..... سکون میں لپٹا ہوا سکوت۔ اس سکوت میں بڑی آسودگی تھی۔  
 جینا کو احساس ہوا کہ ڈاکٹر لیوی اس کے برابر اکٹھا ہوا ہے۔ اس نے کن آنکھیں  
 سے اسے دیکھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا، ٹھوڑی سینے سے لگی تھی اور وہ اس پر سکون منظر کو  
 دیکھ رہا تھا۔

وہ اس کے بولنے کی منتظر تھی لیکن وہ خاصی دیر خاموش رہا۔ بالآخر اس نے کہا  
 ”یہ ہے نزارتھ“ چند لمبے خاموشی رہی پھر ڈاکٹر لیوی نے کہا ”جب انہوں نے یہاں سے  
 دیکھا تھا، تب بھی یہ منظر ایسا ہی تھا۔ رات کو یہاں ایسی ہی آسودگی..... ایسا ہی سکون  
 ہوتا ہے۔ انہیں نزارتھ سے محبت تھی۔“

جینا خاموش کھڑی وہ منظر دیکھتی رہی۔ پھر اس نے سرگھا کر دیکھا تو وہ جاچکا تھا۔  
 پھر اس سکوت کو موسیقی کی آواز نے توڑا، جو کہیں قریب سے ہی آرہی تھی۔  
 نیچے پتھر کے کسی مکان میں کوئی بانسری بجا رہا تھا۔ وہ بڑی میٹھی اور مدھردھن تھی۔ جیسے  
 اس خوبصورت خاموشی نے کسی لطیف روح کو بولنے پر اکسایا ہو۔

”انہیں نزارتھ سے محبت تھی“ اس کے کانوں میں ڈاکٹر لیوی کے الفاظ گونجے۔  
 اس نے گہری سانس لی اور طرح طرح کے پھولوں کی خوشبو سینے میں اتار لی۔ سامنے آسمان  
 پہاڑیوں کو چھو رہا تھا۔ صوبہ کے درختوں سے جھانکتے ستاروں کا منظر جڑاؤ زیورات کی یاد  
 دلاتا تھا۔ زیتون کے درختوں کے درمیان سفید سیال بہتا دکھائی دے رہا تھا۔ دور سے  
 کئی چرواہے کے کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دی۔ جینا کی چشم تصور نے چرواہے کو  
 دیکھا جو اپنی بھیڑوں کو گھر کی طرف ہنکائے لئے جا رہے تھے۔

”میں تو سونے جا رہا ہوں۔“ بین آئزک نے کہا ”مدت کے بعد سچ کچ کا ستر فیر  
 ہوا ہے۔“

یوسف اس پر معترض ہوا۔ ”نہیں۔ ہم ان کے پاس جائیں گے۔“ وہ بولا۔  
 اچانک ہی بے چینی سی ہونے لگی۔  
 ”ممکن ہے، مس میکلم تنہائی کی ضرورت محسوس کر رہی ہوں۔“ راحیلہ نے کہ  
 ”وہ بہت تھکی ہوئی تھیں۔“

”وہ کیسے بھی گئے ہوں، میں شرط لگا کر کہہ سکتا ہوں کہ تجویز ڈاکٹر لیوی کی  
 ہوگی۔“ یوسف بولا ”اور مجھے یہ بات پسند نہیں۔ میں یہاں نہیں رکوں گا۔“

بین آئزک نے چڑک کر کہا ”تم اپنی زندگی میں دلچسپیاں بھرنے کے ماہر ہو جو؟  
 ٹھیک ہے۔ اوپر اس جس سے تو نجات ملے گی۔“

وہ کار میں بیٹھے تو یوسف نے سوچا، ممکن ہے بین آئزک کی بات درست ہو، یہ  
 بلاوجہ شک کر رہا ہوں۔ لیکن اس کی بے چینی دور نہ ہوئی۔

○-----○-----○

وہ بل کھاتی سڑک نزارتھ کے درمیان سے پہاڑیوں کی طرف اٹھتی چلی گئی تھی۔  
 نزارتھ پہاڑیوں کے درمیان پیالے کی طرح کا تھا۔ سڑک پیالے کی مغربی نگر کی طرف  
 رہی تھی۔ چوٹی پر مسطح زمین پر صوبہ کے درخت نیم دائرے کی شکل میں قطار در قطار  
 ایستادہ تھے۔ پہاڑ کے سینے پر جاہ جا کیٹکٹس نظر آ رہے تھے۔

جینا کا ٹرالر مسطح زمین کے ایک سرے پر پارک کیا گیا تھا۔ مردوں والا ٹرالر  
 دوسرے سرے پر تھا۔

ڈاکٹر لیوی کو جینا میکلم کو ہوٹل سے نکلنے اور پہاڑیوں کی طرف چلنے پر رضامند  
 کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی۔ اس نے اپنے مخصوص پر اعتماد لہجے میں کہا تھا  
 ”شہر سے باہر خنکی میں آپ زیادہ خوش رہیں گی۔ اوپر چوٹی پر صوبہ کا ایک جھنڈ ہے۔ کم  
 از کم وہاں سے آپ ستاروں کی روشنی میں نزارتھ کا نظارہ کر سکیں گی۔“

”اور اگر.....؟“

”وہاں سے آپ نزارتھ کی دھڑکنیں سن سکیں گی..... محسوس کر سکیں گی۔“  
 ڈاکٹر لیوی کے لہجے میں قطعیت تھی۔

جینا ٹرالر سے نکلے اور اس کے قدموں پر بیٹھ گئی۔ وہ چاندنی رات نہیں تھی لیکن

جینا کے دل کو کسی بے حد لطیف..... بادلوں جیسے جذبے نے چھو لیا۔ اس تصور میں مسیح مجسم ہو گئے تھے۔ حالانکہ ڈاکٹر لیوی نے ان کا نام نہیں لیا تھا۔ یہ رکاز کین کا گھر تھا۔ یہاں ان کا بچپن گزرا تھا۔

یہ درخت، یہ چٹانی جھجے، یہ صدیوں سے جوں کی توں موجود چٹانیں، یہ صدیوں میں پگڑیاں، یہ زمین کو چومتا ہوا آسمان، ان ستاروں جڑی پہاڑیوں نے ان کی آنکھوں کو بھر دیا ہوگا، ان کے دل میں خوشی کی چمک اتار دی ہوگی۔ پھولوں کی خوشبو میں بھیڑوں کی معصومیت میں انہوں نے خدا کی محبت..... خدا کی قربت محسوس کی ہوگی۔ وہ سوچ رہی تھی، شاید وہ کبھی یہاں کھڑے ہوئے ہوں..... اسی جگہ، جہاں اس میں کھڑی ہوں۔ انہوں نے بھی سانس لے کر اسی ہوا کو پھیپھڑوں میں اتارا ہوگا۔ انہوں نے بھی یہی آوازیں سنی ہوں گی، یہی منظر دیکھا ہوگا۔ وہ جو زندگی بھر کتابوں میں لکھا نام تھے، لیوں سے ادا ہونے والا ایک لفظ تھے..... اس وقت کتنا نزدیک محسوس رہے تھے۔ وہ بڑی بڑی آنکھوں والا بچہ، وہ نرم خو انسان، جس کا دل خدا کی محبت معمور تھا۔ جینا کا دل عجیب سی بھگو دینے والی، شرابور کر دینے والی خوشی سے بھر گیا۔

کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ دھیرے دھیرے رونے لگی۔ اور اسے احساس ہوا کہ اس کے سینے میں برسوں سے جو ایک سخت سی گرہ تھی وہ رونے سے کھل گئی تھی۔ اب وہ محض ایک بوڑھی، تنہا اور اداس عورت جسے زندگی بھر نری میں بھیگی محبت نہیں ملی تھی..... جسے کسی نے سمجھنے کی کوشش نہیں کی تھی..... جس نے خود بھی کسی سے سچی محبت نہیں کی تھی۔ اور اب وہ، اس پر سے ستاروں کی روشنی میں نزار تھ کر دیکھ کر محبت کا سیال آنکھوں سے بہا رہی اسے لگ رہا تھا کہ مسیح نے بڑی محبت سے اس کے دل پر اپنا شفا بخش ہاتھ رکھ دیا وہ پھل رہی تھی..... بدل رہی تھی!

وہ رو رہی تھی کہ پہلی بار اسے سکون کا احساس ہوا تھا..... اسے موجودگی کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ رو رہی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ وہ بہت بڑی گڑبہ ہے۔ اس نے اپنی زندگی طاقت کے حصول کی کوشش میں گنوا دی تھی۔ وہ رو رہی کیونکہ آنسوؤں کا دل کے پتھر کو موم کرنا اسے اچھا لگ رہا تھا۔ آنسوؤں نے اس کی چٹکا دیا تھا، جو اس نے اپنی خوشی سے محروم، تنہا اور اداس دل پر چڑھا رکھا تھا۔ اس چٹکا تو وہ آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا بہا دیتی۔ مہمان چرواہے کے پاؤں دھلا۔

اس کے دل کو کسی بے حد لطیف..... بادلوں جیسے جذبے نے چھو لیا۔ اس تصور میں مسیح مجسم ہو گئے تھے۔ حالانکہ ڈاکٹر لیوی نے ان کا نام نہیں لیا تھا۔ یہ رکاز کین کا گھر تھا۔ یہاں ان کا بچپن گزرا تھا۔ یہ درخت، یہ چٹانی جھجے، یہ صدیوں سے جوں کی توں موجود چٹانیں، یہ صدیوں میں پگڑیاں، یہ زمین کو چومتا ہوا آسمان، ان ستاروں جڑی پہاڑیوں نے ان کی آنکھوں کو بھر دیا ہوگا، ان کے دل میں خوشی کی چمک اتار دی ہوگی۔ پھولوں کی خوشبو میں بھیڑوں کی معصومیت میں انہوں نے خدا کی محبت..... خدا کی قربت محسوس کی ہوگی۔ وہ سوچ رہی تھی، شاید وہ کبھی یہاں کھڑے ہوئے ہوں..... اسی جگہ، جہاں اس میں کھڑی ہوں۔ انہوں نے بھی سانس لے کر اسی ہوا کو پھیپھڑوں میں اتارا ہوگا۔ انہوں نے بھی یہی آوازیں سنی ہوں گی، یہی منظر دیکھا ہوگا۔ وہ جو زندگی بھر کتابوں میں لکھا نام تھے، لیوں سے ادا ہونے والا ایک لفظ تھے..... اس وقت کتنا نزدیک محسوس رہے تھے۔ وہ بڑی بڑی آنکھوں والا بچہ، وہ نرم خو انسان، جس کا دل خدا کی محبت معمور تھا۔ جینا کا دل عجیب سی بھگو دینے والی، شرابور کر دینے والی خوشی سے بھر گیا۔

کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ دھیرے دھیرے رونے لگی۔ اور اسے احساس ہوا کہ اس کے سینے میں برسوں سے جو ایک سخت سی گرہ تھی وہ رونے سے کھل گئی تھی۔ اب وہ محض ایک بوڑھی، تنہا اور اداس عورت جسے زندگی بھر نری میں بھیگی محبت نہیں ملی تھی..... جسے کسی نے سمجھنے کی کوشش نہیں کی تھی..... جس نے خود بھی کسی سے سچی محبت نہیں کی تھی۔ اور اب وہ، اس پر سے ستاروں کی روشنی میں نزار تھ کر دیکھ کر محبت کا سیال آنکھوں سے بہا رہی اسے لگ رہا تھا کہ مسیح نے بڑی محبت سے اس کے دل پر اپنا شفا بخش ہاتھ رکھ دیا وہ پھل رہی تھی..... بدل رہی تھی!

”نہیں۔“ جینا نے جواب دیا۔ ”یہ بہت سکون بخش مقام ہے۔“

یوسف کے لئے یہ تاخیر پریشانی کا باعث تھی۔ اسے خطرے کا عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے ڈاکٹر لیوی سے معقولیت سے گفتگو کرنے کی کوشش کی ”یہ کیا پکڑ چل رہا ہے؟“ اس نے ڈاکٹر سے پوچھا۔ ”میں آنزک کو تم نے کہاں بھیج دیا اور مجھ سے مشورہ کہیں نہیں کیا؟“

ڈاکٹر لیوی اس وقت ٹرالر کے قدمچے پر بیٹھا پائپ سلگا رہا تھا۔ اس کی نظرس جھیل پر جمی تھیں۔ اس نے سرگھما کر یوسف کو دیکھا۔ ”صبر و تحمل سے کام لو، تمہیں ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آخر میں میں اپنا وعدہ ضرور پورا کروں گا۔“

یوسف جھنجھلا گیا۔ ”مجھے تم پر اعتبار نہیں ڈاکٹر لیوی!“

”بات معقول ہے۔ لیکن تم بین آنزک پر تو اعتبار کر سکتے ہو کیونکہ تم جانتے ہو کہ اس میںکم سے محبت کرتا ہے۔“

ٹھکست خوردگی اور بے بسی اب یوسف کے لئے معمول کے مطابق تھی۔ اس نے ہوا راحیلہ سے مل کر اسے اپنے خدشات سے آگاہ کرے لیکن اس نے خود ہی اس ڈیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ وہ بھی بدل گئی تھی۔ اسے احساس ہوتا تھا کہ اب وہ راحیلہ پر بھی اپنا کنٹرول کھو بیٹھا ہے۔

گیلی لی نے بھی جینا کو اپنے طلسم میں جکڑ لیا تھا۔ بلکہ وہ نزارتھ کی نسبت زیادہ کڑی میں اس پر اثر انداز ہوا تھا۔ اس علاقے کی اپنی ایک اہمیت تھی۔ انجیل مقدس کے سب سے زیادہ مصدقہ اقتباسات یہیں سے دریافت ہوئے تھے۔ یہاں کے مجسمے اب بھی اپنی کشتیوں سے ہاتھوں سے جال پھینک کر مچھلیوں کا شکار کھیلتے تھے۔ دو ہزار سال پہلے کے پتھر اور جان کی طرح، جن کی سادہ روحوں کو پہاڑوں سے اتر کے آنے والے پیغمبر نے مسخر کیا تھا۔

اب اگرچہ وہ معروف قصبہ اور دیہات مٹ چکے تھے، جو کبھی جھیل کے کنارے زندگی سے دھڑکتے تھے لیکن ساحل ویسے کا ویسا ہی تھا۔ وہی کنارے پر چمکتی سیپیاں، وہی ہمالیاں، وہی آبی گھاس۔ جھیل کی ساخت بھی بہت تھوڑی سی بدلی تھی۔ ارد گرد سرسبز لکڑی کھڑی پہاڑیاں تو ذرا بھی نہیں بدلی تھیں۔ وہ ویسی ہی تھیں، جیسا مسیح نے انہیں دکھا تھا۔ سمندر کی نم، حدت اٹھائے ہوا ویسی ہی تھی..... گرد و پیش کے خوب صورت لودھار، کدو، خشک پھوسے بوجھل۔ نیلا پانی اور بھوری پہاڑیاں اور ٹیلے

مزاہمت میں صرف کر دی۔ اس نے جان لیا کہ اگر اس نے مزاہمت نہ کی تو وہ نرم جائے گا اور نرمی زندگی کے لئے کتنی نقصان دہ ہے، یہ وہ جانتا تھا۔ اس کے بعد چیخ کوئی سوال ہی نہیں تھا۔

”نہیں بی بی! مجھے کچھ محسوس نہیں ہوا۔“ اس نے سخت لہجے میں کہا ”اور یہ ابا تھکا دینے والا دن تھا۔ شب بخیر۔“ وہ ٹرالر کی طرف بڑھ گیا۔ راستے میں اسے ڈاکٹر لیوی کی ٹنولتی ہوئی نگاہوں کا احساس ہوا لیکن وہ اسے نظر انداز کر کے آگے بڑھ گیا۔

○-----○-----○

نزارتھ کے بعد قافلے کی رفتار اور کم ہو گئی۔ اس سلسلے میں کسی نے کسی سے بات نہیں کہا لیکن ایک بات واضح ہو گئی۔ جلد بازی اور بے تابی کا بخار خاصی حد تک اتر تھا۔ یہ تبدیلی یوسف کے لئے پریشان کن تھی کیونکہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اس مہم میں اپنا کھویا ہوا اختیار اب تک وہ دوبارہ حاصل نہیں کر سکا تھا۔

وہ نزارتھ سے نکل کر قدیم سڑک پر سفر کرتے رہے۔ وہ کیفر کینا سے گزرے۔ وہ گاؤں تھا جہاں حضرت عیسیٰ نے پہلا معجزہ دکھایا تھا۔ وہ جھیل سے گزرے جہاں یوکلپس کے درختوں سے گھری نیچی پہاڑی تھی، جیسے بیت السیدہ کہا جاتا ہے۔

جھٹ پٹے کے وقت قافلے نے ایک ٹھنڈے اور سرسبز نخلستان میں پڑاؤ ڈالا۔ اس کے سامنے ٹائی بیریس جھیل کا شمال مغربی کنارہ تھا جس کا جدید نام بحر گیلی لی ہے وہاں درختوں کا ایک بہت بڑا جھنڈ تھا۔ جھنڈ کے اندر کی سمت خوشبودار پھولوں اور جھاڑیوں تھیں۔ قریب ہی ایک پرانا جرمن چرچ تھا۔ فادر، ڈاکٹر لیوی کے جاننے والوں میں سے تھا۔ ڈاکٹر لیوی انہیں چرچ لے گیا۔

انہوں نے فادر سے جھیل کے کنارے جھنڈ میں ٹرالر پارک کرنے کی اجازت لی۔ وہیں خیمے گاڑے گئے۔ ڈاکٹر لیوی نے بین آنزک کو شمال کی طرف روانہ کر دیا۔ یوسف نے وجہ پوچھی لیکن ڈاکٹر لیوی نے اسے ٹال دیا۔ بین آنزک جیپ لے کر گیا تھا۔ وہ بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی چلت پھرت میں ہیجان تھا۔ وہ رات کے کھانے کے فوراً بعد روانہ ہو گیا تھا۔

ڈاکٹر لیوی نے جینا سے کہا ”ممکن ہے، ہمیں یہاں کئی روز قیام کرنا پڑے،“ تب تک مجھے یہ یقین نہیں ہو گا کہ آگے سفر کرنا محفوظ ہے، ہم یہاں سے آگے نہیں بڑھیں گے۔ اس صورت میں آپ کو انتظار کرنا ہو گا۔ کوئی اعتراض تو نہیں آپ کو؟“

اپنا پیغام..... خدا کا پیغام ان تک پہنچاتے تھے۔

”کیا مسیح یہاں تبلیغ فرماتے تھے؟“ جینا نے پوچھا۔

ڈاکٹر لیوی نے جواب دینے کے بجائے الٹا اس سے سوال کر دیا ”کیا یہ جگہ آپ کو کچھ نہیں بتاتی؟“

جینا نے چاروں طرف دیکھا۔ انداز ایسا تھا جیسے وہ بہت مبہوم آوازیں سننے کے لئے سماعت پر زور دے رہی ہے۔ پھر اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”آئیے، میں آپ کو کچھ دکھانا چاہتا ہوں۔“ ڈاکٹر لیوی نے کہا۔

وہ اسے جھیل سے دور ایک تنگ راستے پر لے گیا۔ وہ شمال مغرب کی سمت بڑھ رہے تھے، جہاں زمین بہت آہستگی سے بتدریج بلند ہو رہی تھی۔ وہ صنوبر کے درختوں کے ایک جھنڈ میں پہنچے۔ وہ جھنڈ بے شکل تھا پھر بھی احساس دلا رہا تھا کہ اس کی کوئی شکل ہے..... جیسے وہ درخت وہاں صدیوں پہلے موجود درختوں کے بیجوں کا ثمر ہوں..... اور اس عمل میں جھنڈ اپنی اصل شکل کھو بیٹھا ہو۔

اندر..... جھنڈ میں جنگلی پھولوں کے پودوں کے سوا بادی النظر میں کچھ بھی نہیں تھا اور وہ پودے زمین سے یوں چپکے ہوئے تھے جیسے قالین کی طرح بچھے ہوئے ہوں۔ زمین ناہموار تھی۔ موسم بہار کا خودرو سبزہ اور روئیدگی چھب دکھلا رہی تھی۔

لیکن جھنڈ کے آخری سرے پر ایک بے حد بلند و بالا صنوبر کے پس منظر میں ایک بہت پرانا ستون نظر آ رہا تھا۔ ستون پر ٹکونی شکل کا ایک شکستہ کارنس لٹکا ہوا تھا۔ وہ کسی ٹمٹم کا کھنڈر نہیں تھا لیکن اہمیت کے اعتبار سے گمشدہ شہر کے کھنڈرات سے بڑھ کر حائر کن تھا۔ وہ کوئی معبد معلوم ہوتا تھا، وہ کوئی بھولا برا مقام تھا لیکن وہاں ماضی چیخ چیخ کر پکارا محسوس ہوتا تھا۔

”یہ کونسی جگہ ہے؟“ جینا نے پکار کر پوچھا۔ ”کیا وہ یہاں آئے تھے کبھی؟“

ڈاکٹر لیوی نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”جی ہاں“ اس نے کہا ”ہمارے قدموں کے نیچے کپروم کے کھنڈرات ہیں۔ مجھے اس بات کا کامل یقین ہے.....“ اس نے سر اٹھایا اور دونوں ہاتھ آگے کی طرف پھیلاتے ہوئے گہری سانس لی۔ ”یہ میں اپنے محسوسات کی بنیاد پر کہہ رہا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ معذرت خواہانہ انداز میں مسکرایا۔ جیسے اپنی جذباتیت پر معذرت طلب کر رہا ہو۔ ”اور اپنی تاریخی علیقت کی بنیاد پر بھی۔ یہ میری دریافت ہے..... اور کبھی نہ کبھی ہم یہاں کھدائی کریں گے۔ اس بات کی شہادت موجود ہے کہ

بھی ویسے ہی تھے۔ ساحل کی ریت پر ان کے قدم پڑے ہوں گے۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ آدمی وہاں چلے اور اسے ان کا خیال نہ آئے۔

یہ تھے جینا میککم کے محسوسات۔ وہ گھنٹوں وہاں چہل قدمی کرتی اور کم ہی کسی سے بات کرتی۔ صرف ڈاکٹر لیوی اس کے ساتھ ہوتا۔ وہ اسے اس مقام کے متعلق بتاتا اور تاریخی، مذہبی حوالے دیتا۔ اور جینا خود کو ان سے قریب تر محسوس کرنے لگتی۔

ساحل پر چلتے چلتے اچانک انہیں کسی مدفون قصبے کے آثار سرا بھارتے دکھائی دیتے۔ کوئی سیاہ دیوار..... کوئی ستون..... اور کوئی کمائی چھڑ جاتی۔

یوسف پریشان تھا۔ جینا ہاتھ سے ٹکلی جا رہی تھی۔ اس کے خیال میں ڈاکٹر لیوی بڑی خوبصورتی سے اسے جال میں الجھا رہا تھا۔ مذہبی معاملات میں ہر آدمی اندر سے کمزور ہوتا ہے۔ ڈاکٹر لیوی جینا کی اس کمزوری کو ایکسپلائٹ کر رہا تھا۔ وہ ذرا سی حقیقت میں بہت سارا افسانہ اسے گھول کر پلا رہا تھا، اور یوسف..... وہ بے بس تھا، کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

کبھی کبھی جینا اکیلی کھڑی گرد و پیش کو ٹٹولنے والی نگاہوں سے دیکھتی رہتی اور کبھی ڈاکٹر لیوی اشارے سے اسے بتاتا کہ فلاں مقام پر ایک معروف تجارتی قصبہ تھا اور فلاں جگہ چھبڑوں کا کوئی گاؤں۔ کبھی اس ساحل پر زندگی ہی زندگی تھی، پھول ہی پھول سکتے تھے۔ لیوں، نارنگی، یوکلپٹس اور شامی انجیر کے درخت سر اٹھائے کھڑے تھے۔

اس جھیل کے اطراف میں شہر ہی شہر تھے..... نوشہر! اب ان میں صرف ٹائبریس ہی بچا تھا اور وہ بھی اب نئی زندگی سے لبریز تھا۔ ایک نئی ساحلی تفریح گاہ کی صورت میں ابھر رہا تھا۔ اب انت غیبیہ کے درختوں کے جھنڈ کے سوا وہاں درخت دیکھنے کو بھی نہیں تھا۔ جبکہ مسیح کے عہد میں وہاں سایہ دار شاہ بلوط تھے، اخروٹ تھے، کھجور تھے، انجیر تھے، چنار تھے اور رنگ برنگے پھولوں کے پودے اور جھاڑیاں تھیں، لیکن اب یہ ساحل سنسان تھا۔ جھیل کا سینہ، جو کبھی سفید بادیانی کشتیوں سے سجا رہتا تھا، اب خالی پڑا تھا۔

وہاں جو زندگی تھی، اب ڈاکٹر لیوی کی آواز کے زیر و بم سے وجود پا رہی تھی۔ جینا وہ سحرانگیز آواز سنتی اور اس کی نگاہوں کے سامنے صدیاں پیچھے ہٹتی چلی جاتیں۔ منظر بدل جاتے۔ اسے پانی میں چپوؤں کے چلنے کی، جال پھینکنے جانے کی آوازیں سنائی دیتیں۔ وہاں یونانی بھی تھے، رومی بھی اور یہودی بھی، اور ان کے درمیان مسیح بھی چلتے پھرتے تھے۔



انسان کی میں کا..... وہ کہتا ہے کہ میں نے ایک چیز اپنائی، اب اسے چھوڑ  
 رد سری کیوں اپناؤں۔ خدا کہتا ہے..... تم کچھ نہیں جانتے۔ میں سب کچھ جانتا  
 ہوں۔ ہمیں میرا حکم ماننا چاہئے۔ میں کہوں اسے اپنالو، تو اپنالو۔ میں کہوں اسے اس پر  
 بن دو، تو دو، لیکن انسان کی سرشت میں نافرمانی ہے۔ وہ اسی کی سزا دنیا میں پاتا ہے اور  
 اسی سزا آخرت میں پائے گا۔ اب مجھے بتائیں کہ آپ آخری پیغمبر پر ایمان کیوں نہیں  
 لے؟

”میں نے اس سلسلے میں کبھی سوچا ہی نہیں۔“ جینا نے سادگی سے کہا۔  
 ”دیکھیں..... میں کسی موضوع پر کوئی کتاب لکھتا ہوں..... وہ شائع ہوتی  
 فروخت ہوتی ہے۔ دوسرا ایڈیشن شائع ہوتا ہے تو میں اس میں ترمیم و اضافہ کرتا  
 ہوں۔ اسی طرح ہر ایڈیشن میں ترمیم اور اضافے ہوتے ہیں۔ اب بتائیں، اپنے مواد کے  
 رے کتاب کا آخری ایڈیشن اہم ہو گیا یا پہلا؟“

”ظاہر ہے، آخری ایڈیشن۔“  
 ”لیکن لوگ کسی بھی کتاب کے پہلے ایڈیشن کو منہ مانگی قیمت دے کر خریدتے

”مگر ایسے بھی ہوتے ہیں، جو آخری ایڈیشن کو اہمیت دیتے ہیں۔“  
 ”جی ہاں، درست ہے۔“ ڈاکٹر لیوی نے گہری سانس لے کر کہا ”اور وہ علیت پسند  
 ہیں۔ لیکن دنیا میں اکثریت جذباتی لوگوں کی ہے۔ آدمی سب سے زیادہ محبت اپنے  
 سے کرتا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ بنیادی طور پر وہ، رضی پرست ہے۔ وہ باپ دادا کی  
 جڑ ترک نہیں کرتا۔ نہ نام، نہ زمین، نہ مذہب، ہندوؤں کو لیں۔ اس ترقی یافتہ عہد  
 کو اپنے اجداد کے نہایت احمقانہ عقیدے سے دستبردار نہیں ہوتے۔ یہی حال  
 ہے۔ ہم کتنے ہی ترقی پسند بننے رہیں، حال ہمارا یہ ہے کہ خدا کی کتاب کے آخری  
 ناکو نہیں پڑھتے۔ میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر مجھے پہلے ایڈیشن سے دستبردار  
 ہے تو میں دوسرا ایڈیشن کیوں لوں؟ آخری کیوں نہ لوں۔ جبکہ میں جانتا ہوں کہ  
 لی لیتا چاہئے۔“

”تم عجیب باتیں کر رہے ہو.....“

”میں یہاں بھی مختلف آدمی ہوں اسی لئے سب کچھ چھوڑ کر تکراریوں اور سبزیوں  
 میں مصروف ہو گیا ہوں۔“ ڈاکٹر لیوی کے لہجے میں طمانیت تھی۔ ”میں دنیا بھر

اس زمانے میں جھیل کا پانی شمال کی سمت اپنی موجودہ پوزیشن سے کم از کم ایک کلومیٹر  
 آگے تھا اور کپہر نوم یہودیوں کا نہیں بلکہ گیلی لین قصبہ تھا.....“

جینا ایک بار پھر اسی سحر میں گرفتار ہو گئی تھی۔ یہ فلسطین کا جادو تھا، جہاں  
 جھیل کا پانی یا مٹی کا کوئی ٹیلہ پکار کر کہتا معلوم ہوتا..... ”صبح“ مجھے جانتے تھے۔ انہم  
 نے ایک بار میرے سینے پر ہاتھ رکھا تھا۔ پانی کہتا تھا..... مجھے دیکھ کر ان کی آنکھوں  
 خوشی چمکی تھی۔ زمین کتنی تھی..... میرے سینے کو ان کے قدموں کا دباؤ آج بھی  
 ہے۔ یہاں..... میری گلیوں میں لوگوں کو خدا کی تعلیمات سے آشنا کیا گیا تھا۔

”تم ٹھیک کہتے ہو۔“ جینا بولی ”وہ یہاں یقیناً آئے ہوں گے۔“  
 ”میں نے جب اسے پہلی نظر دیکھا تھا، مجھے جیسی یقین ہو گیا تھا۔“ ڈاکٹر لیوی  
 نرم لہجے میں کہا۔

جینا نے حیرت سے اسے دیکھا اور پوچھا ”تم..... تم بھی ان سے عقیدت رکھ  
 ہو..... محبت کرتے ہو؟“  
 ”ایسے محبت کرنے والے پیغمبر سے عقیدت اور محبت نہ ہونا کیسے ممکن ہو  
 ہے۔“

”اس کے باوجود تم یہودی ہو۔ میرا خیال تھا کہ تمام یہودی، مسیح کے منکر ہیں۔  
 ”یہ خیال غلط ہے۔“ ڈاکٹر لیوی نے پر زور انداز میں کہا ”اس سرزمین پر بہت  
 پرانی نفرتیں مر گئیں..... مردہ شہروں کے ساتھ دفن ہو گئیں۔ وہ شہر ہی نہ رہے، جہاں  
 وہ نفرتیں پروان چڑھی تھیں۔ یہاں واپسی کے بعد ہم یہودی بہت بدل گئے ہیں، آ  
 خیال ہو گئے ہیں، تنگ نظری کا خول ٹوٹ گیا ہے ہمارا۔“

جینا کچھ دیر تک سوچتی رہی۔ پھر بولی ”تو پھر تم مسیحی کیوں نہیں ہو گئے؟“  
 ”یہ بہت طویل بات ہے خاتون!“ ڈاکٹر لیوی نے کہا ”بات صرف اتنی ہی ہے  
 آدمی اپنی بنیاد میں ایسا ہے کہ عام طور پر اسے محبت تنگ نظر بنا دیتی ہے۔ مجھے ایک  
 بتائیں۔ بائبل میں آخری پیغمبر کی آمد کی خوش خبری نہیں سنائی گئی؟ ان کی نشانیاں  
 بتائی گئیں؟“

جینا خاموش رہی۔ ”یہ سب کچھ موجود تھا بائبل میں۔“  
 ”تورات میں بھی تھا۔“ ڈاکٹر لیوی نے کہا ”اور یہودی ان پر ایمان لائے  
 اکثریت نے خدا کے واضح حکم کے باوجود ان کی نفی کی۔ یہ دراصل ضد کا



شرق کی طرف مڑے۔ اس طرف ڈان تھا۔ اب وہ قدرتی طور پر سرسبز و شاداب نے سے گزر رہے تھے۔ ”تم ان دنوں بہت مطمئن اور خوش و خرم ہو گئے۔ ہے نا؟“ نے اسٹیرنگ پر جھکتے ہوئے کہا۔

راحیلہ نے پلو بدل کر کن اکھیوں سے اس شخص کو دیکھا، جس کے ساتھ بظاہر کے تعلقات تلخ تھے بلکہ اچھی خاصی دشمنی چل رہی تھی ان کے درمیان۔ خاکی پیٹ خاکی ہیٹ میں وہ اتنا عیار اور چالاک نہیں لگ رہا تھا۔ عمر کے اعتبار سے بھی جیسے اس کچھ برسوں کی گرد جھاڑ دی تھی۔ مگر اب اس کے انداز میں بے بسی تھی اور وہ تنہائی راگ رہا تھا۔ اس لمحے اس نے عجیب سے انداز میں راحیلہ کے دل کو چھو لیا۔

راحیلہ جواب سوچنے کے دوران بھی اس تاثر کا تجربہ کرتی رہی۔ اس کا سبب یہی تھا کہ یوسف جو ایک ولن ہے، اس کا کھیل خراب ہو گیا ہے۔ ایسے میں وہ خوش تو نہیں آسکتا۔

”یہ درست ہے جو۔“ بالآخر راحیلہ نے جواب دیا۔ ”میں ان دنوں بہت خوش اور ن ہوں۔ مجھے یہ سفر بہت اچھا لگا ہے۔“

”مجھے بے وقوف مت بناؤ راحیلہ۔ میرا اشارہ یہاں کے قدرتی حسن کی طرف تھا۔“ یوسف نے تلخ لہجے میں کہا ”تمہارا اندازہ ہے کہ مجھے شکست ہو چکی ہے۔ راپارائین آنزک اور اس کے انکل فح یاب ہو چکے ہیں۔ تم سمجھ رہی ہو کہ اب تم ہوئی نہیں ہو بلکہ دنیا کے سر پر چڑھ کر بیٹھ گئی ہو۔ لیکن میں تمہیں خبردار کر رہا ہوں۔ نہ غلط رہنا کیونکہ میں اتنی آسانی سے شکست کھانے والا نہیں۔“

راحیلہ نے سر کو تھپسی جنبش دی لیکن اس کا دل دکھ رہا تھا کیونکہ مضبوط جوزف ان کا لہجہ بھی کمزور تھا اور اس کے چہرے پر شکست خوردگی بھی تحریر تھی۔ ”میں ا ضرور ہوں۔“ اس نے کہا ”لیکن اس وجہ سے نہیں کہ تم ہار گئے ہو۔“ اس کے نکل پر ایک شریر سی مسکراہٹ مچلی۔ وہ اسے خوش کرنا چاہتی تھی۔ اس کی کس..... تنہائی کا احساس دور کرنا چاہتی تھی۔ ”عجیب بات یہ ہے کہ میری یہ خوشی اہل دی ہوئی ہے..... تمہاری ہی وجہ سے ہے۔“ اس نے اپنی بات مکمل کی۔

”کیا؟“ یوسف حیرت سے اسے دیکھتا رہ گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کے معصوم لہجے سے اسے چونکا دیا۔ وہ خاصی بدل گئی تھی۔ فلسطین کی آب و ہوا نے اسے پھول کی ماکھیا دیا تھا۔ دھوپ نے اس کی رنگت کو سنو لایا تھا۔ اب وہ پھلکی، گوری رنگت کی

بال کیپ تھی۔ وہ یہودیوں کی قریبی بستی سے آیا تھا، جہاں امریکی زراعت کے جدید طریقے اور جدید مشینری روشناس کر رہے تھے۔

وہ اچانک جیپ میں انت غیب میں نمودار ہوا تھا..... بین آنزک کا پیغام لے کر کم پر روانگی کی تمام تیاریاں مکمل ہیں۔ وہ جینا سے واقف تھا۔ جینا سے ملتے ہوئے اس کے انداز میں دلچسپی تھی۔ جینا کو اس علاقے میں کسی امریکی کو دیکھ کر حیرت ہوئی۔ اس نے اس سلسلے میں استفسار بھی کیا ”میں جنگ کے دوران یہیں تھا مادام۔“ جواب میں ایڈ نے بتایا۔ ”میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ جنگ ختم ہونے کے بعد یہاں ضرور واپس آؤں گا۔ ہمارے خاندان میں زراعت کا بڑا رجحان ہے۔ میں نے اسٹان فورڈ کے زرعی اسکول میں تعلیم حاصل کی ہے۔“

”امریکا میں تم جیسے اور لوگ بھی موجود ہیں؟“ جینا نے پوچھا۔

”جی ہاں مادام۔ اور ایسے لوگ پوری دنیا میں بکھرے ہوئے ہیں۔ جہاں کہیں انہیں زراعت میں کامیابی کا زیادہ امکان نظر آتا ہے، وہ وہاں بس جاتے ہیں اور اپنی تعلیم سے استفادہ کرتے ہیں۔“

”لیکن تم یہودی تو نہیں معلوم ہوتے۔“

”یہاں رہنے کے لئے یہ ضروری تو نہیں۔ یہ اچھی سرزمین ہے اور لوگ بھی اچھے ہیں۔“ ایڈ نے جواب دیا۔

وہ میتلا پہنچے۔ بین آنزک وہاں موجود نہیں تھا۔ یوسف کو یہ تشویش تھی کہ وہ م کے بارے میں پوری طرح اندھیرے میں ہے۔ اس نے ایڈ سے کچھ اگلوانے کی کوشش کی تو جواب ملا۔ ”مجھے خاموش رہنے کی ہدایات دی گئی ہیں۔ بس میں آپ کی رہنمائی کروں گا۔ آپ لوگ تیار ہو جائیں۔“

اور پھر وہ وقت آگیا۔ اب ایڈ وقتی طور پر ان کی رہنمائی کے فرائض انجام دے رہا تھا۔

یوسف، راحیلہ کی قربت میسر آنے پر بہت خوش تھا۔ تل ابیب سے بین آنزک کی تلاش میں ناکام واپس آنے کے بعد وہ جینہ میں راحیلہ سے ملا تھا۔ اس کے بعد سے اب تک انہیں تنہائی نصیب نہیں ہوئی تھی لیکن تنہائی میسر آتے ہی اس نے جو پہلی بات کی وہ جارحانہ لب و لہجے میں کی تھی۔

میتلا سے وہ جنوب کی سمت پلٹے اور ہول پیسہ جھیل کے علاقے سے گزرے۔ پھر

ناہل تھیٹ لے، خالی ہاتھ تو اس صورت میں، میں بھی نہیں رہوں گا۔  
 ”تمہارے پھوپھی میکم کے ساتھ کیا معاملات طے ہوئے ہیں؟“ راحیلہ نے تجسس  
 لہجہ میں پوچھا۔ ”مداخلت تصور نہ کرو تو مجھے بھی بتا دو۔“  
 ”ارے نہیں، مداخلت کیسی۔“ یوسف نے بے پروائی سے کہا۔ ”میرے لئے  
 اہالی کی صورت میں معاوضہ، ورنہ کچھ بھی نہیں۔ مہم کے دوران اخراجات اور اصل  
 ملازہ جیون بوٹی ملنے کے بعد۔ ریسرچ کے سلسلے میں مجھے باقاعدہ لگی بندھی رقم ملتی  
 ہے۔ اخراجات کی مد میں۔ وہ رقم بھی کم نہیں۔ میں بہت مطمئن ہوں۔“  
 ”لیکن مہم کامیاب ہوگئی تو؟“

یوسف کے چہرے پر تسخر کا تاثر نمایاں ہو گیا۔ ”تم خوابوں پر گفتگو کرنا چاہتی ہو تو  
 ی سی۔ اس صورت میں قانونی تحفظ صرف جینا کو ہی نہیں، مجھے بھی حاصل ہے۔ جیون  
 ٹی مل جائے تو اسے دی جائے گی۔ لیکن پہلے ڈاکٹر اس کا مکمل چیک اپ کریں گے۔ پانچ  
 ماہ تک مجھے بہت معقول تنخواہ ملے گی۔ پانچ سال بعد بھی وہ زندہ ہوئی تو پھر اس کا مکمل  
 چیک اپ ہوگا۔ اگر نتائج پچھلے چیک اپ کے مقابلے میں منفی نہ ہوئے تو مجھے دس لاکھ  
 امریس گے اور اس کے بعد ہر سال دس لاکھ ڈالر ملتے رہیں گے، جب تک جینا میکم  
 زندہ رہے گی، لیکن ہاں..... میرا زندہ رہنا بھی ضروری ہوگا۔“  
 ”زبردست۔“ راحیلہ نے گہری سانس لے کر کہا ”زبردست چالاکی کی ہے تم  
 نے۔“

”چالاک تو میں ہوں۔“

”میں تمہاری نہیں، پھوپھی میکم کی بات کر رہی ہوں۔“

یوسف نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”اوہ..... تو یہ سمجھتی ہو تم۔ لیکن یہ  
 حقیقت ہے کہ دولت آدمی کو چالاک بنا دیتی ہے لیکن پھر بھی، میں نے خیال رکھا ہے کہ  
 کبھی بھی صورت میں خسارے میں نہ رہوں۔“

”ہاں۔ یہ تو ہے۔“ راحیلہ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اور تم اس وقت  
 تک دولت کے قائل رہو گے، جب تک تمہیں کسی ایسی چیز کی شدت سے طلب نہیں  
 ہوگی جسے دولت بھی نہیں خرید سکتی۔ جو..... تم جینا کے متعلق پوچھ رہے تھے۔ میں  
 نے اس رات نزارتھ میں اسے روتے دیکھا تھا۔“

”اس سے کیا ہوتا ہے؟ عورتیں تو بے بات بھی رو پڑتی ہیں۔“

نہیں تھی۔ اب اس کی خوبصورتی تسخیر کر لینے والی تھی۔ اس کے جسم سے اٹھ  
 مک، جو کسی فرانسیسی خوشبو کی مہون منت ہرگز نہیں تھی، یوسف تک پہنچ رہی تھی  
 اس کے دل میں عجیب سی تڑپ..... طلب جگا رہی تھی۔

”یہ سچ ہے جو۔“ راحیلہ نے کہا ”تم نہ ہوتے تو میں یہاں کیسے آتی۔ تم نہ  
 تو میں وہیں پھوپھی میکم کے ساتھ زندگی گزارتی رہتی۔ خوف کے سائے میں۔“  
 پہلی بار مس میکم کو پھوپھی میکم کا تھا۔ ”تم نے مجھے سکھایا کہ بدترین صورت حال میں  
 خوف زدہ نہیں ہونا چاہئے۔“  
 ”تب تو تم میری شکر گزار ہوگی؟“

”تمہارے انداز میں اتنی نفرتیں کیوں ہیں جو؟ تم نے یہاں مردہ زمین کے  
 سے زندگی کی کونسلیں پھونٹے نہیں دیکھیں؟ دیکھیں تو ان کا دیا ہوا پیغام محسوس  
 نہیں کیا؟ کیا یہاں کسی چیز نے بھی ایک لمحے کے لئے بھی تمہارے دل کو نہیں چھوا؟“  
 ”دیکھو..... میں کوئی جذباتی آدمی نہیں ہوں۔“ یوسف نے کہا۔ پھر،  
 پوچھا۔ ”یہ جینا کو کیا ہو گیا؟ یہاں آئی تھی تو شجر حیات کے لئے مری جا رہی تھی یا  
 ایسی بے نیاز ہو گئی۔ یہ ڈاکٹر لیوی کوئی چکر چلا رہا ہے۔ میں سمجھ نہیں پا رہا ہوں۔ ا  
 کھیل تمہاری سمجھ میں آ رہا ہے؟“

”اور اگر وہ سرے سے کوئی کھیل ہی نہ ہو تو؟“

”بی بی..... تم بہت معصوم ہو۔“ یوسف نے ایک لمحے کو سڑک سے نظری  
 اسے دیکھا ”سوچو تو..... ایک ارب پتی خاتون، جس کی صنعتیں امریکا اور یورپ کے  
 ترقی یافتہ ملکوں میں موجود ہیں، اسرائیل آتی ہے..... اور کہیں سے خوبصورت  
 کرنے والا ایک یہودی نمودار ہوتا ہے، تو تمہارا خیال ہے کہ اس میں کوئی چکر  
 دوگا۔ ضرور ہوگا۔ کچھ نہیں تو اتنا بہر حال ہوگا کہ وہ اس سے اپنے ملک کے لئے مالی  
 لے گا، ترقیاتی منصوبوں کے لئے، اور سب سے بڑھ کر اسلحہ خریدنے کے لئے۔ ہوش  
 آؤ راحیلہ۔ یہ گمشدہ قبیلہ..... یہ طویل العری کا راز..... شجر حیات، جس  
 بارے میں کسی باہر کے آدمی کو نہیں بتایا جاتا..... یہ تمہیں کسی کمائی کا پلاٹ  
 لگتا؟“

”لیکن اگر یہ سب سچ ہو تو؟“

”تو یہ بڑی خوشی کی بات ہوگی۔“ یوسف نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”ڈاکٹر لیوی کا

بہت ہے اور میں یہاں اسرائیل کی طرف سے عربوں سے جنگ لڑنے نہیں آیا  
لخت ہو مجھ پر!

”لیکن تمہیں کیا؟ تم مسلمان تو نہیں ہو۔“

یوسف کے تن بدن میں آگ لگ گئی لیکن اس نے خود پر قابو رکھا ”میں پاکستانی تو  
ہوں۔“

”میں نے تمہارے متعلق جو چھان بین کرائی تھی اس سے یہ واضح نہیں ہو سکا تھا

کہ تم جوزف ڈیوڈسن ہو یا یوسف عالم۔“ راحیلہ نے پر خیال لہجے میں کہا ”میں ذاتی طور

پر بھی نہیں سمجھ پا رہی تھی لیکن اب بات کچھ کھل رہی ہے۔“

”تم کچھ بھی سمجھتی رہو، ایک پاکستانی ہونے کے ناتے میری ہمدردیاں عربوں کے

ساتھ ہیں۔ میں یہودیوں سے نفرت نہیں کرتا لیکن ان سے محبت بھی نہیں کر سکتا۔“

”محبت تو تم اپنے سوا کسی سے بھی نہیں کر سکتے۔“ راحیلہ نے عجیب سے لہجے میں

کہا۔

”ہاں..... یہ قانون بھٹا کا پہلا اصول ہے۔“ یوسف نے کہا ”اور تم اپنی کو، تم تو

پاکستانی ہونے کے ساتھ ساتھ مسلمان بھی ہو، تمہیں کچھ بھی نہیں ہوتا؟“

راحیلہ کا چہرہ تھمتھا اٹھا۔ ”تم میری فکر مت کرو۔ اپنی بات کرو۔ جنگ سے ڈر لگ

رہا ہے؟“ اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”ڈر تو نہیں لگ رہا ہے۔“ یوسف نے برا مانے بغیر کہا ”لیکن مجھے پرائیویٹ قسم

کی جنگیں اچھی نہیں لگتیں۔ جس قسم کا سامان ہم لے کر چلے ہیں اس سے کسی کو بھی

نقصان پہنچ سکتا ہے اور میں نہیں چاہتا کہ تمہیں کوئی نقصان پہنچے..... یا مس میکلم

کو۔“

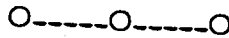
راحیلہ اسے بغور دیکھتی رہی پھر بولی ”کیا تمہارے پاس بھی ضمیر ہے جو؟“

”شاید نہیں..... اسے ایک طرح کا..... کاروباری نوعیت کا احساس ذمے

داری سمجھ لو..... میں نے کسی سے طویل زندگی کا وعدہ کیا اور طویل زندگی کی طرف

بلنے والے راستے پر میرے سامنے وہ مارا جائے، یہ میرے شایان شان نہیں۔ آیا کچھ

کچھ میں؟“



”جینا میکلم ایسی عورت نہیں۔ اتنے طویل ساتھ میں میں نے ایک بار بھی ان  
آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھے۔“

”تو تمہارا کیا خیال ہے، کیا ہوا تھا انہیں؟“

راحیلہ نے اس سوال کا جواب ایک سوال سے ہی دیا۔ ”جو، ایک بات بتاؤ۔ یہ

آنے کے بعد تمہیں اب تک کچھ محسوس نہیں ہوا، کوئی تجربہ نہیں ہوا؟“

”مثلاً؟“

راحیلہ بے حد سنجیدہ نظر آنے لگی۔ ”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے کیسے یا

کیا جا سکتا ہے۔ کبھی عجیب سی اداسی ہوتی ہے۔ گلا خود بخود رندھ جاتا ہے۔ کبھی عجیب

اضطراب، عجیب سی تڑپ روح میں کروٹیں لینے لگتی ہے۔ کبھی عجیب سی قربت کا احسا

ہوتا ہے.....“

”قربت! مگر کس سے۔“

اس بار راحیلہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”نہیں۔ مجھے ایسا کوئی تجربہ نہیں ہوا۔ مجھے کوئی غیر معمولی بات محسوس نہ

ہوئی۔“ بالآخر یوسف نے جواب دیا۔

کافی دیر تک وہ خاموش رہے۔ ہول پیرہ جھیل سے اوپر وہ زرخیز پہاڑوں کی طرز

بڑھتے رہے۔ وہاں چھوٹی چھوٹی آبادیاں تھیں۔ کوہ ہرمن کی سفید چوٹی اب صاف نظر

رہی تھی۔ دائیں بائیں شام کے علاقے کی پہاڑیاں تھیں۔

بالآخر یوسف نے ہی خاموشی توڑی۔ ”ہم جہاں جا رہے ہیں، جس انداز میں

رہے ہیں اور جن لوگوں کے ساتھ جا رہے ہیں، یہ مجھے اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ ذرا

اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ ہم کی کامیابی یا ناکامی جائے جہنم میں۔“ اس نے کہا۔

”تم کس بات سے فکر مند ہو جو؟“ راحیلہ نے پوچھا۔

یوسف نے سر کی جنبش سے جیب کے عقبی حصے میں رکھے ہوئے دونوں بکسوں کی

طرف اشارہ کیا۔ ایڈیوری نے میٹلا سے نکلنے کے کچھ ہی دیر بعد ان دونوں بکسوں کو دہلا

لا دیا تھا۔ ”جانتی ہو، ان بکسوں میں کیا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

راحیلہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”ان میں دودھ کے یا خشک غذا کے ڈبے نہیں ہیں۔ ایک بکس میں چیکو سلوا کی

کے ساختہ بم ہیں اور دوسرے میں ۲۰۳ کی رائفلیں۔ یہ سامان ایک اچھی خاصی جنگ کے

لہانے ہوتی ہے تو ہم ان خواہشوں کا تجربہ کرنے، ان کی حقیقی اہمیت کو سمجھنے کی بات نہیں کرتے۔ میں آپ کو نہیں بتا سکتا کہ اس راستے پر آگے بڑھنے کے بعد آپ لے خوشی ہے یا دکھ۔ میں صرف مشورہ دے سکتا ہوں۔ سوچنے سمجھنے اور غور کرنے کے بعد فیصلہ آپ کو کرنا ہے کہ آپ آگے جانا چاہتی ہیں یا نہیں۔“

یوسف نے جھٹ کہا۔ ”ہم آگے جائیں گے۔ اور ہم یہاں کس لئے آئے ہیں۔“  
”تم خاموش رہو۔“ جینا نے تند لہجے میں اس سے کہا۔ وہ اس راستے کو غور سے دیکھ رہی تھی، جو داہنی سمت مڑ رہا تھا۔ پھر اس نے نرم لہجے میں ڈاکٹر لیوی کو مخاطب کیا۔ ”میں نے کسی دور اپنے پر مجھے رک کر سوچنا نہیں پڑا۔ یہ میرے لئے ایک نیا تجربہ ہے۔ ڈاکٹر لیوی!“ وہ اس راستے پر چند قدم آگے بڑھی، مڑی اور پھر پلٹ آئی۔ اس نے جنوب کی سمت جانے والے راستے کی طرف دیکھا۔ ”میرا خیال ہے، میں تمہاری بات سمجھ گئی ہوں۔“ اس نے ڈاکٹر لیوی سے کہا ”اگر میں یہاں سے واپس چل دوں، تب بھی میں ہمیشہ یہی طرح جینا میکلم ہی رہوں گی اور اگر اپنی مرضی سے آگے بڑھنے کا فیصلہ کروں تو اس لئے تباہی و عواقب کی ذمہ دار میں ہی ہوں گی۔ یہی بات ہے نا؟“  
ڈاکٹر لیوی نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کے چہرے پر گہیر تھی۔ ”جی ہاں۔ یہی ہے۔“

جینا نے سر ہلایا۔ ”تو مجھے کیا کرنا چاہئے؟“ اس نے پوچھا۔ اس بار وہ سب سے غائب تھی۔

راہیلہ اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ چکی تھی۔ اس نے نزار تھ میں.....  
رات کی اس تاریکی میں جینا کو بچکیوں سے روتے سنا تھا۔ وہ بے اختیار بولی ”آپ وہ کریں، جس میں آپ کے لئے خوشی کا سامان ہو۔“  
جینا، ڈاکٹر لیوی کی طرف مڑی مگر اس نے مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں آپ کو مشورہ نہیں دے سکتا۔“

”آپ وہ کریں جو آپ کی جگہ آپ کے ڈیڑی ہوتے تو کرتے۔“ یوسف نے مشورہ دیا۔

یوسف نے میکلم پبلس میں گزرے ہوئے عرصے میں جان لیا تھا کہ جینا کی یہ کردی ہے۔ اس وقت یہ جملہ اس نے ایسے ادا کیا، جیسے بھرے ہوئے ریوالتور کا ٹریگر دبا لائو۔ پھر اس نے فوراً ہی جینا کے چہرے کے تاثر کو بدلتے، جسم میں تناؤ پیدا ہوتے، اسے

ڈان کے گرد و پیش کا علاقہ اور سرسبز تھا۔ انہوں نے اپنی جھپیں یہودیوں کی ہمتی کے باہر پارک کیں۔ مقامی لوگوں نے سیاہ روٹی، کھٹی کریم اور سلاہ سے ان کی تواضع کی۔ کھانے کے بعد انہوں نے پیدل سفر شروع کر دیا۔

لباس کا انتخاب کرتے وقت سفر کی دشواریوں کو پیش نظر رکھا گیا تھا۔ انہوں نے بھاری بوٹ پہن رکھے تھے۔ یوسف، ایڈیوری اور ڈاکٹر لیوی کے کندھوں پر کوہ پیادوں والے تھیلے تھے، جن کے تسمے بغل سے گزار کر انہیں پیٹھ پر کندھوں کے قریب باندھ لیا جاتا ہے۔ ان تھیلوں میں ایک دن کا کھانے پینے کا سامان تھا۔ وہ نمایاں بھی نہیں تھے کیونکہ اس وضع قطع کے لوگ اسرائیل میں عام طور پر سفر کرتے دیکھے جاتے ہیں۔

وہ کئی گھنٹے تک شمال مشرق کی سمت چلتے رہے۔ بالآخر وہ ایک تنگ کچے راستے پر پہنچ گئے، جو مشرق کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یہاں ڈاکٹر لیوی رک گیا اور اس نے ان سے خطاب کیا لیکن درحقیقت وہ خاص طور پر جینا میکلم سے مخاطب تھا۔ ”ہم یہاں کچھ توقف کرنا چاہتے ہیں۔“ اس نے کہا ”یہ آخری مرحلے کا نقطہ آغاز ہے۔ یہ ایک دورا ہے۔ ابھی ہمارے پاس یہ سہولت موجود ہے کہ ہم اپنے لئے راستہ منتخب کر سکتے ہیں۔ ہم واپس بھی جاسکتے ہیں۔ وہ مضافاتی علاقے میں خوشگوار پیدل سفر ہوگا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ہم آگے بڑھیں..... اس احساس کے ساتھ کہ آگے جو کچھ بھی ہوتا ہے، اس کے ذمے دار ہم خود ہوں گے۔“

جینا نے اپنے مخصوص انداز میں سر ایک طرف جھکایا اور پوچھا ”تم کیا کہنا چاہ رہے ہو ڈاکٹر لیوی؟“

”صرف اتنا کہ اس دورا پر رک کر سوچ لیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم خواہشوں کے جال میں الجھ جاتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ان خواہشوں کی تکمیل پر ہماری خوشیوں کا انحصار ہے۔ ہم اپنے دل کی آواز سننے کے لئے ذرا سا توقف بھی نہیں کرتے۔“



ایک ڈاکٹر لیوی اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ یوسف کو اطمینان تھا کہ جینا دوبارہ اپنے جینے کی ہوس کی اسیر ہوگئی ہے۔

آگے جا کر چڑھائی اتنی عمودی نہیں رہی۔ پھر وہ ایک سطح مرتفع پر پہنچ گئے۔ وہاں جنگلی پھولوں کے پودے بکثرت موجود تھے۔ وہ جگہ ایک ہری بھری راہداری کی طرح تھی۔ یہاں پہاڑی چشمہ ہموار روانی کے ساتھ چل رہا تھا اور پانی بھی خاصا گہرا تھا۔ اس کے بننے کی آواز دھیمی گنگناہٹ سے مشابہ تھی۔

کچھ آگے جا کر راہداری چوڑی ہوگئی۔ وہ درختوں کے ایک جھنڈ میں پہنچ گئے۔ وہاں سبز ہی سبز تھا اور دبیز خاموشی تھی۔..... تہ در تہ خاموشی۔ ایک جانب شاہ بلوط کا ایک بہت بلند و بالا درخت تھا، جو یقینی طور پر سیکڑوں سال پرانا تھا۔ اس درخت کی شاخیں جس گہرے میں پھیلی ہوئی تھیں، اس کا نصف قطر کسی بھی طرح پچاس گز سے کم نہیں تھا۔ وہاں چٹانوں اور گول پتھروں کا انبار لگا تھا۔ ان میں سے کچھ بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے اور کچھ کو انسانی ہاتھوں نے ترتیب سے لگایا تھا۔ وہاں وہ اچھے خاصے چبوترے کی شکل اختیار کر گئے تھے۔ چھوٹے پتھروں کے ایک ڈھیر کے پاس تازہ مٹی کا ایک ٹیلا تھا۔ ٹیلے کے ایک کنارے ایک چھڑی گڑی تھی، جس پر ایک آہنی خود رکھا تھا۔

اس جھنڈ میں ذہن پر چھا جانے والے شاہ بلوط کے پرانے درخت کے علاوہ ایک اور غیر معمولی چیز بھی تھی۔ وہاں تازہ پانی کا ایک چشمہ تھا۔ چشمہ تھانولے کی شکل کے ایک گڑھے میں تھا۔ تھانولا بھر جانے کے بعد پانی کناروں سے باہر آکر زمین پر پھیل رہا تھا۔ آگے جا کر وہ چٹانی رخنوں میں گم ہو جاتا تھا۔ تب انہیں پتا چلا کہ جس چشمے کے ساتھ ساتھ وہ سفر کرتے آئے تھے اس کا منبع یہی تھا۔ چشمہ ہمیں سے شروع ہوتا تھا۔

زمین پر سبزے اور شاہ بلوط کی سوکھی پتیوں کے قالین کی وجہ سے قدموں کی آہٹ بھی نہیں ابھر رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس مقام کا سکوت آوازوں کے لئے ناقابل تسخیر معلوم ہو رہا تھا۔

پھر اچانک خاموشی کا شیشہ جیسے چھنا کے سے ٹوٹا۔ زمین پر گری سوکھی شاخوں کے قدموں تلے چٹختنے کی اور لکڑی اور چمڑے سے دھات کے ٹکرانے کی آوازیں بلند ہوئیں۔ جھنڈ کے جنوبی حصے کی جھاڑی کے عقب سے بین آنزک نمودار ہوا۔ وہ تنہا نہیں تھا۔ اس کے ہم عمر درس نوجوان اس کے ساتھ تھے۔ وہ سب خاکی قمیض، خاکی ٹیکر، لمبے مونڈے اور بھاری بوٹ پہنے ہوئے تھے اور رائفلوں، ریوالتوں اور اسٹین گنوں سے مسلح

اضطراب سے ہاتھ ملتے دیکھا۔ اس کے وجود میں طمانیت سی تیر گئی۔ وہ پھر کامیاب تھا۔ میٹکم پبلز میں جینا جب بھی ڈوبنے لگتی وہ یہی حربہ استعمال کرتا تھا۔ وہی حربہ پھر آیا تھا۔

ڈاکٹر لیوی سے سامنا ہونے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ یوسف نے مدافعت چھوڑ دی۔ جوابی حملہ کیا تھا؟ اس نے ایک جھلے سے اس کا سحر توڑ دیا تھا۔ اس نے جینا کے ذہن؛ اس شخص کی یاد کا الاؤ دے دیا تھا، جسے وہ آئیڈیل مانتی تھی۔..... جو عمر بھر دولت و قوت کے حصول کے لئے جدوجہد کرتا رہا تھا۔

یوسف نے طمانیت سے دیکھا، جینا کے چہرے کا نچلا حصہ جیسے پتھرا گیا تھا، ہونہر پہنچ گئے تھے اور ضدی پن کی لکیریں نمایاں ہوگئی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں وہ چمک نمودار ہوگئی تھی، جو اس کے تجربے اور مشاہدے کے مطابق حساب کتاب لگانے، مشروط تھی۔ اس کا چہرہ ویسا ہی ہو گیا تھا، جیسا یوسف نے پہلی ملاقات کے وقت دیکھا تھا۔ ”انتظار کس بات کا ہے؟“ جینا نے تیز لہجے میں کہا ”میری خواہش ہے کہ ہم آگے کی طرف سفر جاری رکھیں۔“

ڈاکٹر لیوی نے سر کو تقیبی جنبش دی اور ایڈیوری کو اشارہ کیا کہ وہ آگے آگے چلے۔ ایڈ کے پیچھے ڈاکٹر لیوی، پھر جینا میٹکم اور راحیلہ تھیں۔ یوسف سب سے پیچھے تھا۔ کافی دن بعد اسے یہ خوشی ملی تھی کہ وہ اب بھی جادو چگا سکتا ہے۔ اور اس کی خود اعتمادی بڑھ گئی تھی۔ دورا ہا جینا کا تھا لیکن فیصلہ اس نے کیا تھا۔

یہ احساس تو اسے بعد میں..... بہت بعد میں ہوا کہ وہ دورا ہا درحقیقت بھی کا دورا ہا تھا۔ خود اس کا بھی!

ابتدا ہی میں چڑھائی کا سفر شروع ہو گیا۔ راستہ بہت آہستگی سے اور بتدریج اوپر کی جانب جا رہا تھا۔ اطراف میں روئیدگی تھی۔ کبھی کبھی مرغزار آجاتے جہاں ہوا ٹھنڈی اور شفاف تھی۔ انہوں نے پانی گرنے کی آواز سنی..... اور ذرا ہی دیر بعد ایک پہاڑی جھرنان کے سامنے آگیا۔ گرنے کے بعد پانی چٹانی سطح پر بہہ رہا تھا۔ انہوں نے پانی نہ ہونے کے باوجود جی بھر کے پانی پیا۔ گرد و پیش میں جنگلی پھولوں کی مہک رچی ہوئی تھی۔

کچھ آگے جا کر گیلڈنڈی معدوم ہوگئی۔ اب انہیں ایک چٹان سے دوسری چٹان؛ چڑھ کر آگے بڑھنا تھا۔ ان کی رفتار سست پڑ گئی۔ بعض چٹانیں خطرناک حد تک چٹنی اور پھسلواں تھیں۔ وہاں یوسف، جینا کو اس کی پھرتی کی دل ہی دل میں داد دیے بغیر نہ

یہ انکشاف یوسف کو دہلا گیا۔ گویا وہ کسی جنگ سے، کسی عرب ملک سے اتنے ذہب تھے۔ اسے احساس ہو گیا کہ یہ اس کے لئے بدترین وقت ہے۔ اگر عربوں سے ان کی پارٹی کی جھڑپ ہوتی تو اس کی پوزیشن عجیب ہوتی۔ وہ اس لڑائی میں اپنی پارٹی کا ساتھ ہرگز نہیں دے سکتا تھا۔ اس وقت کا تصور کر کے ابھی سے اس کے جسم میں چنگاریاں سی جگنے لگی تھیں۔ دوسری طرف زبان سے تو کہا، وہ اپنے رد عمل سے بھی یہ ظاہر کرنے کا فخر مول نہیں لے سکتا تھا کہ وہ پاکستانی مسلمان ہے۔ ایسی غلطی سرزد ہوتی تو آخری غلطی ہی کہلاتی۔ وہ لوگ یہیں اس کی حکا بوٹی کر ڈالتے۔ دوسری طرف زندگی میں پہلی بار اس کا خون جوش مار رہا تھا، جذباتیت اس پر حاوی آرہی تھی اور وہ جانتا تھا کہ انسان کے لئے سب سے مشکل کام اپنے آپ سے لڑنا ہوتا ہے۔

”یہاں..... جنگ؟“ راحیلہ نے کہا۔ اس کے لہجے میں بے یقینی تھی۔ ”اس فوضورت اور پرسکون مقام پر!“

اس دوران یودی فوجی اپنے ساتھی کو خراج عقیدت پیش کر کے پیچھے ہٹ آئے تھے۔

جینا نے پوچھا۔ ”یہ جگہ کونسی ہے؟ اس وقت ہم کہاں ہیں؟“

”یہ ان مقامات میں سے ایک ہے، جو دریائے اردن کی بنیاد ہیں۔“ ڈاکٹر لیوی نے جواب دیا ”اس جگہ کو قل القوادی کہا جاتا ہے۔ جہاں آپ کھڑی ہیں، یہ دریائے اردن کی ٹھکان ہے۔ یہاں سے پچاس گز ادھر شام کی سرحد ہے۔“

جینا کو جیسے جھٹکا لگا۔ ”دریائے اردن.....؟“ اس نے دہرایا۔

ڈاکٹر لیوی نے گول پتھروں اور چبوترے کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس بات کا قوی امکان ہے کہ زمانہ قدیم میں ڈان قبیلے کے لوگ فیصلوں کے لئے یہاں ملتے ہوں۔ یہ روایت بھی موجود ہے کہ فیصلے والے دن فرشتہ شاہ بلوط کے اسی درخت کے نیچے نمودار ہوگا۔“ اس نے کچھ توقف کیا۔ پھر بولا ”بہتر ہوگا کہ ہم چلتے رہیں۔ لڑکوں کا کہنا ہے کہ مل رکنا خطرناک ہو سکتا ہے۔“

”دریائے اردن.....؟“ جینا نے کسی سحرزدہ کے سے انداز میں دہرایا۔ پھر ہانک اس کے چہرے پر عجیب سا تاثر ابھرا۔ جیسے اندر کوئی تڑپ چل اٹھی ہو۔ اس نے ڈاکٹر لیوی سے کہا ”نہیں..... میں ابھی رکنا چاہتی ہوں یہاں۔“ اور پانی سے بھرے ٹوکے ہوئے تھانولے کو نظرس جمائے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے پانی میں ہاتھ ڈال دیا۔ ”سنا

تھے۔ ان میں سے کچھ کی بیٹلیس میں دستی بم بھی اڑے ہوئے تھے۔ ان کے پاس یہ کردہ خیمے تھے، سامان رسد اور فاضل ایمونیشن بھی تھا۔ ان کے سروں پر برطانوی ساخت کے خود تھے۔ ان کے انداز میں چونکا پن تھا اور چروں پر خود اعتمادی۔ وہ دیکھنے میں فوجی لگتے تھے۔

بین آنزک، جینا کی طرف بڑھا۔ اس کے ساتھ ایک خوش قامت لڑکا تھا جس کے ہونٹوں پر دوستانہ مسکراہٹ تھی۔ کم عمری کے باوجود وہ پختہ کار لگ رہا تھا۔ بین آنزک نے جینا کو مسکرا کر دیکھا۔ ”یہ آپ کی فوج ہے مادام۔“ اس نے کہا اور پھر اپنے ساتھی لڑکے کا تعارف کرایا ”یہ کیپٹن شلوموین برگ ہے۔ اس وقت یہ غیر سرکاری طور پر ہمارے ساتھ ہے۔ یہ سمجھ لیں کہ ہم سب چہل قدمی کے لئے نکلے ہیں۔“ اس نے مسلح لڑکوں کی طرف اشارہ کیا۔

خود بین آنزک اپنا کھنڈرا پن کہیں پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ وہ اس وقت ایک لڑکا لگ رہا تھا۔ وہ بھی بھاری فوجی بوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی اور کندھوں سے بیلٹ تک کارٹوس کی کراس پٹیاں تھیں۔ بیلٹ پر چھ چیکو سلوکیکن ساخت کے بم لگے ہوئے تھے۔

جینا نے گروپ کو بغور دیکھا اور طمانیت سے سر ہلا دیا۔

یوسف، راحیلہ کو بغور دیکھ رہا تھا۔ بین آنزک کو دیکھتے ہی راحیلہ کے چہرے پر جو تاثر نمودار ہوا تھا، اس نے اسے خصوصیت سے نوٹ کیا ”تو تم ان تیاریوں میں مصروف تھے بین آنزک!“ اس نے طنز آکھا ”لیکن یہ تو بتاؤ جنگ کہاں ہو رہی ہے؟“

ایڈاپوری نے اپنی رائفل اور پشتی بیگ اتار کر ایک طرف رکھ دیا تھا۔ اس نے ایک ٹیلے کی طرف اشارہ کیا جس میں گڑی ہوئی آہنی چھڑی پر آہنی خود جھول رہا تھا۔ ”وہاں..... کوئی سوگز دور۔“ اس نے کہا۔

مسلح یودی جوان ٹیلے کے گرد نیم دائرے کی شکل میں کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے اپنی ٹوپیاں اتار لیں اور سر جھکا لئے ایڈاپوری اور ڈاکٹر لیوی بھی ان کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ شلوموین برگ عبرانی زبان میں کچھ کہہ رہا تھا۔

”یہ کیا کہہ رہا ہے؟“ جینا میلمک نے سرگوشی میں پوچھا۔

”ماں..... یہ جس سپاہی کی قبر ہے، وہ ان کا دوست تھا۔ یہ لوگ جنگ میں ساتھ تھے۔ وہ یہاں چھ ہفتے پہلے مارا گیا تھا۔“

ہے، یہ پانی گناہ دھو ڈالتا ہے۔“ وہ بولی ”اور میں بہت گناہ گار ہوں۔“

یوسف کو یہ بات بہت بری لگی۔ گناہ دھلنے کا یہ تصور تو ہندوؤں کے پاس ہے..... گنگا جل۔ دوسری طرف اسے تشویش بھی ہو رہی تھی۔ ”مس میکم، یہ جگہ رکنے کے لئے مناسب نہیں۔“ اس نے کہا ”ابھی چند ہفتے پہلے یہاں ایک لڑکا مر چکا ہے۔ ڈاکٹر لیوی کا مشورہ درست ہے۔ اگر میں.....“

”خاموش رہو۔“ جینا میکم نے اسے ڈانٹ دیا۔ ”میں نے تم سے کچھ پوچھا نہیں ہے، میں نے حکم دیا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ مجھے پیتسمہ دیا جائے؟“

کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جینا میکم کے چہرے پر پریشانی کا سایہ پھیلنے لگا۔

”ڈاکٹر لیوی..... تم مجھے پیتسمہ نہیں دے سکتے؟“ اس نے بے بسی سے پوچھا۔ اس کی رعوت، تحکمانہ لہجہ، شاہانہ انداز..... سب ختم ہو چکا تھا۔ اب اس کے لہجے میں بچوں کی سی التجا تھی۔ ”ڈاکٹر لیوی پلیز..... میں التجا کرتی ہوں.....“

سب اسے دیکھ رہے تھے۔ پانی کے بننے کی آواز کے سوا جھنڈ میں کوئی آواز نہیں تھی۔

ڈاکٹر لیوی نے تیز نظروں سے جینا کو دیکھا اور پوچھا۔ ”کیا تم حالت طہارت میں ہو پیتسمہ کے لئے؟“ اب اس کے لہجے میں جینا کے لئے احترام نہیں، ایک عجیب سا دبدبہ تھا۔ جیسے اسے اپنی پوزیشن میں تبدیلی کا احساس ہو گیا ہو۔

جینا کی مٹھیاں بھنج گئیں اور جسم لرزنے لگا۔ ”مجھے ایک سلام یاد آ رہا ہے آسمانی کتاب کا۔ میں اسے سن رہی ہوں لیکن دہرا نہیں سکتی۔“

بین آئزک نے اچانک پڑھنا شروع کر دیا۔ ”اردن کی سرزمین سے..... ہرمن پہاڑ سے.....“

”ہاں..... یہی ہے..... یہی ہے.....“ جینا نے چیخ کر کہا۔ پھر وہ ڈاکٹر لیوی کی طرف مڑی۔ ”ڈاکٹر..... پلیز!“

”ٹھیک ہے۔“ جیسے آپ کی مرضی۔ میں آپ کو پیتسمہ دوں گا۔ آپ تیار ہو جائیں۔“ ڈاکٹر لیوی نے باوقار انداز میں کہا۔

جینا گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔ اس نے جوتے اور پھر موزے اتارے۔

یوسف نے سرگوشی میں راحیلہ سے کہا ”خدا کے لئے..... اسے روکو۔“

”خاموش رہو۔ میں کیوں روکوں؟ ان کے چہرے کو دیکھو، تمہیں احساس نہیں

کہ یہ ان کی ضرورت ہے۔“ راحیلہ نے جواب دیا۔

جینا اٹھ کر اس طرف گئی، جہاں مغرب میں اترتے سورج کی پیلی دھوپ پتوں سے نچھن کر پلکیں جھپکا رہی تھی۔ وہ بتے پانی میں کھڑی ہو گئی، جو اس کے ٹخنوں تک آ رہا

ڈاکٹر لیوی، جینا میکم کے پاس آکھڑا ہوا۔ اس نے جھک کر ہاتھوں کے پیلے میں نہ ہوئے پانی کو بھرا اور پھر اس پانی کو جینا کے سفید بالوں والے سر پر یوں چھڑکا کہ پانی کے رخساروں پر بہہ آیا۔ آنسوؤں کی سی لکیریں بن گئیں۔

”میں خدائے واحد کے نام پر تمہیں پیتسمہ دیتا ہوں جینا میکم۔“ ڈاکٹر لیوی نے

وہ دونوں پانی سے نکل آئے۔ ایڈا یوری، جینا کی طرف بڑھلا۔ اس نے جینا سے ہاتھ تے ہوئے کہا ”مبارک ہو مس میکم مجھے خوشی ہے کہ آپ نے اپنی روح کی طلب کی۔“

اس لمحے یوسف کو ایک عجیب سا احساس شکست ستا رہا تھا۔ جیسے وہ کوئی جنگ ہارا ایسی جنگ جس میں اسے عملی طور پر حصہ لینے کا موقع ہی نہیں ملا ہو۔ ایک ایسی

جس سے اس کا بہت گہرائی میں کوئی تعلق ہو، جس میں وہ دفاع تک نہ کر سکا ہو اور بہہ رہا ہو۔

○-----○-----○

وہ ان کا پہلا پڑاؤ تھا۔ کوہ ہرمن کی طرف جانے والے راستے پر، اس گھاٹی کے

لے پر سخت زمین پر کھیل اوڑھ کر لیٹے ہوئے یوسف کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ

بٹ پینا چاہتا تھا لیکن کیپٹن شلومو نے روشنی پر سختی سے پابندی لگا دی تھی۔ اور وہ اس

لاف ورزی نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے نہیں کہ اسے ڈسپلن بہت عزیز تھا۔ بلکہ اس

کہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ عربوں سے ان کی پارٹی کا تصادم ہو۔ وہ اس بدترین وقت کو

سے دور رکھنے کا خواہش مند تھا۔

ڈان سے ذرا دور قہیرہ روڈ پر انہوں نے سرحد پار کر لی تھی..... بغیر کسی

لووار واقعے کے۔ پھر وہ جنگل کی اس پٹی پر سفر کرتے رہے تھے، جو شام اور لبنان کے

ان واقعے تھی۔ وہاں سفر کرنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ وہ پٹی لبنان اور شامی

کے گشتی دستوں سے محفوظ تھی اور ڈاکٹر لیوی اور کیپٹن شلومو دونوں ہی اس نکرار

“ہاں۔”

”یہ صورت حال تو تمہیں بہت پسند ہوگی؟“

”ہاں۔ تمہیں پسند نہیں کیا؟“

یوسف تاریکی میں مسکرایا۔ ”نہیں۔ تمہیں شاید یاد نہیں۔ میں ایک امن پسند آدمی ہوں۔ میں جنگیں بھی اور طرح کی لڑتا ہوں۔“ اتنا کہہ کر اس نے کچھ توقف کیا۔ پھر پوچھا۔ ”تمہیں کس قسم کے چیلنج کی توقع ہے؟“

”عرب قزاقوں کی طرف سے خطرہ ہے۔“ مین آئزک نے جواب دیا۔

”عرب مسلمان؟“ اندر کی کسی کمک..... کسی خدشے نے یوسف کو پوچھنے پر مجبور کر دیا۔

بین آئزک نے چونک کر اسے دیکھا لیکن اتنی تاریکی میں اس کے چہرے کے  
 اثرات کو دیکھنا ناممکن تھا۔ بالآخر اس نے ٹھہرے ہوئے لمبے میں جواب دیا۔ ”قراقوں کا  
 کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ وہ عیسائی بھی ہوتے ہیں، مسلمان بھی اور یہودی بھی اور وہ مذہبی  
 اختلافات بھلا کر ساتھ مل کر کام کرتے ہیں۔“

یوسف نے سکون کی گہری سانس لی۔ یہ ایک اچھی اطلاع تھی۔ اس کا اپنا خیال بھی یہی تھا کہ قزاقوں، اسمگلروں کا نہ کوئی مذہب ہوتا ہے نہ وطنیت۔

”تم نے یہ بات کیوں پوچھی؟“ بین آئزک نے اچانک سوال کیا۔

”یونہی..... تجسّس کے زیر اثر۔“

”کہیں یہ تو نہیں کہ مسلمان پر گولی چلانے سے بچنا چاہتے ہو؟“

یوسف چونکہ ہو گیا۔ گفتگو خطرناک حدود میں داخل ہو رہی تھی۔ ”میں تو سرے سے گولی ہی نہیں چلانا چاہتا۔“ اس نے نرم لہجے میں کہا۔ ”اور تم یہ نہ بھولو کہ کراچی کیس میں نے تمہیں مسلمانوں کے ہاتھوں نکالوٹی ہونے سے بچایا تھا۔“

”وہ اس لئے کہ تمہیں مجھ سے غرض تھی۔“

”اس بھول میں مت رہو۔ میں ہر ضروری چیز کا متبادل تلاش کرنے میں ماہر ہوں۔ اپنا کام کسی نہ کسی طرح نکالنے کا فن آتا ہے مجھے۔“

بین آئزک نے گہری سانس لی۔ ”بہر حال، تمہارا وہ قرض میں نے چکا دیا ہے۔“  
 ک نے کہا۔

”وہ کیسے؟“

سے بچنا چاہتے تھے۔ مگر اس صورت میں انہیں لبنانی قزاقوں سے خطرہ لاحق تھا۔ یہ وحشی قزاق عرب اسرائیل جنگ سے فائدہ اٹھا رہے تھے۔ وہ مم جو پارٹیوں کو موقع ملے ہی لوٹ لیا کرتے تھے۔ تاہم ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ یہ راستہ نسبتاً آسان تھا۔ خاص طور پر جینا میلکم کے نقطہ نظر سے۔ کوہ ہرمن تک پہنچنے کے لئے انہیں اٹھلی وادیوں کے ایک سلسلے کو عبور کرنا تھا۔ راستہ بدترنج چڑھائی کا تھا۔

پڑاؤ آدمی رات سے پہلے ڈالا گیا تھا۔ گہرے اندھیرے کے باوجود لڑکوں نے جس تیزی، پھرتی اور مستعدی سے جینا اور راحیلہ کے لئے خیمے نصب کئے تھے، وہ قابلِ داد تھی۔ پھر انہوں نے ان دونوں کے گدوں میں ہوا بھر کر بستر لگا دیا۔ مرد زمین پر سو رہے تھے۔

اتنے عرصے کی آرام دہ اور پریشانی زندگی نے یوسف کو نرم کر دیا تھا۔ سو اب سخت زمین پر اس کا جسم احتجاج کر رہا تھا۔ یوسف دل ہی دل میں خود کو برا بھلا کہتا رہا۔ عمر بھر اس نے صعوبتیں اٹھائی تھیں لیکن تھوڑے دن کے آرام نے اس ریاضت، اس تپسیا کو غارت کر دیا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ آئندہ اس سلسلے میں احتیاط کرے گا۔ تجربے نے ثابت کر دیا تھا کہ تکلیف کی عادت دیر میں اور آرام کی بہت جلدی اور بڑی آسانی سے پڑ جاتی ہے۔ یوسف نے سرگھما کر گھاٹی کے دہانے کی سمت دیکھا۔ غبار آلود افق کے پس منظر میں اسے مین آئزک کا ہیولا نظر آیا۔ وہ کھڑا دو گھنٹے کی پہرے داری کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ یوسف اٹھ بیٹھا۔ اس کے برابر ہی ڈاکٹر لیوی زمین کی سختی سے بے نیاز گہری نیند سو رہا تھا۔ یوسف اٹھا اور اندھیرے میں قدموں سے راستے کو ٹٹولتا آگے بڑھا۔ وہ مین آئزک کے قریب پہنچا تو مین آئزک نے جھٹکے سے سرگھمایا، ساتھ ہی کلک کی آواز ہوئی۔ یعنی راکفل فار کے لئے تیار تھی۔ ”ایزی بوائے“ ایزی۔“ یوسف نے اسے چکارا۔ ”نہ میں ہوں..... جوزف۔“

بین آنزک کا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ تاہم اس کے لمبے میں تباؤ تھا۔ ”یوں اندھیرے میں آزادانہ گھومنا پھرنا ملک ثابت ہو سکتا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”تمہیں یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔ احکامات کے مطابق تمہیں اپنے بستر پر ہی رہنا تھا۔“

”ہاں۔ یہ تو ہے۔“ یوسف نے کہا۔ لیکن اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ اس کا نلنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ اس نے ہاتھ سے نٹول کر ایک چٹان تلاش کی اور اس پر جم کر بیٹھ گیا۔ چند منٹ خاموشی رہی۔ پھر یوسف نے اچانک ہی پوچھا۔ ”بہت خوش ہو؟“

بین آنزک کا چہرہ ست گیا، آنکھیں جھک گئیں۔ یوسف احساس فتح سے سرشار ہو باہاس نے ایک بار پھر یقینی طور پر ہاری ہوئی بازی جیت لی تھی۔ ”اچھا..... اب دل ہارنے کی ضرورت نہیں۔ اس گفتگو کو بھول جاؤ۔“ اس نے مریدانہ انداز میں کہا۔  
”ٹھیک ہے۔“ بین آنزک نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ ”چھوڑو اس قصے کو۔  
لیا اور بات کرو۔“

”بہر حال خطرہ تو ہے۔“ یوسف نے کہا۔ ”اگر تم کسی عرب کی رانقل کی نال کے نے آگئے اور اس نے ٹریگر دبا دیا تو تمہارا مرنا یقینی ہے، اور یہ نہ بھولو کہ تم اس وقت کی سرزمین پر ہو..... بن بلائے مہمان کی حیثیت سے۔“

”کاش..... ایسا موقع آجائے!“ بین آنزک نے تپ کر کہا۔  
”میں بہر حال یہ دعائیں کر سکتا اور ڈاکٹر لیوی کے متعلق کیا خیال ہے؟“  
”کیا مطلب؟“

”وہ کس طرح کے آدمی ہیں؟“  
”زبردست..... شاندار۔“

یوسف مسکرایا۔ ”میرا مطلب ہے، وہ کس طرح کے آدمی ہیں؟“  
”اب تو تم نے بھی انہیں اچھی طرح دیکھ لیا ہے۔ تمہیں وہ عظیم آدمی نہیں؟“

”ہاں۔ وہ بہت کچھ جانتے ہیں۔“ یوسف نے اعتراف کیا۔ ”لیکن اسرائیل میں وہ رہے ہیں؟“  
”نہیں! اگر ہے ہیں۔“

”اتنا بڑا اسکالر اور آلو، چقدر اور کھیرے اگائے۔ یہ لائن مجھے مت دو۔“ یوسف غارت سے کہا۔ ”یہ تو کسی اور سرگرمی کے لئے کور ہو گا۔ بلیک مارکیٹنگ کا چکر ہے یا ٹیلی جینس کا؟“

”دونوں میں سے کوئی بھی نہیں۔“ بین آنزک نے بڑے تحمل سے کہا۔  
”میرے خدا! کہاں پھنس گیا میں.....“

”تم کئی بات پر..... کسی چیز پر بھی یقین نہیں کرتے۔ ہے نا؟“ بین آنزک نے کہا۔ ”میرا خیال تھا کہ تمہیں بصارت سے کام لینا آتا ہے۔ یہ سوچو کہ پانچ ہزار

”ایک تو اسرائیل لاکر۔ اس سرزمین پر کسی مسلمان کا گزر نہیں۔“  
”لیکن یہ احسان تم نے مجھ پر نہیں، راحیلہ ذیشان پر کیا ہے۔ وہ خالص مسلمان ہے۔ لباس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔“ یوسف کے لہجے میں چکار تھی۔  
”میں اس کی نہیں تمہاری بات کر رہا ہوں۔“ بین آنزک نے تپ کر کہا۔ ”تم نے دو ناموں کے حوالے سے معنی خیز گفتگو کی تھی کراچی میں۔ اور میں کیا..... راحیلہ بھی تفتیش کرانے کے باوجود وثوق سے نہیں کہہ سکتی کہ تمہارا مذہب کیا ہے۔ مجھے تو تمہارے عزائم پر بھی شک ہو چلا ہے۔“

”شک ہی ہے نا، یقین تو نہیں۔“ یوسف نے چھیڑنے والے انداز میں کہا۔ ”شک کی بنا پر تو تم کچھ نہیں کر سکتے۔“  
”یہ عدالت نہیں، جو تمہیں شک کا فائدہ دے کر بری کر دے۔“ بین آنزک نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”میں یہ انکشاف کردوں کہ تم مسلمان ہو تو ابھی تمہارے ٹکڑے ہو جائیں گے۔“

اب یوسف کو غصہ آنے لگا تھا۔ ”تو یہ انکشاف کر کیوں نہیں دیتے؟“ اس نے چیلنج کیا۔

”اس کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ اس لئے کہ جانتا ہوں، تمہارا مذہب صرف تمہاری غرض ہے۔ دنیا کے کسی مذہب سے تمہارا تعلق نہیں۔“

رات کے اس سناٹے کا اثر تھا یا اس اجنبی، مقدس سرزمین کافسوں، یوسف کو لگا کہ بین آنزک نے اسے دنیا کی سب سے بڑی گالی دی ہے۔ اس کا خون کھول اٹھا۔ جی چاہا کہ اس وقت اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کلمہ سنا کر کر دے۔ لیکن برسوں کی خود کردہ تربیت نے اسے بروقت روک دیا۔ پھر بھی اسے احساس ہو رہا تھا کہ اسے شکست ہو رہی ہے۔ لہذا اس نے تپ کا سب سے بڑا پتا استعمال کر ڈالا۔ ”بین آنزک! میری بات بہت غور سے سنو۔ میں یہ پسند نہیں کرتا کہ کوئی مجھے دھمکیاں دے۔“ اس نے سخت لہجے میں کہا۔ ”مقام کوئی بھی ہو، صورت حال کیسی بھی ہو، مجھے آئندہ کبھی دھمکی نہ دینا۔ ورنہ تم سے پہلے میں اپنے، مس میکلم کے اور راحیلہ کے پاکستانی ہونے کا انکشاف کروں گا۔ پھر تمہارے ساتھیوں کو یہ بھی بتاؤں گا کہ راحیلہ ذیشان مسلمان ہے۔ بچے گا ہم میں سے کوئی بھی نہیں۔ میں یہ انکشاف بھی کر دوں گا کہ تمہاری منہ بولی ماں مس میکلم ایک مسلمان کے عشق میں گرفتار تھی۔ بلکہ اب بھی ہے۔ اس کے بعد کیا ہو گا، یہ تم خود سوچ لو۔“

سال کی تہذیبی، ثقافتی ترقی نے یہودیوں کو کیا دیا؟ کچھ بھی نہیں۔ آج ایک مضبوط فوج اور جس کے پاس دو توانا بازو ہوں اور وہ محنت کی خواہش بھی رکھتا ہو، دنیا کے مالدار دس ڈاکٹروں سے زیادہ کارآمد ہے۔

”یہ تم ڈاکٹر لیوی کا فلسفہ بیان کر رہے ہو؟“

”ہاں۔“ بین آئزک نے کہا۔ ”لیکن یہ بھی سن لو کہ یہ جدید اسرائیل کی ابتداء

سوج بھی ہے۔“

”وہ یہاں واپس ہی کیوں آئے۔ میں نے سنا ہے کہ یورپ میں اور امریکا میں

بہت کامیاب زندگی گزار رہے تھے۔“

بین آئزک چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر اس نے جواب دیا۔ ”انہیں بڑھاپے کا احسا ہونے لگا تھا۔ وہ یہاں واپس آئے تو خدا کی جستجو اور تلاش میں۔ تم جانتے ہی ہو کہ ا

زمانے میں وہ ربی بھی رہے ہیں۔“

”تو کیا لندن میں، نیویارک میں یا یورپ میں خدا موجود نہیں؟“

”ہاں ہے۔ وہ ہر جگہ ہے لیکن یہاں وہ سب سے قریب ہے۔ یہاں اس سے را

زیادہ آسان ہے۔ تم نے نہیں محسوس کی یہ بات؟“

اس پر یوسف کو خدا کا وہ گھریا دیا، جس کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا

اسے مولوی نعمت یاد آئے۔ ان کی باتیں یاد آئیں۔ ..... سماعت میں جیسے ان کی آوا

چشمہ سا اہل پڑا۔ اس نے سوچا۔ ہاں، یہ درست ہے۔ یہاں اس کی قربت کا احساس

ہوتا ہے۔ تو یہ احساس وہاں کیا ہو گا؟ جہاں اس کا گھر ہے؟ خانہ خدا۔ ..... بیت

جہاں انسان جاتے ہیں اور خاص اس کے مہمان ہوتے ہیں۔ ان کی مہمان داری

تواضع کی جاتی ہے۔ جہاں بادشاہ خود کو خادم الحرمین الشریفین کہلاتا اعزاز تصور کرتا۔

اس لمحے اس کے دل میں وہاں جانے کی ایسی طاقت و رامتنگ اٹھی کہ وہ حیران رہ گیا۔

میں ہوں۔ ..... میں! میں نے تو کبھی ایسے سوچا بھی نہیں تھا۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ اور

پہلا لمحہ تھا جب اس نے بیت المقدس کی سرزمین پر خدا کی قربت کا پہلا شعوری اعتراف

کیا تھا۔ ورنہ یہ اعتراف تو اس نے اب تک خود سے بھی نہیں کیا تھا۔ اس لمحے اس

فیصلہ کیا کہ زندہ رہا تو وطن جانے سے پہلے خدا کے گھر حاضری دیتا ہوا جائے گا۔ وہ

رہا تھا کہ آدمی اپنے اندر کیسے کیسے طوفان لئے۔ ..... کیسی کیسی خوبصورت بستیوں

کئے بیٹھا ہوتا ہے اور اسے علم بھی نہیں ہوتا۔

”کہاں کھو گئے تم؟“ بین آئزک نے اسے چونکا دیا۔ ”میرے انکل چند برس پہلے ب یہاں آئے تو ایک بلند پہاڑ کی چوٹی پر گئے۔ وہاں انہوں نے خدا سے بات کی۔ پوچھا کہ انہیں کیا کرنا چاہئے؟ خدا نے حکم دیا کہ انہیں یہیں رہ کر غذائی اجناس اور سبزیاں

اشت کرنی چاہئیں کیونکہ لوگوں کو انہی کی ضرورت ہے۔“

”مذاق کر رہے ہو؟“ یوسف نے بے یقینی سے پوچھا۔

”مذاق کی کیا بات ہے؟ یہاں پرانے زمانے میں لوگ خدا سے باتیں کرتے رہے

۔ میرے انکل لیوی کیونکہ سائنس داں ہیں، عملی آدمی ہیں، اس لئے انہوں نے زیادہ

مان اور براہ راست تعلق قائم کیا ہو گا۔“

یوسف اندر ہی اندر لرز کر رہ گیا۔ ”لیکن خدا نے تو صرف حضرت موسیٰ سے

ت کی تھی اور وہ پیغمبر تھے۔ اسی لئے انہیں کلیم اللہ کہا جاتا ہے۔“ اس نے احتجاجاً کہا۔

”یہ باتیں تم نہیں سمجھو گے۔“ بین آئزک نے مزیدانہ شان سے کہا۔ ”تم اس

زمین کے جو نہیں ہو۔“

”تو پھر جینا میلکم کو ماؤنٹ ہرمن پر لے جانے کی ہدایت بھی شاید خدا نے کی ہو

۔“

”ممکن ہے، یہی بات ہو۔“ بین آئزک نے سادگی سے کہا۔

یوسف کو ہنسی آگئی۔ اس نے کہا۔ ”بین آئزک، مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارا چچا کس چکر

ما ہے؟ کیا کھیل کھیل رہا ہے وہ؟ اس نے اپنے سینک یہاں کیوں پھنسائے ہیں؟ وہ جینا

و معمول کیوں بنا رہا ہے؟ ہمیں کہاں لے جا رہا ہے وہ؟“

بین آئزک نے پہلو بدلا۔ اب یوسف کی نگاہیں ستاروں کی دھیمی ضو سے ہم

ہنگ ہو گئی تھیں۔ وہ بین آئزک کے چہرے کا تاثر دیکھ سکتا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر

شادہ مسکراہٹ پھوٹی تھی۔ ”تم عجیب آدمی ہو جو!“ اس نے کہا۔ ”کراچی میں تو تم مجھے

نما تھیوری پر یقین دلانے کے لئے مرے جا رہے تھے۔ جب کہ اس کے درست ہونے کا

ردور تک کوئی امکان نظر نہیں آ رہا تھا۔ لیکن تم نے مجھے بھی قائل کر لیا اور جینا ماں کو

ی۔ ..... صرف دلائل کے زور پر۔ میں نے تمہیں بتایا کہ میرے انکل لیوی سب کچھ

سننے ہیں تو تم ان تک پہنچنے، ان سے ملنے کے لئے ترپنے لگے۔ اب جب کہ وہ مل گئے

ما اور ہماری مدد بھی کر رہے ہیں تو تمہیں اندیشے لاحق ہو رہے ہیں۔ تم آخر ہو کیا بلا؟“

”میں یہ جانتا چاہتا ہوں کہ وہ ہماری مدد کیوں کر رہے ہیں؟“





براہ راست جزل بھرتی نہیں کئے جاتے۔ جنگی حکمت عملی پر اس نے بے شمار کتابیں لکھیں۔ چنانچہ اسے شعور بھی تھا۔

لیکن یہ پہلا موقع تھا کہ وہ جنگ کے چکر میں پھنسا تھا۔ صورت حال پوری طرح کی سمجھ میں آرہی تھی۔ اس وقت دیکے رہنے اور خود کو اور راحیلہ کو زخمی ہونے بچانے کی کوشش کے سوا کرنے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ اس وقت وہ کراس فائر کی زد تھے۔ بین آئزک کی طرف سے وہ بے فکر تھا۔ وہ ایک تجربے کار لڑاکا تھا اور اپنا خیال سکتا تھا۔ ڈاکٹر لیوی کا کیا بنے گا؟ اس کی یوسف کو کوئی پروا نہیں تھی۔ وہی انہیں یہاں رہنمائے کا ذمے دار تھا۔ اس کا جو حشر بھی ہوتا، مناسب تھا اور وہ خود ہرگز مرنا نہیں تھا۔ وہ جینا کو ابدی زندگی کی تلاش میں یہاں تک لایا تھا۔ یہاں..... اس تک گھائی ایک ایسے شخص کا مرجانا مضحکہ خیز ہوتا۔

پھر یوسف کو یہ احساس بھی تھا کہ حملہ آور جو کوئی بھی ہوں، حملہ کرنے کا حق لیتے تھے۔ انہوں نے کوئی زیادتی نہیں کی ہے۔ ڈاکٹر لیوی اور اس کی پارٹی نے سرحدی ف دوزی کر کے انہیں حملے کی دعوت خود دی ہے۔

جس بڑے گول پتھر کے پیچھے وہ اور راحیلہ دیکے بیٹھے تھے وہ شمال کی طرف سے میں تحفظ فراہم کرنے کے لئے بہت کافی تھا لیکن جنوب کی طرف سے آنے والی بھولی ٹی گولیوں کے لئے وہ کھلا ہدف تھے۔ وہ سینے کے بل کھٹکتا چھوٹے پتھروں کی طرف بڑھا ران پتھروں کو جمع کر کے ایک چھوٹی سی دیوار بنالی۔ اب وہ جنوب کی سمت سے بھی فوٹا تھے۔

”اپنا سر نیچے ہی رکھو۔“ اس نے راحیلہ کے سر پر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔ ”بلکہ خود واضح سلامت دیکھنا ہے تو ہلنے سے بھی بچو۔“

ذرا دیر بعد اس نے سر اٹھا کر آگے کی سمت دیکھا۔ ڈاکٹر لیوی چند پتھروں کی اوٹ ل لیتا تھا جو اسے بہت مناسب کور فراہم کر رہے تھے۔ ڈاکٹر لیوی بخیر و عافیت بھی تھا اور لگتا تھا کہ صورت حال سے خائف بھی نہیں ہے۔ کچھ فاصلے پر گرے ہوئے درختوں کے درمیان جینا میکلم دیکھی ہوئی تھی۔ ”مس میکلم آپ خیریت سے تو ہیں نا؟“ اس نے چیخ کر پکارا۔

”ہاں..... میں خیریت سے ہوں۔“ جینا کی لرزتی آواز سنائی دی۔ ”بین آئزک کھل گیا؟ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے؟“ اس کے لہجے میں برہمی تھی۔

لیکن اس گولی کا نتیجہ نہیں معلوم ہو سکا۔ بین آئزک نے یوسف کو پکارا۔ ”زمین پر لیجے رہو اور سب کا خیال رکھو۔ ایڈ نے مجھے واپس جا کر جائزہ لینے کی ہدایت کی ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ کیپٹن شلو موکس سے لڑ رہا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ تیزی سے پلٹا اور گول پتھروں کے درمیان عقب کی طرف بھاگنے لگا۔

اب تک کوئی حملہ آور دکھائی نہیں دیا تھا۔ کیس کچھ بھی نہیں تھا..... نہ کوئی شعلہ، نہ دھواں..... بس فائرنگ کی آواز تھی۔

راحیلہ نے پھر چیخ کر جینا کو پکارا۔

”نی الوقت وہ خیریت سے ہیں۔“ یوسف نے کہا۔ ”تم ذرا سکون سے رہو۔“

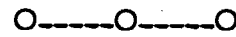
”یہ ہو کیا رہا ہے؟“

”ہم بری طرح پھنس گئے ہیں۔“ یوسف نے جھجکا کر کہا۔ ”وہ ہمارے آگے بھی ہیں اور عقب میں بھی، اور آواز سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی تعداد بھی کم نہیں۔ یہ اسرائیلی لڑکے انہیں روکنے کی کوشش.....“

”تو تم ان کی مدد نہیں کرو گے؟“ راحیلہ نے پوچھا۔

یوسف نے سر دنگا ہوں سے اسے دیکھا۔ ”کیا پھر مارنے شروع کر دوں؟“ اس نے جھجکا کر کہا۔ ”اور بین آئزک کو ویسے بھی ہیرو بننے کا بہت شوق ہے۔ سوا سے شوق پورا کرنے دو۔ میرے لئے یہی بہت ہے کہ میں ثابت و سالم بچ نکلوں۔ یہ بہت بدلاوار معاملہ ہے بی بی۔ بس زندہ رہنے کی کوشش کرتی رہو۔“

فائرنگ کی آواز بڑھ بھی گئی تھی اور قریب سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ بین آئزک اور اس کے ساتھی پسپائی اختیار کر رہے ہیں۔ وہ حملہ آوروں کی پیش قدمی روکنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن شاید وہ زیادہ موثر ثابت نہیں ہو رہی تھی۔



چھوٹے پیمانے پر ہونے والی جدید جنگ معصومیت اور ہلاکت خیزی کا عجیب امتزاج ہوتی ہے۔ آرٹلری کا استعمال نہ کیا جائے تو نہ دھواں اٹھتا ہے نہ کیس آگ لگتی ہے۔ مناظر فطرت بھی جوں کے توں رہتے ہیں..... ذرا ڈسٹرب نہیں ہوتے۔

یوسف جنگ سے نااہل نہیں تھا۔ بس وہ ہاتھ پاؤں ہلانے والا آدمی نہ تھا۔ راتقل اور دیوالور کا استعمال کرنا جانتا تھا۔ نشانہ بھی اس کا بہت اچھا تھا۔ لیکن فوج میں جانے کی اسے کبھی خواہش نہیں رہی تھی۔ وہ صرف جزل کے عہدے پر کام کر سکتا تھا اور فوج

”میرے خدا..... اسے کیا ہوا ہے؟“ راحیلہ نے بے ساختہ کہا۔  
 ”یہ ان ہی کا آدمی ہے۔“ یوسف نے جواب دیا۔ اس کے لمبے میں ہلکا سا دکھ تھا۔  
 ہر خیال ہے، بین آئزک نے جو گولی چلائی تھی، وہ اس کے گلی تھی۔ شاید یہ کوئی چٹان  
 لڑے لگ گیا ہو گا۔ طاقت جواب دے گئی تو نیچے آگرا۔  
 خاموشی میں زخمی نوجوان کی کراہیں سنائی دے رہی تھیں۔  
 ”میں یہ برداشت نہیں کر سکتی۔“ راحیلہ نے کہا۔ ”یہ بے چارہ بڑی اذیت میں  
 ہے اور دیکھو تو..... یہ تو بالکل لڑکا ہے۔“

”سر جھکائے بیٹھی رہو۔“ یوسف نے اسے ڈانڈا۔ ”اور ریو الور ہاتھ میں ہو تو لڑکے  
 مرد میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ دونوں کو گولی ختم کر دیتی ہے۔ تم اپنی فکر کرو۔ ہم  
 شور کر اس فائر کی زد میں ہیں۔“ لیکن اس نے بھی دیکھ لیا کہ زخمی لڑکے کی عمر سولہ  
 سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کا چہرہ بیضی تھا۔ سیاہ آنکھیں بہت خوبصورت تھیں اور  
 بد چمکیلے دانت بے حد ہموار تھے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے پیٹ دلوچا ہوا تھا۔  
 دل کی انگلیوں کے درمیان سے گاڑھا گاڑھا خون بہہ رہا تھا۔ یوسف کو اندازہ ہو گیا کہ  
 لانے لڑکے کے معدے کو چھیل ڈالا ہے اور اس کا پچھتا مشگل ہے۔  
 وہ متاسف ہو گیا۔ لڑکا شاید مسلمان عرب تھا۔ وہ زندگی کی جستجو میں نکلنے کے بعد  
 ت کا پہلا شکار تھا..... پہلی جھینٹ!

فائرنگ گھاٹی کے دونوں کناروں سے اب بھی ہو رہی تھی اور تواتر کے ساتھ ہو  
 ا تھی۔ ایک گولی یوسف کے سر سے ذرا اوپر پتھر سے ٹکرائی، ایک اور گولی قریبی  
 ت میں دھنس گئی۔ ہر طرف گولیاں سنسناری تھیں۔

زخمی عرب لڑکے کی کراہیں لمحہ بہ لمحہ اور دلدوز ہوتی جا رہی تھیں۔ اب انہیں  
 ٹٹ کر نادشوار تر ہوتا جا رہا تھا لیکن یوسف جانتا تھا کہ اس وقت اس کی مدد کے لئے  
 اس کے لئے بے سود بھی ہو گا اور خود اپنے لئے ملک بھی۔ وہ بری طرح گھرے  
 تھے۔

”کوئی اس بچے کی خبر لے گا بڑھ کر یا یہ کام مجھے ہی کرنا پڑے گا!“ اچانک جینا میکلم  
 بار آواز میں چلائی۔

یوسف کا دھیان اس کی طرف ہوا۔ اسی لمحے اسے اپنے بہت قریب حرکت کا  
 ل ہوا۔ اس نے سرگھما کر دیکھا۔ راحیلہ جھکی جھکی بھاگتے ہوئے زخمی عرب کی طرف

”بین لڑ رہا ہے اور یہ یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ جھڑپ کس سے ہوئی ہے  
 آپ بہر حال اپنا سر جھکائے رکھیں۔“  
 ”تم مجھے تحفظ کی تعلیم دینے کی کوشش نہ کرو۔“ جینا نے اس عالم میں بھی اڑ  
 ڈبٹ دیا۔ ”اور ہاں..... راحیلہ کہاں ہے؟“  
 ”یہاں ہے..... میرے ساتھ۔“  
 ”اس کا خیال رکھنا..... جینا نے پکارا۔ ”ڈاکٹر لیوی؟“  
 ”میں یہاں ہوں مس میکلم۔“

”ہمارے آدمی صورت حال سے نمٹ سکتے ہیں؟“

”جی ہاں۔ مجھے پورا یقین ہے ان پر۔“

”ٹھیک ہے۔ شکریہ۔ اور ہاں، تم بھی سر جھکائے رکھنا۔“

یوسف نے سوچا، بڑی بی کو صحیح معنوں میں اندازہ ہی نہیں کہ موت کتنی قریب  
 کھڑی ہے۔ وہ تو اب بھی طویل ترین زندگی کے خواب دیکھ رہی ہوگی۔  
 اوپر کی سمت سے اچانک ایک چیخ سنائی دی۔ چھوٹے چھوٹے پتھروں کی بارش ی  
 ہوئی، پھر ایک ہیولا گرتا دکھائی دیا۔ اس کے سر پر کوئی سفید چیز تھی۔

یوسف نے دل ہی دل میں خود کو اپنی حماقت پر کوسا۔ اسے کم از کم اپنی اور راحیلہ  
 کی حفاظت کے لئے ایک پستول تو رکھنا ہی چاہئے تھا۔ سوچنے کی بات تھی۔ دونوں طرف  
 سے تو وہ لوگ گھرے ہوئے تھے ہی لیکن حملہ آور تعداد میں خاصے تھے۔ وہ دونوں  
 پہلوؤں سے گھاٹی میں اتر کر انہیں زیر کر سکتے تھے۔ اس نے جلدی سے ایک ہاتھ میں  
 ایک بھاری پتھر اٹھایا اور دوسرا جیب میں ڈال کر سفید رومال نکال لیا۔ بچت کا ایک امکان  
 ہتھیار ڈال کر صلح کا جھنڈا لہرانے میں بھی تھا۔

لیکن اس کا خدشہ پورا نہیں ہوا۔ گرنے والا تھا تھا۔ وہ ننگے پاؤں تھا۔ گہرے  
 رنگ کی بنیان اور بدوضع پینٹ پہنے تھا۔ اس کے سر پر سفید رومال بندھا تھا۔ وہ گھاٹی کی  
 دیوار سے لڑھکتا ہوا نیچے آیا۔ گھاٹی سے بیس گز اوپر شاہ بلوط کے ایک درخت نے اسے  
 روک لیا۔

چند منٹ خاموشی رہی، پھر وہ نیچے آگرا۔ وہ ایک نو عمر عرب تھا۔ ہاتھوں سے پیٹ  
 دبائے، زمین پر چپ پڑا وہ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کراہ رہا تھا۔ اس کی کراہیں بے حد  
 دلدوز تھیں۔ وہ یقینی طور پر بڑی اذیت میں تھا۔

لیکن لڑکے کی آنکھیں، جن میں اذیت چل رہی تھی، جینا سے نہ چھپ سکیں۔  
 کا چہرہ جینا کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ اذیت نے اس کے چہرے کے خوبصورت  
 ن کو مسخ کر دیا تھا۔ اس کا جسم رہ رہ کر جھٹکے لے رہا تھا۔  
 یوسف نے سخت لمبے میں راحیلہ سے کہا۔ ”اس کی طرف مت دیکھو۔ یہ زیادہ دیر  
 نہیں رہے گا۔“

جینا بولی۔ ”انتظار کس بات کا ہے۔ فرسٹ ایڈ کا سامان لاؤ نا۔“  
 ”کچھ نہیں ہو سکتا۔“ ڈاکٹر لیوی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اس کے بچنے  
 کی امید نہیں۔“

ڈاکٹر لیوی کے الفاظ جینا کو کوڑے کی طرح لگے۔ وہ تھرا کر رہ گئی۔ اس نے جھٹکے  
 سراٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں دیوانگی سی چمک رہی تھی، وہ اس وقت خود موت کا  
 روپ نظر آ رہی تھی۔ ”کیا..... کیا کہا تم نے؟ یہ نہیں بچے گا؟“ وہ دیوانہ وار

”خاموش رہنے۔ یہ مر رہا ہے۔“ ڈاکٹر لیوی نے نرم لمبے میں کہا۔  
 لیکن جینا تو جیسے ہوش و حواس میں نہیں تھی۔ ”نہیں..... نہیں..... میں یہ  
 ت نہیں کروں گی..... ہر گز نہیں۔“ وہ چلائی ”میں یہاں موت کی جستجو میں نہیں  
 ہوں، اسے روکو..... اسے بچاؤ۔ سن رہے ہو؟“

اس کی دیوانگی نے فضا کو ڈراؤنا کر دیا تھا۔ راحیلہ بے ساختہ یوسف کے قریب ہو  
 یوسف نے اس کے لرزتے جسم کو سہارا دیا۔

ڈاکٹر لیوی اٹھا اور اس نے جینا کا ہاتھ تھام لیا۔ ”ڈرا دیکھیں تو کیا ہو رہا ہے۔“  
 نے نرم لمبے میں کہا۔ ”خوفزدہ نہ ہوں..... دیکھیں۔“

زخمی لڑکے نے رونا اور کراہتا موقوف کر دیا تھا۔ اس کی آنکھیں غیر معمولی طور پر  
 رہی تھیں۔ اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ وہ کچھ کہہ رہا تھا۔  
 ”یہ..... یہ کیا کہہ رہا ہے؟“ جینا نے پوچھا۔

”کلمہ پڑھ رہا ہے۔ خدا کو یاد کر رہا ہے۔ اپنی روح کو پاک کر رہا ہے۔ خدا کی  
 بت اور اس کے آخری پیغمبر کی نبوت کی گواہی دے رہا ہے۔“

جینا سحرزدہ سی مرتے ہوئے لڑکے کو دیکھتی رہی، جس کے چہرے پر دنیا جہاں کا  
 نظر آ رہا تھا۔ اذیت کے آثار مٹ گئے تھے۔ خوبصورت نقوش پھر اجاگر ہو گئے

بڑھ رہی تھی۔ اس نے دھاڑ کر کہا۔ ”راحیلہ..... واپس آ جاؤ.....“  
 وقوف..... یہ کوئی مذاق نہیں، جنگ ہو رہی ہے۔ تم فائرنگ کی زد میں ہو۔“ پھر  
 رکاوٹیں پھلانگتا ہوا اس کی طرف لپکا۔ گولیاں سر کے اوپر سے، دائیں بائیں سے سننا  
 گزر رہی تھیں۔ یہ صرف خوش قسمتی ہی تھی کہ وہ اور راحیلہ ابھی تک محفوظ تھے یا  
 آگے کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ یوسف کو راحیلہ کی حماقت پر غصہ آ رہا تھا  
 ہر پل اسے لگ رہا تھا کہ راحیلہ اب گرے گی اور اس کے کپڑوں میں کیسی چھوٹا سا  
 دھبا پھیلا نظر آئے گا۔ ”نہیں راحیلہ، نہیں۔“ وہ پکارتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ بالآخر  
 راحیلہ تک پہنچ گیا۔ اس نے راحیلہ کی کلائی مضبوطی سے تھام لی۔ اس نے اسے تھپتھپ  
 کوشش کی لیکن راحیلہ نے اپنا دوسرا ہاتھ ایک درخت کے تنے سے لپیٹ دیا۔ ”نہ  
 جو..... میں یہ برداشت نہیں کر سکتی۔“ وہ چلا رہی تھی..... ”میں اسے لے لے  
 نہیں جاؤں گی۔ اسے ساتھ لے چلنے میں میری مدد کرو۔“

یہ بڑی بات تھی کہ اس عالم میں بھی یوسف کا ذہن کام کر رہا تھا۔ اس نے حد  
 لگا لیا کہ اب فرق کچھ بھی نہیں پڑے گا۔ زخمی عرب قریب ہی پڑا تھا۔ وہ اس تک  
 چکے تھے۔ اب وہ صرف راحیلہ کو ساتھ لے کر جاتا یا اس زخمی لڑکے کو بھی ساتھ لے  
 دونوں صورتوں میں زندہ واپسی کے امکانات ایک جیسے تھے۔ سو وہ آگے بڑھا اور جھک  
 زخمی لڑکے کو کندھے پر اٹھایا۔ ”اب واپس جاتے ہوئے تم میری پیٹھ سے لگ کر چلاؤ۔  
 وہ راحیلہ پر غریبا۔ اس نے سوچا، اس طرح وہ کم از کم ایک سو ست سے محفوظ رہے گی۔  
 وہ واپس آ رہے تھے۔ راستے میں اس نے زخمی لڑکے کے جسم میں تھر تھراہٹ  
 محسوس کی اور لڑکے کا پاؤں مڑ سا گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ لڑکے کو ایک اور گولی لگی ہے۔  
 اس کا مطلب یہ تھا کہ راحیلہ بال بال بچی ہو گی۔

وہ دوبارہ اپنے محفوظ مورچے میں پہنچے تو وہاں جینا میکم اور ڈاکٹر لیوی بھی موجود  
 تھے۔ یوسف نے بڑی احتیاط سے لڑکے کو زمین پر لٹا دیا۔ اچانک اسے احساس ہوا  
 فائرنگ سٹ پڑ گئی ہے۔ اب اکا دکا فائر اور برسات کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

ڈاکٹر لیوی، زخمی عرب پر جھک گیا۔ اس نے اس کی فیض کے ثمن کھولے۔  
 کرتے ہوئے وہ زخمی اور جینا کے درمیان آ گیا تھا۔ یہ اس نے دانستہ طور پر کیا تھا۔ زخم  
 کے پیٹ کا زخم بہت خراب حالت میں تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ جینا اسے دیکھے۔ دوسرے  
 کوئی عرب لڑکے کے گھٹنے پر لگی تھی۔ یہ تازہ زخم تھا۔

نہ

”دیکھا آپ نے۔“ ڈاکٹر لیوی نے کہا۔ ”موت مہربان اور سکون بخش بھی ہے..... کسی بہت اچھے دوست کی طرح۔“

جینا نے ہاتھ ڈاکٹر لیوی کی گرفت سے چھڑایا اور اپنی آنکھوں پر رکھ لیا۔ وہ اسی طرف پیٹھ کر کے ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔ اگر وہ رو رہی تھی تو بے آواز رو رہی تھی، جانے بغیر کسی کو معلوم نہیں ہو سکتا تھا۔

”بے چارہ بچہ.....“ راحیلہ بڑبڑائی۔

”یہ اب خدا کی امان میں ہے۔“ یوسف نے کہا اور اس کے کندھے سے اپنا ہٹا لیا۔

عقب سے بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ انہوں نے پلٹ کر دیکھا  
 بین آئزک اور اس کے ساتھی تھے۔ اسی لمحے سامنے کی طرف سے ایڈاپوری اور ا  
 گروپ نمودار ہوا۔ ”معاہلہ منٹ گیا؟“ یوسف نے پوچھا۔ ”تم نے انہیں پسپا کر دیا؟“  
 ”وقتی طور پر۔“ بین آئزک نے جواب دیا۔ ”فی الوقت وہ پسپا ہو گئے ہیں  
 ہمیں یہ نہیں معلوم کہ وہ کس چکر میں ہیں۔ مغالے کو پوری طرح ختم نہ سمجھو۔“  
 نے کہا لہذا بڑی بے پروائی سے مردہ عرب کی طرف دیکھا۔ ”ہمارے بھی دو ساتھی  
 گئے ہیں۔“

ان لوگوں پر عجب ساسکوت طاری ہو گیا۔ زندگی کی تلاش میں نکلنے والوں نے ہی قدم پر موت کو تین زندگیوں کی جھینٹ دے دی تھی۔

○—○—○

جنگ ختم ہو جائے تو جاتے جاتے ایک عجیب سا شفا بخش سکون چھوڑ جاتی ہے۔  
 وقتی طور پر رکنے والی جنگ، جس میں آدمی بدستور حالت جنگ میں ہوتا ہے، بے  
 اذیت ناک ہوتی ہے۔ اس میں مرگ آسا سہنس ہوتا ہے۔ اعصاب کھینچے ہیں کیونکہ  
 پاؤں ہلانے کا بھی موقع نہیں ہو سکتا۔

دونوں گروپس کے لیڈر شلومو اور ایڈا یوری بے حد فکرمند تھے۔ یہاں تک ایکشن کا خواہش مند لڑاکا بین آئزک بھی پریشان دکھائی دے رہا تھا۔

ایڈ نے کہا۔ ”ہم نے انہیں پسپا تو کر دیا لیکن بھاری نقصان نہیں پہنچا سکے ہیں۔“

”کچھ کہا نہیں جاسکتا کہ ان کا اگلا قدم کیا ہو گا؟“ شلومو بولا۔  
 ”وہ ہیں کون؟ اور چاہتے کیا ہیں؟“ یوسف نے پوچھا۔

”توافق ہیں۔“ شلومو نے کہا۔ ”وہ اسلحہ ملنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے رہا ہمارے پاس اسلحہ ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ وہ اپنے شکاروں میں سے کسی اچھوڑنے کے قائل بھی نہیں۔“

”ہیں کون وہ لوگ؟ قومیت کیا ہے ان کی؟“

ایڈاپوری ہنس دیا۔ ”ان کی کوئی قومیت نہیں، کوئی مذہب نہیں۔ ان کے گروہوں نے بھارت کے لوگ اکٹھے ہوتے ہیں۔ اب اس لڑکے ہی کو لو.....“ اس نے طرف اشارہ کیا۔ ”یہ عرب مسلمان ہے۔“

یوسف کو اپنے اعصاب پر ناقابل برداشت بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔ ”اب کیا ہو“ پھر حملہ کریں گے؟“

بن آئزک کے ساتھی پتھر اٹھا اٹھا کر لا رہے تھے اور اس حفاظتی دیوار کو بلند کر  
نے، جو یوسف نے بنائی تھی۔ دیوار کے پیچھے سارے کے لئے انہوں نے دو بڑے  
کے تھے۔ اب وہ اچھا خاصا چھوٹا سا قلعہ بن گیا تھا۔

اپوزیشن سمجھنے کے بعد جنگ کا نقشہ ترتیب دے رہا ہو۔  
 کسی جنرل کی طرح، جو اپنی اور

ایڈیٹوری نے یوسف کے سوال کا جواب دیا۔ ”یہ عین ممکن ہے۔“

”اسی طرف سے؟ اسی طرح؟“ یوسف نے پوچھا۔

مریکی نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں۔ اگر پہلی بار کوئی طریقہ کار گر ثابت نہ ہو تو وہ راز میں کوشش کرتے ہیں۔ ہاں..... اگر ہم انہیں زیادہ جانی نقصان پہنچا دیتے رہے ہو کہ ہمارا اچھا چھوڑ دیتے۔“

سف کے حلق سے ایک بے ساختہ چیخ نکلی۔ ”راحیلہ ہوشیار۔“ لیکن راحیلہ  
تھی کہ وہ اس تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ تاہم اس نے جینا میکلم کو دھکیل کر نیچے  
خود بھی اس پر گر گیا۔ اب کم از کم جینا بالکل محفوظ تھی۔

ی لمے گھاٹی میں خوفناک دھماکا گونجا۔ فضا سیاہ مٹی کے بادلوں، دھوئیں اور گے اڑتے ہوئے ٹکڑوں سے بھر گئی۔ دھماکا اس جگہ سے تیس گز پیچھے ہوا تھا، رگ موجود تھی۔

ان افسوس! کسی بھی لمحے ہم سب ختم ہو جائیں گے اور میں اسے کبھی نہیں بتا سکوں گا۔ میں نے اس لمحے میں کیا محسوس کیا ہے۔

جینا ایک بڑے گول پتھر سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ کا چہرہ سمجھ میں نہیں آ رہا ہو کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اس دوسرے فائر نے ڈاکٹر لیوی کو مار دیا تھا۔ وہ سوتے ہوئے چہرے کے ساتھ زخمی لڑکے کے گھٹنے پر دوا لگا کر پٹی باندھ رہا۔ دوسرے کی گردن سے بھی اس نے ٹکڑا نکال کر ڈریسنگ کر دی تھی۔

اسی لمحے تیسرا گولہ پہلے دونوں گولوں کے درمیان کسی مقام پر گر کر پھٹا۔ کسی رف اتنی رہ گئی کہ وہ ان کے مورچے سے خاصا بائیں جانب پھٹا تھا ورنہ اس کمائی کا تمام وہیں ہو جاتا۔ موت دے قدموں قریب تر آتی جا رہی تھی۔

”بہت خراب صورت حال ہے، ہے نا؟“ ڈاکٹر لیوی نے کہا۔

یوسف نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”بدترین کہنے۔“ اس نے کہا۔ وہ سوچ رہا تھا اب دو کو ہلانے سے کیا حاصل۔ ”اب ہمارے پاس زندگی، تین چار اور زیادہ سے زیادہ پانچ نٹ کی ممان ہے۔“

جینا میکم کی آنکھوں میں جیسے خلا اتر آئے تھے۔ ”میں مرنا نہیں چاہتی۔ میری اری دولت.....“

اچانک بین آنزک حفاظتی دیوار کے پاس نمودار ہوا۔ وہ یوسف کی طرف چلا آیا۔ ان کے ہاتھ میں اسٹین گن تھی اور پیلٹ میں لگے مکس پر چھ بم جھول رہے تھے۔ تیس ان کی پوزیشن کا کچھ اندازہ ہے؟“ اس نے پوچھا۔

یوسف چند لمحے یاد تازہ کرتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔ ”وہ جو پہاڑی کی چوٹی پر V کا نشان ہے، اس کے بائیں جانب صوبہ کے دو درخت ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ وہیں ہیں۔“

بین آنزک نے سر کو تقیبی جنبش دی۔ ”شکریہ۔ میرا اندازہ بھی یہی تھا۔“

”کیا ارادہ ہے تمہارا؟“

”مارٹر کو تباہ کرنا ضروری ہے۔“

”تم مارے جاؤ گے۔“

”ممکن ہے لیکن کم از کم کچھ کرتے ہوئے مارا جاؤں گا۔ ورنہ مارٹر کی موجودگی میں فیلوں بھی مارا جاتا ہے۔“

دھماکے کے ساتھ ہی دو انسانی چیخیں بھی بلند ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک کے بل گرا تھا۔ دوسرے کے ہاتھ سے رائفل چھوٹ گئی تھی اور اس نے اپنی گردن دبوچ لیا تھا۔ اس کے چہرے پر ایسا تاثر تھا جیسے اسے کچھ نظر نہ آ رہا ہو۔

”مارٹر۔“ یوسف نے چیخ کر کہا۔ ”ان کے پاس مارٹر ہے۔“ عین وقت پر اس کم رفتار کے مارٹر شیل کو گھائی کی طرف گرتے دیکھ لیا تھا اور تیزی سے حرکت میں آتا تھا۔ شیل کے زمین پر گر کر پھٹنے سے صرف ایک لمحہ پہلے۔ اور اب وہ اتنا خوفزدہ کہ ذہن میں موت کے سوا کوئی خیال نہ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ موت اب ان سب محض چند فٹ کے فاصلے پر ہے۔ رائفلوں اور اسٹین گنوں نے پھر گولیاں برسائی شروع دی تھیں۔ اس بار اوپر سے..... گھائی کے دونوں پہلوؤں سے فائرنگ ہو رہی تھی اتراق مارٹر بھی استعمال کر رہے تھے۔ وہ بلندی پر تھے، لہذا بچت کا کوئی امکان نہیں تھا۔ ایوری اور شلو مونے چیخ کر کہا۔ ”کور“ دونوں نے اپنے اپنے آدمیوں کو فائرنگ سمت میں پھیلا دیا تھا۔

یوسف نے سر اٹھا کر راحیلہ کی طرف دیکھا۔ وہ حفاظتی دیوار کے اس طرف کھڑی تھی۔ دونوں زخمی لڑکے بھی وہیں موجود تھے۔ دونوں کو پتھر کے اڑتے ہوئے ٹکڑوں۔ زخمی کیا تھا۔ ایک کا گھٹنا ہدف بنا تھا اور دوسرے کی گردن۔

چیخ کر ہدایات دینے کا کوئی فائدہ نہیں تھا اور اٹھ کر جانا اور راحیلہ کو لانے کی کوشش کرنا بھی بے سود تھا۔ کیونکہ موت صرف چند لمحوں کی مسافت پر تھی۔ گھائی۔ دوسری طرف مارٹر کا ایک اور گولہ پھٹا۔ اس بار گولہ کافی آگے پھٹا تھا۔ اس سے اس سوا کوئی نقصان نہیں پہنچا کہ گھرے ہوئے لوگوں کے اعصاب لرز کر رہ گئے۔ ایک گولہ پیچھے اور ایک آگے! یہ طے تھا کہ اب وہ مارٹر کا رخ درست کریں گے اور اگلا گولہ خطرناک حد تک قریب ہو گا اور چوتھے گولے کے بعد صفائی ہو چکی ہو گی۔

یوسف اٹھا اور راحیلہ کی طرف لپکا، جو دونوں زخمی لڑکوں کو سہارا دے رہی تھی وہ اور راحیلہ انہیں مورچے میں لے آئے۔ راحیلہ کا جسم سوکھے پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ پہلی بار اسے جنگ کی ہولناکی اور سنگینی کا احساس ہوا تھا۔ پھر بھی اس نے خود کو سنبھالا ہوا تھا اور زخمی لڑکوں کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔

یوسف دل میں سوچ رہا تھا..... کون کہہ سکتا تھا کہ عیش و آسائش کی دلدل میں عدم تحفظ کے احساس سے خوفزدہ یہ حسین اور نازک لڑکی اتنی جرات مند بھی ہو سکتی؟



ڈاکٹر لیوی نے جینا سے کہا۔ ”ذرا مجھے اپنی بائبل دیجئے۔“

بین آنزک نے شلومو کو پکارا۔ ”تمہیں مجھے کور دینا ہو گا۔“

”بے وقوفی مت کرو بین!“ شلومو نے چیخ کر کہا۔ ”یہ تو خود کشی ہے، ہم بھی تمہارے ساتھ چلیں گے۔“

”میں جانتا ہوں کہ کیا کر رہا ہوں اور کیا کرنا ہے۔ میں آواز دوں تو اوپر کی طرف بڑھتا۔“ یہ کہہ کر بین آنزک تیزی سے حرکت میں آیا۔ وہ سینے کے بل رینگتا ہوا پہاڑی کے پہلو کی جانب بڑھنے لگا۔

راحیلہ نے یوسف سے پوچھا۔ ”جو..... یہ بین آنزک کہاں جا رہا ہے؟“

یوسف نے جواب دیا۔ ”یہ اس مارٹر کو تباہ کرنے جا رہا ہے۔“

”یہ تو بڑی خطرناک بات ہے۔ وہ مارا جائے گا۔“

”ہاں، زیادہ امکان اسی بات کا ہے۔“

ڈاکٹر لیوی بائبل پڑھ کر سنا رہا تھا۔ یوسف نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ بڑے ڈاکٹر لیوی کے برابر جینا میکم بڑے گول پتھر سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ ڈاکٹر لیوی جینا کی چھوٹی بائبل کھولے اسے پڑھ رہا تھا۔

اوپر سے ہونے والی فائرنگ کی آواز ڈاکٹر لیوی کی آواز پر حاوی آگئی۔ قزاق، بین آنزک پر فائرنگ کر رہے تھے۔ بین اتنی مخالف سمت میں بڑھ رہا تھا کہ وہ اس کا مقصد نہیں سمجھ سکے تھے۔ ان کی دانست میں وہ فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا..... اور یہ ان کے لئے خطرناک تھا۔ اس کے ساتھ ہی نیچے سے بین آنزک کے ساتھیوں نے زبردست فائرنگ شروع کر دی تاکہ بین کو کور فراہم کر سکیں۔

بین آنزک چپتے کی سی تیز رفتاری سے بڑھ رہا تھا۔ پہاڑی کے دامن میں پہنچ کر وہ خاصا محفوظ ہو گیا کیونکہ قزاقوں کے لئے اسے دیکھنا ممکن نہیں رہا تھا۔ اب اس نے دائیں جانب بڑھنا شروع کیا۔ وی کی شکل کے نشان کے عین نیچے پہنچ کر وہ رکا اور اس نے سر اٹھا کر دیکھا کہ وہ درست مقام تک آپہنچا ہے یا نہیں۔ پھر اس نے پہاڑی پر چڑھنا شروع کر دیا۔ وہ کوئی آسان چڑھائی نہیں تھی، پھر بھی وہ بہت مہارت سے چڑھ رہا تھا اور اس کی کوشش تھی کہ تیز رفتاری دکھائے۔ فائرنگ سے اب وہ بہر حال محفوظ تھا۔

”اس نے میری روح کو پاکیزگی عطا کی ہے۔“ ڈاکٹر لیوی بائبل سے الوبی گیت پڑھ کر سنا رہا تھا۔ ”اس نے مجھے سیدھا راستہ دکھایا۔ ہدایت دی کہ میں اس کے نام کا چمکا

روں..... اس کے نام کی سرہندی کے لئے کام کروں.....“

ایک گولی ان کے عقب میں بڑے گول پتھر سے ٹکرائی۔ پتھر کے ٹکڑے اور ذرے پڑے۔ اسی لمحے اس کے ساتھ بیٹھی راحیلہ چلائی۔ بین آنزک چوٹی سے آدھے فاصلے پر لیکن اب وہ لڑھکتا ہوا نظر آ رہا تھا۔

یوسف بے ساختہ چیخا۔ ”میرے خدا..... اسے شاید گولی لگی ہے۔“

راحیلہ تیزی سے اٹھی۔ اگر یوسف نے اس کی کلائی نہ تھام لی ہوتی تو وہ مورچے کی نکل ہی گئی تھی..... وہ چیخ رہی تھی۔ ”بین..... بین آنزک!“ یوسف کو دکھ نے لگا..... بین آنزک کا زیاں راحیلہ کا ہی نہیں، اسے اپنا نقصان بھی محسوس ہو رہا

جینا نے تیز لہجے میں کہا ”راحیلہ..... خاموش رہو اور بائبل سنو۔“ وہ پوری ح اپنے کنٹرول میں تھی۔ اس نے بہت تیزی سے خود کو سنبھالا تھا۔

ڈاکٹر لیوی پڑھ رہا تھا ”اگرچہ میں موت کی دادی میں سفر کر رہا ہوں لیکن میں برائی..... شیطنیت سے نہیں ڈروں گا کہ وہ میرے ساتھ ہے۔ اس کی رحمتیں اور شتے میرے پاس ہیں.....“

بین آنزک نیچے گرنے کے بعد چند لمحے ساکت رہا پھر اس نے دوبارہ اوپر چڑھنا شروع کر دیا۔ اس بار اس کی رفتار اتنی زیادہ نہیں تھی اور وہ بہت محتاط دکھائی دے رہا۔ شاید وہ سمجھ گیا تھا کہ تیز رفتاری میں وقت ضائع ہونے کا امکان بہت زیادہ ہے۔

یوسف نے راحیلہ کو بازوؤں سے تھام کر جھنجھوڑ ڈالا۔ ”خود کو سنبھالو۔ بین آنزک بت سے ہے۔ وہ محض پھسلا تھا۔ وہ دیکھو..... وہ پھر چڑھ رہا ہے۔“

راحیلہ نے جو سر جھکائے بیٹھی تھی، سر اٹھا کر پہاڑی کی سمت دیکھا اور بے جان ازمیں مسکرا دی۔

دوسری طرف شلومو اور اس کے ساتھی بدستور زبردست فائرنگ کر رہے تھے۔ ان جوانی فائرنگ میں اتنے مصروف تھے کہ شاید انہیں بین آنزک یاد بھی نہیں رہا تھا۔ مارٹر سے ایک اور گولہ فائر کیا گیا۔ خوش قسمتی سے وہ بھی ان لوگوں سے کافی فاصلے پر اور کوئی نقصان نہ پہنچا سکا۔ اس بار یوسف اس نتیجے پر پہنچا کہ مارٹر اور اس کا ویشن قزاقوں کے ہاتھ کیس سے لگ گیا ہو گا لیکن وہ اسے ٹھیک طرح سے چلانے پر نہیں تھے۔ ورنہ اب تک تو ان سب کا کام تمام ہو چکا ہوتا۔

یہ راحیلہ وقت پڑنے پر..... بحران کے دوران اس سے بہت مختلف ثابت ہوئی  
نی، جیسی نظر آتی تھی۔ مشکل وقت میں اسے اپنا نہیں..... دوسروں کا خیال رہا تھا۔  
بین آنزک اپنے انکل کے پاس گیا اور ان کے گلے میں بانیں ڈال دیں، نتھانیل  
نے بڑی محبت سے انگلیوں سے اس کے رخسار کو تھپتھپایا۔ جیسے اس کے بخیر وعافیت ہونے  
یقین چاہتا ہو۔ ”انکل نتھانیل“ میں نے کیسا کام دکھایا؟“ اس نے فخریہ لہجے میں پوچھا۔  
رجوب کا انتظار کئے بغیر بولا۔ ”اس کی تربیت مجھے ایک برطانوی میجر نے دی تھی۔“

ڈاکٹر لیوی نے نرمی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ بولا تو اس کے لہجے میں  
لہری اداسی تھی۔ ”ہاں بین آنزک! تمہاری کارکردگی شاندار تھی۔ تم ایک بہادر اور  
باع جوان ہو اور میں بے وقوف بھی ہوں اور گناہگار بھی۔ مجھے ہدایت کے مطابق اپنے  
مرک کر اپنی سبزیوں، ترکاریوں کی دیکھ بھال کرنی چاہئے تھی۔ اس لئے کہ میری وجہ  
تین افراد ہلاک ہو گئے۔“

”دو کئے، ایک تو دشمن تھا۔“ بین آنزک نے نرم لہجے میں کہا۔

”نہیں۔ وہ بھی خدا کا بندہ تھا۔ بھٹکا ہوا سسی لیکن تھا اسی کا بندہ۔ میرے ضمیر پر  
نہ بوجھ رہے گا۔ میں.....“

بین آنزک نے تیز نگاہوں سے اپنے انکل کو دیکھا۔ ”انکل“ اسے میں نے شوٹ  
بھا تھا بوجھ تو میرے ضمیر پر ہونا چاہئے۔“

”میں تمہارا گناہ اپنے سر لیتا ہوں۔“

بین آنزک کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اسے اپنے سینے میں ایک میب خلا کا  
سہا ہونے لگا۔ اس کی آنکھوں کی چمک معدوم ہو گئی اور انداز بھی فاتحانہ نہ رہا۔ وہ  
نہ قاصطے پر ایک چٹان پر جا بیٹھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔

یوسف کو ڈاکٹر لیوی کا فلسفہ بہت مضحکہ خیز اور احمقانہ لگا۔ جنگ ان پر تھوپی گئی  
نہ اور اگر وہ لڑکا نہ مارا جاتا تو خود ان میں سے کوئی نہ کوئی ختم ہو جاتا۔ وہ بین آنزک کی  
رف بڑھا۔ ”کیوں افسردہ بیٹھے ہو؟ سر اٹھاؤ، تم نے بہت شجاعت کا مظاہرہ کیا ہے۔“ اس  
نے کہا ”اور تم الٹا مجرم بن کر بیٹھ گئے۔“

بین آنزک نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ”جو..... مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔  
نہ نتھانیل نے غلط نہیں کہا.....“

یوسف وہاں سے ہٹ آیا۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ دیوار سے سر ٹکرانے سے

کچھ دیر بعد بین آنزک پہاڑی کی چوٹی پر دی شکل کے شکاف تک پہنچ گیا تھا۔  
وہاں پہنچ کر وہ رکا اور سینے کی بیٹ پر ہک سے اٹکا ہوا ایک ہم نکالا، دانتوں میں دبا کر اس  
کی پن کھینچی اور اسے اوپر کی طرف اچھال دیا۔ دھماکے کے ساتھ ہی وہ تیزی سے اوپر کی  
طرف لپکا بھی۔ گھاٹی میں، مورچے میں چھپے ہوئے اپنی پارٹی کے لوگوں کی طرف اس کی  
پشت تھی۔ اس نے یکے بعد دیگرے پانچ مزید ہم ذرا ذرا سے فاصلے پر اچھالے پھر وہ  
گھنٹوں کے بل بیٹھ کر اسٹین گن سے فائرنگ کرتا رہا۔ کچھ دیر بعد وہ پلٹا اور اس نے اپنے  
ساتھیوں کو ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ایوری، شلومو اور دوسرے لڑکے پہاڑی کی سمت لپکے۔

اوپر سے ہونے والی فائرنگ رک گئی۔ شاید کھیل ختم ہو چکا تھا۔ وہ سنا مارنے کے  
گولوں کے دھماکوں سے زیادہ خوفناک معلوم ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر لیوی نے بائبل سے تیسویں  
الوہی گیت کا آخری بند سنایا۔ ”خدا کا رحم اور مہربانی تمام عمر میرے ساتھ رہے گی اور میں  
خدا کے گھر میں تابعدار خوش و خرم رہوں گا۔“ پھر اس نے بائبل بند کر دی۔ اب بین  
آنزک اوپر سے بھاگتا ہوا گھاٹی میں اتر رہا تھا۔ اس کا انداز فاتحانہ تھا۔

نیچے آکر اس نے راحیلہ کا آنسوؤں میں بھیگا ہوا چہرہ دیکھا تو گھبرا گیا۔  
”راحیلہ..... تم خیریت سے تو ہو نا؟ سب ٹھیک ٹھاک ہیں نا؟“ پھر اس نے خود ہی دیکھ  
لیا کہ سب خیریت سے ہیں۔ اس نے آگے بڑھ کر راحیلہ کا کندھا تھپتھپایا۔ راحیلہ  
سسکیاں لے کر رونے لگی۔ یہ طویل اعصابی کشیدگی کے بعد پرسکون ہونے کا رد عمل تھا۔  
اس کے ہاتھوں کی سفید پوروں کو دیکھ کر یوسف کو احساس ہوا کہ وہ اسے کتنی مضبوطی  
سے پکڑے ہوئے تھی۔

”بس چپ ہو جاؤ۔ اب ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔“ بین آنزک نے اسے دلاسا دیا  
لیکن خود اس کی آنکھوں میں جنگ کی آگ اب بھی لہرا رہی تھی۔ وہ اپنے ساتھیوں کی  
تلاش میں پہاڑی کی طرف دیکھ رہا تھا، جیسے خدشہ ہو کہ کوئی اور کم نہ ہو گیا ہو۔

یوسف نے جیب سے پکٹ نکالا اور سگریٹ سلگائی۔ وہ سوچ رہا تھا۔ کیسا افسانوی  
اختتام ہو رہا ہے اس کہانی کا۔ ہیرو کو ہیروئن مل گئی۔ اور کیوں نہ ملتی، ایسے بہادرانہ  
کارنامے کے بعد کون ایسی عورت ہو گی، جو اس کی محبت سے بچ سکے گی، اور شاید.....  
ہاں راحیلہ تو شاید ابتدا ہی سے بین آنزک کی اسیر محبت ہے۔ جس وقت وہ بین آنزک  
کے پھسل کر گرنے پر روئی، تھی، اس نے اس کی سات پردوں میں چھپی ہوئی محبت کو عمال  
کر دیا تھا۔ بہر حال یہ تو ہونا تھا۔ ایسا تو ہوتا ہے۔ سائیڈ ہیرو بھی کبھی زیادہ غم نہیں کرتے۔

راحیلہ نے پر خیال انداز میں سر ہلایا۔ ”لگتا ہے پھوپھی میکم ان کے علم میں لائے  
برقم سے ملنا چاہتی ہیں۔“

یوسف کے اندر احساس فح اور تجسس جیسے گھل مل گئے۔ ڈاکٹر لیوی اب تک اپنی  
ام ترکوشش کے باوجود بستی کے بڑوں کو شریحات دینے پر آمادہ نہیں کر سکا تھا۔ ان کا کہنا  
اکہ جو ہر حیات خود بستی کے بھی صرف منتخب لوگوں کو دیا جاتا ہے۔

”میں سوچ رہا تھا کہ مس میکم کا محل آخر کب جواب دے گا۔“ اس نے کہا۔  
راحیلہ کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس نے کہا ”معاملات ٹھیک نہیں چل رہے

۔“

”کیوں..... کیا گڑ بڑ ہے؟“

”وہ بہت موڈی اور اعصاب زدہ سی ہو رہی ہیں۔“ راحیلہ نے بتایا۔ ”باہر نہیں  
لٹیں، ہر وقت اپنے غیر آرام دہ کمرے میں بیٹھی باہر دیکھتی رہتی ہیں، چہرے پر ویسا ہی  
اثر ہوتا ہے، جیسا کراچی میں اس وقت ہوتا تھا جب وہ کسی کی فیکٹری، کوئی مل یا کمپنی  
زید نے پر اڑ جاتی تھیں۔ مجھے ان کے ہاتھوں سے ڈر لگتا ہے۔ وہ انہیں ایک دوسرے  
میں پھنسانے لیتی ہیں اور وہ اتنی سختی سے پھنسن جاتے ہیں کہ کبھی کبھی تو وہ کوشش کے باوجود  
نہیں دیر تک الگ نہیں کر پاتیں۔“

”پر سکون اعصاب کی عورت تو وہ کبھی بھی نہیں رہیں۔“ یوسف نے تبصرہ کیا۔  
”انہیں کشیدگی ہی راس آتی ہے اس لئے تو وہ اب تک زندہ ہیں۔“  
”مگر ابھی ایک ہفتہ پہلے وہ بہت خوش اور پرسکون تھیں۔ وہ بہت مختلف ہو گئی  
نہیں۔“

یوسف خاموش رہا۔ وہ مختلف جینا ہی تو اسے اچھی نہیں لگی تھی۔ اس جینا کو وہ  
بڈل نہیں کر سکتا تھا لیکن یہ پرانی والی جینا اس کے اختیار میں تھی اور اب جینا کی طرف  
سے اس بلاوے کا مطلب یہ تھا کہ اسے ڈاکٹر لیوی پر مکمل اعتبار نہیں رہا ہے۔ یہ یوسف  
کے لئے خوش آئند بات تھی۔

اس مکان کی طرف جاتے ہوئے جہاں وہ جینا کی ساتھ مقیم تھی، راحیلہ نے کہا۔  
”ان کی مدد کرو جو۔“

اس کے لمبے میں کوئی بات تھی..... کسی جذبے کی حدت کہ یوسف نے چونک  
کر اسے دیکھا اور چند لمحوں تک دیکھتا رہا۔ راحیلہ کی نگاہوں میں ایک تندہ التجا تھی، جس

کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ اسی وقت راحیلہ اس کے پاس چلی آئی۔ ”شکریہ جو۔ تم نے  
میرے لیے اپنی جان خطرے میں ڈالی، مجھے بچایا۔“ اس نے شکر گزاری سے کہا اور  
یوسف کا ہاتھ تھام لیا۔

”میں تمہارے شکریے کا مستحق نہیں۔“ یوسف نے بچھے بچھے لمبے میں کہا۔ ”مجھ  
پر تو اتنا اعتماد بھی نہیں کیا گیا کہ مجھے ایک رات نکل ہی دے دی جاتی۔ میں اس جنگ میں  
شریک ہونا بھی نہیں چاہتا تھا مگر اپنے دفاع کے لئے کچھ تو ہوتا میرے پاس۔ بین آئزک  
نے تمہاری جنگ جیتی ہے۔ اس کا شکریہ ادا کرو۔ وہ نہ ہوتا تو ہم سب ختم ہو جاتے۔ اس  
کے حوصلے کی کوئی حد نہیں۔ وہ بہت جرات مند ہے۔“

راحیلہ چند لمبے اسے بغور دیکھتی رہی۔ پھر تہہ لمبے میں بولی۔ ”لیکن تمہارے پاس  
جتنی جرات، جتنا حوصلہ ہے وہ میرے لئے بہت کافی ہے۔“ یہ کہہ کر وہ چلی اور واپس چل  
دی۔

یوسف اسے جاتے دیکھتا رہا۔ اس وقت اس کے ذہن میں راحیلہ کے سوا کوئی  
خیال نہیں تھا۔ کدال کے زمین سے ٹکرانے کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ شلومو اور اس  
کے ساتھی اپنے دونوں ساتھیوں کی لاشیں اٹھالائے تھے اور اب ان کو اور عرب لڑکے کو  
دفن کر رہے تھے۔ جینا میکم، زخمی لڑکے کے کھنسنے پر دو لگا رہی تھی۔ اس نے خود کو پوری  
طرح سنبھال لیا تھا۔ اس کے انداز میں بڑی نرمی، بڑی مہربانی تھی۔

یوسف کو وہ وقت یاد آیا، جب وہ ڈاکٹر لیوی سے بائبل کے الوہی گیت سن رہی  
تھی۔ وہ انہماک..... اور اس نے کیسے راحیلہ کو چپ کرایا تھا۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ  
جینا میں بہت بڑی تبدیلی رونما ہوئی ہے۔ اس کے انداز سے نہیں لگتا کہ وہ اب مرنے  
سے خوفزدہ ہے۔ وہ خود کو بہت اکیلا اور بے حد تھکا ماندہ محسوس کرنے لگا۔

○-----○-----○

انہیں برگزیدہ لوگوں کے گاؤں، بیت الجبل پہنچے وہ تیسرا دن تھا۔ وہ کوہ ہرمن کے  
مغربی پہلو کی جانب، چوٹی اور وادی کے درمیان ایک تنگ ترین پگڈنڈی کے کنارے واقع  
تھا۔ یوسف کا ٹھکانا گاؤں کے بیرونی کنارے کی طرف تھا۔

راحیلہ، یوسف کے پاس آئی۔ ”مس میکم نے تمہیں بلایا ہے۔“ اس نے کہا ”وہ  
فوری طور پر تم سے ملنا چاہتی ہیں۔ بین آئزک اور ڈاکٹر لیوی کہاں ہیں؟“  
”وہ دونوں یہاں کے پوشیدہ غاروں کی تلاش میں نکلے ہیں۔“

زہن میں یہی مقام تھا؟ ہمیں لانا چاہتے تھے تم مجھے؟ کیا یہی وہ مقام ہے، جو طوفانِ نوح کے دوران ڈوبنے سے رہ گیا تھا اور اسی لئے جو ہر حیات محفوظ رہ گیا تھا؟“ جینا نے پوچھا۔  
”مجھے اس بارے میں ریسرچ کرنا تھی۔“ یوسف نے ہموار لہجے میں جواب دیا۔

”لیکن یہاں ہم ڈاکٹر لیوی کی ذمہ داری پر آئے ہیں۔“

جینا نے اسے ٹولنے والی نگاہوں سے دیکھا۔ ”یہاں بہت بوڑھے لوگ موجود ہیں، جن کی عمریں بہت..... بہت..... بہت زیادہ ہیں۔ تم نے نوٹ کی یہ بات؟“  
”جی ہاں۔“

”اور یہ اس حیات بخش مادے کو کیا کہتے ہیں؟“

”ڈاکٹر لیوی کے بیان کے مطابق اس نام کا ترجمہ ”شجر حیات کا پھل“ کیا جاسکتا ہے۔“

”وہ ہے کیا چیز؟ کہاں اگائی جاتی ہے؟ کیسی ہوتی ہے؟“

”مجھے نہیں معلوم اور میرا خیال ہے، کسی کو بھی معلوم نہیں۔ سوائے اس طویل القامت بزرگ کے، جو سب سے معمر بھی ہے اور اس قبیلے کا سربراہ بھی ہے۔ یا پھر وہ زہین بزرگ، جو وعظ دیتا ہے، وہ جانتا ہو گا۔“

”ڈاکٹر لیوی نے تمہیں اس سلسلے میں کیا بتایا ہے؟“

”ڈاکٹر لیوی نے ہمیں بتایا ہے کہ وہ جو چیز بھی ہے، اس کی پیداواری مقدار بہت کم ہے اور موسم کی وجہ سے یا نامعلوم وجوہات کے تحت اس کی فصل تیار ہونے میں دو سے تین سال تک کا عرصہ لگتا ہے اور جو فصل تیار ہوتی ہے، اس سے صرف ایک آدمی مستفید ہو سکتا ہے۔ بستی کے بڑے مل بیٹھتے ہیں اور فیصلہ کرتے ہیں کہ وہ خوش نصیب کون ہے، جسے طویل عمر جینے کا موقع دیا جائے اور یہ بات کسی پر ظاہر نہیں کی جاتی کہ پھل کسے دیا گیا ہے۔“

جینا نے کہا۔ ”یہی کچھ اس نے مجھے بتایا ہے۔“ پھر وہ تند لہجے میں بولی۔ ”اور مجھے یقین ہے اس پر۔“ وہ آگے بڑھی اور اس نے یوسف کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔  
چند لمحے وہ اسے تھممانہ انداز میں دیکھتی رہی۔ ”میں جانتی ہوں کہ جو ہر حیات اس وقت بھی گاؤں میں موجود ہے۔ اسے میرے لئے حاصل کرو۔“ اس کا لہجہ بھی تھممانہ تھا۔  
یوسف بری طرح چونکا۔ اس فرمائش کی تو اسے توقع بھی نہیں تھی۔ اس نے احتجاج کیا۔ ”یہ آپ ڈاکٹر لیوی سے.....“

نے اسے حیران بھی کیا اور جسے وہ سمجھ بھی نہ سکا۔ ”تم فکر نہ کرو۔ یہ معاملہ مجھ پر چھوڑ دو۔“ اس نے اسے دلاسا دیا۔ ”میرا خیال ہے، وہ سمجھ گئی ہیں کہ انجام کار ان کا یہ غار ہی ان کی خواہش پوری کرنے کا سامان کر سکے گا۔“

راحیلہ نے اداس نظروں سے، جن میں مایوسی بھی کھل مل رہی تھی، اسے پیر میکلم کے کمرے میں جاتے دیکھا۔ وہ افسردہ تھی کہ یوسف اس کی بات بالکل نہیں سمجھ رہا ہے۔ وہ اپنے نزدیک کائنات کا مرکز خود ہی تھا۔ وہ غیر حساس تھا۔ اسے اپنی سخت مزاجی احساس تک نہیں ہوتا تھا۔ وہ اس کی کلیت کے خول کو توڑنے کی ہر ممکن کوشش کر رہی تھی۔ اس نے خود کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ اس معاملے میں یوسف بے بس ہے۔ وہ ہے ہی ایسا لیکن ہمیشہ کی طرح اس بار بھی وہ خود کو سرنگوں محسوس کرتی رہی۔ وہ بے حد ناخوش تھی۔

○-----○-----○

جینا میکلم کھڑکی میں کھڑی گاؤں کے سفید مکانوں کو ایک ٹک دیکھ رہی تھی۔ یوسف کے قدموں کی آہٹ سنتے ہی وہ تیزی سے مڑی۔ اس کے انداز میں بلا کی وحشت تھی۔ ”ڈاکٹر لیوی کہاں ہے؟“ اس نے پوچھا۔  
یوسف نے اسے بتا دیا۔

”وہ میرے سلسلے میں کچھ نہیں کر رہا۔ کیوں؟ آخر کیوں؟ ہمیں یہاں آئے ہوئے تین دن ہو چکے ہیں۔“

”ڈاکٹر لیوی کا کہنا ہے کہ یہاں کے لوگوں کے ساتھ تیز رفتاری مضرت ثابت ہوگی۔“

”ان لوگوں کو معلوم ہے کہ میں کیا چاہتی ہوں؟“

”میرا خیال ہے، وہ جانتے ہیں۔“

”تمہارا کیا خیال ہے، لیوی میرے مقصد کے حصول کے لئے بھرپور کوشش کر رہا ہے؟“

یوسف نے تیزی سے سوچنے کی کوشش کی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ ڈاکٹر لیوی کے لئے جینا کی بے اعتمادی اس حد تک بڑھ گئی ہے۔ وہ اپنے بچوں کو بہت محفوظ طریقے سے کھیلنا چاہتا تھا۔ ”میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔“ اس نے بہت محتاط انداز میں کہا۔ ”ڈاکٹر لیوی نے اس سلسلے میں مجھے بھی اعتماد میں نہیں لیا ہے۔“

”جب تم کراچی میں پہلی بار مجھ سے ملے تھے اور مجھے قائل کیا تھا تو کیا تمہارے

انہیں ایک چھوٹی بے حد سرسبز وادی نظر آئی۔ وہاں زراعت کے آثار نمایاں تھے۔ وہ اس معلق گاؤں کی بلندی پر چڑھتے چلے گئے۔ جا بجا انہیں پراسرار تاریک غار نظر آئے۔ گاؤں کے لوگوں نے ان کا پرtpاک خیر مقدم کیا۔ وہ بہت شیریں گفتار اور مہربان لوگ تھے۔ ایک بہت معمر دراز قد شخص اس قبیلے کا سربراہ تھا۔ اس کا نام بارزی لئی تھا۔ ایک واعظ بزرگ تھا جس کا نام املکے تھا۔

گاؤں کے زیادہ تر لوگ مسلمان تھے۔ کچھ عیسائی اور کچھ یہودی بھی تھے لیکن ان لوگوں کے انداز سے ظاہر تھا کہ ان کے نزدیک اس فرق کی کوئی اہمیت نہیں۔ سب اپنے اپنے انداز میں خدا کی عبادت کرتے تھے اور ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے۔

ایسا لگتا تھا کہ فطرت نے وقت کو اس چٹانی دراڑ کے پار لاکر سرسبز وادی میں قید کر دیا ہے۔ وہاں وہ غار تھے جن کی عمریں نوع انسان کی عمر سے زیادہ تھیں۔ ان غاروں نے پارٹی کے سبھی لوگوں کو مسحور کر لیا تھا۔ خاص طور پر یوسف کو، وہ سوچتا، کون جانے وہ غار کیسے کیسے رازدوں کے امین ہوں گے۔ ان میں کیسے کیسے فنون کی ترویج ہوئی ہوگی۔ کیسے کیسے عقیدوں کے تحت قربانی کے منظر انہوں نے دیکھے ہوں گے۔ یہ بات طے تھی کہ انبیائے کرام کا ہمیشہ غاروں سے گہرا تعلق رہا تھا۔ اور بیت الجبل کے لوگ! وہ عمر سے بے یاز تھے۔ ان کی آنکھیں کچھ اور عمر ظاہر کرتی تھیں اور چہرے کچھ اور کہتے تھے۔ لگتا تھا،

وقت ان پر کم ہی اثر انداز ہوتا ہے۔ پہلی بار یوسف یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ کہیں اس کی دہلیز میں پیش کی گئی تھیوری حقیقی تو نہیں۔ وہ ذہین تھا، تعلیم یافتہ تھا، ضعیف الاعتقاد نہیں تھا لیکن اس میں ایک کمی تھی، اس کے پاس مذہب کی بنیاد نہیں تھی، جس پر مثبت مہوں کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ یہاں آکر اسے عاجزی کا احساس ہونے لگا تھا۔ پہلی بار وہ احساس کمتری میں مبتلا ہوا تھا۔ پارٹی کے تمام لوگ اپنے اپنے مذہب سے پوری طرح وابستہ تھے، اس کے متعلق جانتے تھے۔ ان کا مذہب ان میں جذباتی ابال پیدا کرتا تھا، ان کی سوچوں کو کنٹرول کرتا تھا۔ سوائے اس کے..... یا پھر راحیلہ کے اور اتفاق سے انہوں مسلمان تھے۔ یہی نہیں، دونوں کے درمیان کئی قدریں مشترک تھیں۔ دونوں نیت سے ڈرتے تھے۔ دونوں کا مسئلہ عدم تحفظ تھا، اسی کی وجہ سے عقیدے کے اعتبار سے دونوں چوں چوں کا مرہ بن کر رہ گئے تھے۔ یوسف کا جب جی چاہتا، وہ جوزف بن جاتا بلکہ اب تو وہ مستقل طور پر جوزف ڈیوڈسن بنے رہنے پر مجبور تھا اور اب اسے ایسا لگتا تھا کہ وطن اور مذہب کی موجودگی کے باوجود ایک بے شناخت آدمی ہے، اس کی شخصیت کی

لیکن جینا نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”ڈاکٹر لیوی زمانہ ماقبل تاریخ کے غاروں کی تلاش میں مصروف ہے۔“ اس نے کہا۔ ”میں اس معاملے میں تمہیں اپنا بااختیار ایجنٹ مقرر کر رہی ہوں۔ جاؤ اور ان سے مذاکرات کرو۔ مجھے جو ہر حیات چاہئے..... فوراً..... بغیر کسی تاخیر کے.....“

یوسف نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”میں کوشش کروں گا۔ بہر حال یہ آپ بھی جانتی ہیں کہ یہ کام کتنا مشکل ہے۔ میں تو ان کی زبان بھی نہیں بول سکتا۔ ضروری نہیں کہ انہیں اپنا مدعا سمجھا بھی سکوں۔“

”ایک زبان ایسی بھی ہے جو پوری کائنات میں سمجھی جاتی ہے۔“ جینا نے منہ بنا کر کہا۔ ”اور وہ ہے دولت کی زبان۔ وہ جانتے ہیں کہ مجھے کس چیز کی ضرورت ہے۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ میں یہاں کیوں مقیم ہوں۔ تم صرف اتنا کرو کہ قیمت معلوم کرو اور مطلوبہ چیز خرید لو۔ منہ مانگی قیمت ادا کرو۔ میں تمہیں مکمل اختیار دے رہی ہوں۔“

”جی بہت بہتر۔“ یوسف جانے کے لئے مڑا۔

”ایک بات اور۔ ڈاکٹر لیوی کو اس معاملے کی ہوا بھی نہ لگنے دینا۔ اگر تم کامیاب ہو گئے تو تمہیں اتنا انعام ملے گا، جس کا تم نے کبھی تصور بھی نہیں کیا ہو گا۔“

○-----○-----○

بیت الجبل سفید پتھروں سے بنے ہوئے مکانات پر مشتمل ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ مرد، عورتیں اور بچے..... سب ملا کر آبادی تین سو نفوس سے زیادہ نہیں تھی۔ مردوں میں کئی ایسے تھے جو بہت..... بہت زیادہ معمر لگتے تھے ایسا لگتا تھا کہ اس بستی کا باہر کی دنیا سے کوئی تعلق، کوئی رابطہ نہیں ہے۔ وہاں نہ ٹیلی فون کی سہولت تھی، نہ ٹیلی گراف کی، وہاں کے لوگ خود انھاری کی زندگی گزار رہے تھے اور اس پر نہ صرف قانع بلکہ خوش و خرم دکھائی دیتے تھے۔ گاؤں بے حد صاف ستھرا تھا۔

گاؤں تک پہنچنے کے لئے ان لوگوں کو مسلسل چڑھائی کا سفر کرنا پڑا تھا۔ کوہ ہرمن کے دامن سے پہاڑ کے مغربی رخ وہ برف کی حد تک چڑھتے چلے گئے تھے۔ وہاں انہیں قدرتی کھائی نظر آئی تھی۔ کھائی کی جڑ میں ایک چٹان تھی اور اس چٹان میں ہی ایک تنگ راستہ تھا، بظاہر وہ راستہ محض ایک قدرتی دراڑ نظر آتا تھا۔ ڈاکٹر لیوی انہیں اس دراڑ میں لے گیا تھا۔ دراڑ آگے جا کر نسبتاً چوڑی ہو جاتی تھی۔ وہ درحقیقت ایک تنگ راہداری تھی۔ ٹھوس گریفائٹ کی اس چٹان میں آتش فشانی شکاف تھا۔ دراڑ سے نکلنے ہی

بڑوں کے مکان کی طرف جانے والے راستے پر چلتے ہوئے یوسف ایک چمڑے لے کی ڈیوڑھی کے سامنے سے گزرا۔ کچھ آگے جانے کے بعد اسے کسی چیز نے بری ح چونکایا، جو اس نے وہاں دیکھی تھی اور جیسے اس کے دماغ پر نقش ہو گئی تھی۔ وہ اہل دیا۔

دکان کا رخ گلی کی طرف تھا۔ وہ چھوٹی سی دکان تھی۔ چمڑے والا دکان کے بچوں بیٹا بکری کی کھال کے اندر دنی حصے پر رہ جانے والے گوشت کے ریزوں کو صاف کر رہا اس کے ہاتھ پاؤں کمزور تھے لیکن کام کرتے ہوئے کسی کمزوری کا اظہار نہیں ہو رہا وہ بڑھا تھا۔ کتنا بڑھا؟ اس کا اندازہ لگانے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ اس کے سر پر بالکل نہیں تھے۔ چمڑے پر جھریاں تھیں۔ منہ پوپلا تھا لیکن آنکھیں..... ان سے وہ اسے زیادہ اہیڑ عمر لگتا تھا۔ وہ صاف چمکیلی آنکھیں تھیں..... زندگی کی چمک سے۔ اس کی عمر وہ سال بھی ہو سکتی تھی اور ۱۰۰ سال سے زائد بھی۔

لیکن یوسف کی دلچسپی کا سبب کھرپنے والا وہ اوزار تھا جسے وہ استعمال کر رہا تھا۔ یوسف اس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ جفت ساز نے ہاتھ روک دیا اور اپنی چمکیلی لہ سے اسے نکلنے لگا۔ یوسف نے مسکراتے ہوئے اس کے ہاتھ کے اوزار کی طرف دیکھا۔ جفت ساز اس کی بات سمجھ گیا، اس نے اپنا اوزار اسے دے دیا۔ یوسف نے رکاز جائزہ لیا۔ وہ چمقان پتھر سے بنایا گیا تھا۔ جہاں پتھر کو چھیل کر دھار دار بنایا گیا تھا، اسے وہ اوزار چمکتا ہو رہا تھا۔

یوسف نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر دو بلیڈ والا چاقو نکالا۔ بڑا بلیڈ کھول کر اس ہاتھ جفت ساز کو دکھایا۔ جفت ساز مسکرایا اور اس نے سر کو تھیبی جنبش دی۔ پھر اس نے اس میں سر ہلایا۔ ایسا کرتے ہوئے اس کے انداز میں احساس برتری عیاں تھا۔ تاہم نے یوسف کے ہاتھ سے چاقو لے کر اسے کھال پر آزمایا۔ پھر اس نے یوسف کو کھال پر۔ جہاں چاقو استعمال کیا تھا، وہاں کھال میں کئی چھوٹے چھوٹے کٹ لگ گئے تھے۔ کھرپے کے اوزار سے کھال بڑی صفائی سے کھرچی جا رہی تھی۔ جفت ساز نے یوسف لہ کا چاقو واپس کر دیا اور پتھر کا سوا اٹھا کر کھال میں نفاست سے ایک سوراخ کیا اور لہ کو لٹکا دیا، پھر اس نے دوسری کھال اٹھالی۔

یوسف وہاں سے چل دیا۔ وہ جفت ساز کی عمر کے بارے میں غور کر رہا تھا۔ کیا ہو لہ کی عمر؟ نوے سال؟ سو سال؟ سو..... یا ہزار؟ لگتی تو یہ دیوانگی ہی ہے لیکن

کوئی حقیقی بنیاد نہیں تھی۔ وہ جیسے گوشت پوست کا زندہ آدمی ہونے کے باوجود ایک وہم تھا۔ دوسری طرف راجیلہ تھی، جس نے اپنی انہی کمزوریوں کی وجہ سے اپنی شخصیت کا ہر پہلو ترک کر کے جینا میکلم کی بھیجی بنا قبول کر لیا تھا..... اور جینا میکلم کھرچن تھی۔

یوسف ایسا بے یقین آدمی تھا، جو معجزوں کا قائل نہیں تھا لیکن کوئی بھی معجزہ نہ واقعہ اندر سے اس کی بنیادیں ہلا دیتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے پاس عقیدہ نہیں تھا۔ وہ دین کی رسی کو تھامے ہوئے نہیں تھا اور اب یہ کمزوری اس پر عیاں ہو گئی تھی۔ اس سے اگر کسی آسیب زدہ مکان میں رات گزارنے کو کہا جاتا اور بھاری انعام مقرر کیا جاتا تو وہ بلا جھجک اس مکان میں رات گزار لیتا لیکن کوئی واقعہ پیش نہ آنے کے باوجود وہ صبح پورے یقین سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ مکان آسیب زدہ نہیں ہے۔ اس کے نزدیک مذہبی کتابیں پر اسرار تھیں لیکن انہوں نے جدید سائنس کی رہنمائی کی تھی مثلاً حضرت موسیٰؑ نے زمین پر عصا مارا تھا اور پانی کا چشمہ اہل پڑا تھا۔ یہ ایک سائنٹیفک بات تھی۔ اس کی پیروی کر کے جدید دور کے انسان نے بھی چٹانوں سے پانی نکال لیا تھا۔ اس کا ذہن سائنٹیفک توجہات سمجھتا تھا..... بہتر طور پر سمجھتا تھا لیکن معجزوں کا امکان پھر بھی باقی رہتا تھا۔ اس کے مزاج میں شک بہت تھا..... یا یوں کہئے کہ بے یقینی تھی۔

اب وہ جینا کے حکم کی تعمیل کے لئے نکلا تھا۔ اس لمحے سے پہلے تک اسے جو ہر حیات کی موجودگی پر سرے سے یقین ہی نہیں تھا۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ ڈاکٹر لیوی نے قبیلے کے سربراہ بارزی لئی سے گھنٹوں تنہائی میں گفتگو کی ہے مگر اسے پھر بھی جو ہر حیات کی موجودگی پر یقین نہیں آیا تھا، وہ یہی سمجھتا تھا کہ ڈاکٹر لیوی کوئی پیچیدہ کھیل کھیل رہا ہے۔ اسے یقین تھا..... یا بے یقینی تھی کہ اس دوڑ بھاگ کا کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔

لیکن جب جینا نے اسے حکم دیا کہ وہ اس کے لئے جو ہر حیات حاصل کرے تو ایک لمحے میں اس کا رویہ بدل گیا۔ اب تک وہ یہ سوچتا تھا کہ اس مہم کے دوران اخراجات کی شرح کے زور پر عیش سے زندگی گزارتا رہے گا لیکن اب اسے لگ رہا تھا کہ اس کی لاٹری کھلنے والی ہے۔

اس خیال نے اسے چکرا دیا کہ وہ بے اندازہ دولت کا مالک بننے والا ہے۔ بس اسے ڈاکٹر لیوی کی ناکامی کو کامیابی میں بدلنا تھا۔



پہلے تک لے جا کر اسے سلام کیا، پھر اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ بارزی لئی نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کی گرفت میں دوستانہ گرجوٹی تھی۔ یوسف کا حوصلہ بڑھا۔ اس نے ٹارے سے بتایا کہ وہ اندر آنے کی اجازت چاہتا ہے۔ بارزی لئی نے فوراً سر کو ہلکا سا خم لیا پر دے کو ایک طرف ہٹایا اور یوسف کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔

وہ ایک بہت بڑا کمر تھا۔ ایک نیچی اور لمبی میز کے سوا وہاں کوئی فرنیچر نہیں تھا۔ بلکہ کے علاوہ وہاں پانچ افراد اور تھے۔ کچھ آلتی پالتی مارے اور کچھ دوزانو بیٹھے تھے۔ ان سے کچھ تو بہت ہی بوڑھے تھے۔ بہت ہی زیادہ بوڑھے، ان کے چروں پر جھریاں ہیں۔ ہڈیوں پر جیسے کھال منڈھی ہوئی تھی لیکن سب کی آنکھیں بے حد صاف اور چمک رہیں۔ ان میں کوئی دھندلاہٹ نہیں تھی۔

یوسف کے اندر داخل ہونے پر وہ سب اٹھے اور انہوں نے تعظیماً سر خم کئے۔ سف نے بھی جواباً سر خم کیا اور مسکرایا۔ اس نے باری باری سب سے ہاتھ ملایا۔ انہوں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اٹلکے نے تالی بجائی۔ ایک جوان لڑکا ہاتھوں میں ایک ٹرے لیے دروازہ ہوا۔ ٹرے پر چاندی کی عجیب شکل کی پیالیاں تھیں، جن میں تلخ کافی تھی۔ وہ لیاں بھی صدیوں پرانی معلوم ہو رہی تھیں۔

وہ سب بیٹھ کر کھانی کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتے رہے۔ فضا بے حد دوستانہ لگا اور وہ خاموشی یوسف کو بے حد خوشگوار معلوم ہو رہی تھی۔ یوں اسے سوچنے اور صلہ مجتمع کرنے کی مہلت مل گئی تھی۔ اس دوران وہ اس امر پر غور کرتا رہا کہ زبان کی ٹوٹ کو کس طرح دور کیا جائے اور اپنی بات ان لوگوں تک کیسے پہنچائی جائے۔

نرے ایک طریقہ سوچ گیا۔ اس نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور سب کو سگریٹ کی آفر کی۔ سب نے ریٹ قبول کی۔ سگریٹیں سلگائی گئیں۔ وہ سگریٹ کو عجیب انداز میں پکڑے ہوئے تھے۔ نا اگٹھے اور انگشت شہادت کے درمیان۔ ان کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ سرور کو کر رہے ہیں۔ یوسف نے فیصلہ کیا کہ تجربے کا وقت آچکا ہے۔

وہ نوٹ پیڑ اور پنل اپنے ساتھ لایا تھا۔ ڈرائنگ اس کی اچھی خاصی تھی۔ اس نوٹ پیڑ نکالا اور پنل سنبھال لی۔ ساتوں بزرگ بڑی دلچسپی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ اسے میں خاموشی تھی۔ یوسف کو یہ تشویش ہوئی کہ وہ لوگ ہندسوں کو سمجھ سکیں گے یا نہ۔ وہ جانتا تھا کہ مغربی ہندسوں کی شکل عربی سسٹم ہی کی مرہون منت ہے لیکن یہاں کا

کون جانے کہ وہ کبھی شریات کا مستحق قرار پایا ہو۔ یہ بات تو کھولی ہی نہیں جاتی تھی۔ شریات کے دیا گیا ہے۔

یوسف نے سر جھٹکا اور خود کو دیوانگی سے دور رہنے کی ہدایت کی۔ بڑھا جفت زیادہ سے زیادہ سو سال کا رہا ہو گا۔ اب وہ دوسرے زاویے سے سوچ رہا تھا۔ بڑھے نزدیک چاقو کھال صاف کرنے کے لئے مناسب اوزار ہوتا تو جفت ساز اس کی افادہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا لیکن ایسا اوزار یوسف کے پاس موجود نہیں تھا۔

یہاں کے لوگ بہت پرانی نسل کے تھے۔ انسانی نسل کے زمین پر آغاز کے وقت کے۔ اگر وہ اس جدید دور میں قدیم اور متروک اوزار استعمال کر رہے تھے تو یقینی طور وہاں قدیم نسخے بھی اب تک موجود ہوں گے۔ یہ بات بعید از فہم نہیں تھی کہ طویل زندہ کے حصول کا قدیم ترین راز بھی ان کے پاس موجود ہے۔

یوسف گاؤں کے وسط میں پہنچا۔ یہاں گلی اچھی خاصی سڑک جتنی چوڑی ہو تھی۔ وہ ایک مربع شکل کی عمارت کی طرف بڑھ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ گاؤں کے بڑوں اجلاس یہیں ہوتا ہے۔ اندر سے آوازیں آرہی تھیں لیکن دروازے اور واحد کھڑکی بھاری پردے پڑے تھے۔

یوسف کو اپنی بے بسی اور لاعلمی پر غصہ آنے لگا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس موقع اسنے کیا کرنا چاہئے۔ آواز دے۔ اندر چلا جائے۔ جوتے اتارے یا نہیں۔ اسے ڈر تھا۔ نادانستگی میں بستی کے کسی قاعدے کی خلاف ورزی کر کے ابتدا ہی میں انہیں ناراض نہ کر دے۔ گاؤں میں داخلے کے وقت ڈاکٹر لیوی نے اس سے کہا تھا کہ ”تم کچھ بھی کر ان لوگوں سے ہمیشہ مہربانی سے پیش آنا۔ یہ عزت کا خیال رکھنے والے، خود پر فخر کرنے والے لوگ ہیں۔ تمہارے رویے میں ان کے لئے بد تاثیر کبھی نہ ہو۔“ لیکن اس نے نہیں بتایا تھا کہ کون سی حرکتیں بد تمیزی کے زمرے میں آتی ہیں۔

انہیں اس کی آمد کا علم ہو گیا تھا کیونکہ دروازے کا پردہ ہٹا اور بارزی لئی نمود ہوا۔ وہ قدم میں یوسف سے بڑا تھا۔ اس کے بال کندھوں تک آتے تھے۔ بڑی بارہ شخصیت تھی اس کی۔ اس کے سر کے پیشتر بال سیاہ تھے۔ کہیں کہیں سفیدی جھلک دکھا تھی۔ خوبرو چہرے پر جلد پوری طرح تنی ہوئی تھی۔ صرف آنکھوں کے نیچے چند لکیر نظر آرہی تھیں۔ دیکھنے میں وہ ساٹھ سال سے زیادہ کا ہرگز نہیں لگتا تھا۔ یوسف نے فیصلہ کیا کہ طور طریقے ہر جگہ ایک سے ہی ہوتے ہیں۔ اس نے

ہر حیات کو محفوظ کر لیا تھا اور وہ جو ہر حیات اگر جینا میلکم کو مل جائے تو..... جب جینا سال کی ہوگی تو وہ پچاس سال کا ہو گا اور لکھ پتی بن چکا ہو گا اور مزید دس سال

اس کا سر چکراتا رہا، وہ حساب کتاب اس کے بس سے باہر تھا۔

اس نے دوبارہ سب کو سگریٹ پیش کی اور اپنے منتشر اعصاب کو سکون دینے کے لئے خود بھی ایک سگریٹ سلگائی، پھر اس نے پیڑ اور پنل واپس لی۔ پیڑ کا اوپر والا ورق زکریب میں رکھ لیا۔ اب اس نے نئی شیٹ پر اسکیچ ڈرائنگ شروع کی۔ قابل شناخت ٹون بنانے میں اسے خاصی مہارت تھی۔

وہ اسکیچ کی سیریز کے ذریعے اپنی کمائی بیان کرنے کی کوشش کر رہا تھا!

اس نے ایک درخت بنایا، جس کے تنے کے پتھوں بیچ ایک دل دھڑک رہا تھا۔ شاخ تھی، جس کے گرد ہالہ تھا، اس سے پھل لٹک رہے تھے۔ اس شاخ کے نیچے لی لٹی کھڑا تھا۔ اس کے سامنے جینا میلکم دونوں ہاتھ پھیلائے کھڑی تھی، اس کے پر التجا کا تاثر تھا، آنکھوں میں اپیل تھی۔

وہ جینا میلکم کی جو ہر حیات کے حصول کی خواہش کی عکاسی تھی!

جینا کی دولت، اس کی قوت اور اہمیت کا احساس دلانا بھی ضروری تھا۔ چنانچہ اگلے ج میں اس نے جینا میلکم کو گلوب کے اوپر بادلوں کے تخت پر بیٹھے دکھایا۔ ارد گرد بحری زتے، ریلیں تھیں۔ طیارے تھے، فیکٹریاں تھیں۔ لہلہاتے کھیت، کانیں، جنگل اور نہ لے کیا کیا تھا۔ وہ سب کچھ ڈوریوں سے بندھا ہوا تھا..... اور ہر ڈوری کا سرا جینا کے میں تھا۔ اس کے سر سے منحنی ریڈیائی لکیریں نکل کر پورے گلوب کا احاطہ کر رہی تھیں۔

اگلے اسکیچ میں یوسف نے خود کو پیش کیا..... وہ کھڑا تھا۔ اس کی پشت پر جینا لٹ تھی، جس کا داہنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھا تھا، جو ناقابل شکست اعتبار و اعتماد کی علامت تھا۔ یہ انداز منہ سے بولتا ہوا محسوس ہوتا تھا..... یہ شخص پھر انما سندہ ہے اور انمایت قابل اعتماد دوست بھی ہے۔

پھر اس نے جینا کو بیت الجبل کی اپنی قیام گاہ میں کھڑکی کے سامنے بیٹھا پیش کیا۔ اس کے چہرے پر تشویش کا تاثر تھا۔ وہ طویل انتظار سے تھک چکی تھی اور اپنی تشنہ تکمیل ایل کے ہاتھوں اذیت اٹھا رہی تھی۔ اس کے سر میں کئی چھوٹے چھوٹے تیر پوسٹ

سٹم..... اسے کچھ بھی معلوم نہیں تھا..... بہر حال کوشش تو کی جاسکتی تھی۔ اس نے اپنی انگلی سینے پر رکھی..... انہیں جتا کر اور پھر پیڑ پر عدد ۳۶ لکھا۔ بارزی لٹی کی طرف بڑھا دیا۔ بارزی لٹی نے وہ ایلکے کو دکھایا، دونوں نے سروں کو تھیر جتیش دی اور مسکرائے۔

یوسف نے چہرے پر سوالیہ تاثر ابھارتے ہوئے اس بار بارزی لٹی کی طرف اشارہ کیا اور پیڑ اور پنل اس کی طرف بڑھا دی۔ بارزی لٹی نے بغیر ہچکچائے پیڑ لے لیا۔ اس پر کچھ لکھ کر پیڑ یوسف کو واپس کر دیا۔

یوسف نے کانڈ کو دیکھا، وہاں ۲۳۹ لکھا تھا۔ یوسف کو شدید مایوسی ہوئی، یہ طے کہ وہ اپنی بات انہیں نہیں سمجھا سکا تھا۔ یا پھر ان کے ہاں ہندسوں اور اعداد کا سٹم مختلف ہو گا۔ کیونکہ بارزی لٹی کا لکھا ہوا عدد مہمل معلوم ہو رہا تھا۔

پھر اچانک اسے شاک لگا..... ایسا کہ وہ اندر سے ہل کر رہ گیا۔ اسے یہ خیال آیا کہ وہ کس سرزمین پر ہے۔ یہ کون سا گاؤں ہے اور وہ لوگ یہاں کس امید پر آئے ہیں۔ اس پر اس بری طرح بیجان طاری ہوا کہ اس کا پورا جسم لرزنے لگا۔ یہ ناممکن نہیں کہ بارزی لٹی نے اس کی بات سمجھ لی ہو..... بلکہ یہ عدد اس کے سوال کا جواب ہو۔ اس کی تصدیق بہت ضروری تھی لیکن پڑتاں کیسے کی جائے.....

اس نے کافی لانے والے لڑکے کی طرف اشارہ کیا، جو پیالیوں میں دوسری بار کا ایلٹل رہا تھا۔ بارزی لٹی نے مسکراتے ہوئے سر کو تقیسی جتیش دی۔ اس نے یوسف کے ہاتھ سے پیڑ لے کر اس پر ۱۳ لکھ دیا۔

یوسف کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنہٹ سی دوڑتی محسوس ہوئی۔ لیکن بارزی لٹی نے پنل اور پیڑ ابھی نہیں چھوڑا تھا۔ اس نے ایلکے کی طرف اشارہ کیا، جس کے بال برف کی طرح سفید تھے اور پیڑ پر ۳۳۰ لکھا۔ پھر وہ اپنے بائیں ہاتھ پر بیٹھے ہوئے بڑھے کی طرف متوجہ ہوا، جو ان سب سے زیادہ بوڑھا لگتا تھا۔ اس کی طرف اشارہ کرنے کے بعد بارزی لٹی نے پیڑ پر ۴۱۰ لکھا۔

یوسف کو اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا لیکن یہ کیفیت شاک کی وجہ سے نہیں تھی اس کے دماغ میں اس لمحے بے شمار مساوات چکرا رہی تھیں۔ یہ شبہ کرنے کا کوئی جوا نہیں تھا کہ بارزی لٹی جھوٹ بول رہا ہے۔ وہ تو ذہن میں جینا سے اپنے معاملے کے مطابق اعداد و شمار کا حساب لگا رہا تھا۔ اگر ان لوگوں نے کسی اور طریقے سے

دکھائے گئے تھے، جو اس کی ذہنی اذیت کی عکاسی کر رہے تھے۔

یوسف اپنی اس گونگی کارکردگی پر بہت خوش تھا اور اسے لطف بھی آرہا تھا۔

اسکے ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے ہاتھ تک پہنچ رہے تھے۔ یہ طے تھا کہ اس کی ترکیب کارگر ثابت ہو رہی ہے۔ ساتھ ہی وہ لوگ ان پر گفتگو اور تبصرے بھی کر رہے تھے۔ یوسف خود کو ایسا جادوگر محسوس کر رہا تھا جس نے پہلے ہی ایکٹ میں ناظرین کو مسحور کر دیا ہو۔ وہ کہنا چاہتا تھا ”ہم سب دوست ہیں..... اور اب جب کہ ہم ایک دوسرے کو سمجھ بھی رہے ہیں تو میں کام کی بات کی طرف.....“

لیکن اس نے خود پر قابو پالیا۔ اس نے بارزی لئی کو جانچنے والی نظروں سے دیکھا۔ وہ آخری اسکین کو بغور دیکھ رہا تھا۔ اس آخری اسکین میں، جو اس کے ہاتھ میں تھا، یوسف نے بارزی لئی کو دکھایا تھا۔ ثمرحیات اس نے داہنے ہاتھ میں مضبوطی سے تھاما ہوا تھا۔ اس کے مقابل اس نے جینا کو بنایا۔ جینا کے داہنے ہاتھ میں رقم کی تھیلی تھی۔ تھیلی پر اس نے سکوں کا اسکین بنایا جو کہ دولت کی علامت تھے۔

”کچھ سمجھے؟“ یوسف نے پوچھا۔

کہتے ہی اسے احساس ہوا کہ اس ملاقات میں وہ پہلے لفظ تھے، جنہیں آواز کا پیراہن ملا تھا۔ ورنہ اب تک تو جیسے کوئی خاموش فلم چل رہی تھی۔

وہ سب اسے گھور رہے تھے۔ اس نے آخری اسکین سب کے ملاحظے کے لئے فرش پر پھیلا دیا۔ پھر اس نے آہستگی سے، ڈرامائی انداز میں دولت کی تھیلی پر ایک ایک کر کے ہندسے بنائے اور ان کے ساتھ ڈالر کا نشان بنادیا..... ۵۰۰۰۰ ڈالر!

اس نے سوچا، حماقت اور جلد بازی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ جینا کا مزاج جانتا تھا۔ مطلوبہ چیز جتنی سستی ملے گی، جینا کو اتنی ہی زیادہ خوشی ہوگی۔ اتنا ہی وہ اس سے خوش ہوگی..... اس پر مہربان ہوگی۔ ممکن ہے، خوش ہو کر وہ اسے پانچ سال کے آزمائشی عرصے کے بیجانے کے طور پر بھی کوئی بھاری رقم دے دے۔ جب نیلام کی بولی کی کوئی حد نہ ہو تو بولی بیچنے سے شروع کرنا ہی بہتر ہوتا ہے۔

کوئی رد عمل نظر نہ آیا تو اس نے سوچا، شاید بولی بہت نیچے سے شروع کر دی ہے میں نے۔ وہ سب سر جھکائے اسکین کو دیکھتے رہے۔ دو کے درمیان نظروں کا تبادلہ بھی ہوا لیکن کما کسی نے کچھ نہیں۔ بہر حال یہ بھی کم نہیں تھا کہ اس نے ان کی توجہ گمنوائی نہیں تھی۔

اس نے جیب سے ربر نکالا اور پچاس ہزار ڈالر مٹا کر اس کی جگہ ایک لاکھ لکھ دیا۔ ”دگنا“ اس نے یوں کہا جیسے وہ اس کی بات سمجھ لیں گے۔

ان کی نظروں میں اب بھی خالی پن تھا۔ خاموشی بہت گہمیر ہو گئی تھی۔

”بہت خوب! یہ بھی کم ہے۔“ یوسف نے کہا۔ ”چلو اسے بھی دگنا کر دو۔“

اس بار بھی کوئی رد عمل نہیں تھا۔ اب یوسف کو غصہ آنے لگا۔ ”ٹھیک ہے، نہ سی، اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ اس نے تھیلی کے خاکے پر پانچ لاکھ کی رقم لکھ دی۔ ”اب تو خوش ہو؟“

وہ سوچ رہا تھا کہ یہ عجیب لوگ ہیں، کسی قسم کا کوئی اشارہ نہیں، بت بنے بیٹھے ہیں۔ کچھ تو کریں۔ چلو..... اپنا کیا جاتا ہے۔

ویسے اسے اندازہ تو تھا کہ بولی بہت اونچی جائے گی۔ شاید جینا کا بھی یہی خیال تھا۔ اس نے ربر سے تھیلی پر ڈالر کا نشان مٹا دیا..... تاکہ زیادہ ہندسوں کی گنجائش بن جائے۔ پھر اس نے بارزی لئی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ”چلو..... اب مسخرہ پن ختم۔ بزنس ہو جائے اب۔ جہاں چاہو، مجھے روک دیتا۔ بڑی بی کے پاس دولت کی کوئی کمی نہیں۔“ اتنا کہہ کر اس نے رقم کو دس لاکھ کر دیا۔

پہلی بار موبوم سا رد عمل سامنے آیا۔ بارزی لئی کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ نظر آئی۔ اس کے اور اٹلکے کے درمیان نظروں کا تبادلہ ہوا۔ یوسف نے ایک کو مٹا کر دو لکھ دیا..... ”دیکھو یہ بہت زیادہ معقول قیمت ہے۔“ ساتھ ہی اس نے لیکچر دینے والے انداز میں کہا۔ ”میں لاکھ کم نہیں ہوتے۔ اتنے میں تو پوری بہستی کی تقدیر بدل سکتی ہے۔“

وہ لوگ ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگے لیکن یوسف اندازہ نہیں لگا سکا کہ گفتگو کس نہج پر ہو رہی ہے۔

اچانک اسے اس احساس نے ڈنک چھبویا کہ اس خرید و فروخت میں اس کا کیا کچھ لاؤ پر لگا ہے۔ اس کے اعصاب ہل کر رہ گئے۔ ساتھ ہی اسے غصہ بھی آیا۔ جینا نے کہا تھا..... ہر قیمت پر۔ اور وہ دولت جینا کی تھی۔ وہ بچانے کی فکر کیوں کر رہا ہے۔

اس نے کانڈ پر دو مٹا کر اس کی جگہ پانچ لکھ دیا۔ پچاس لاکھ۔

اب ایک عجیب بات رونما ہوئی۔ بارزی لئی نے اسے بے حد خوبصورت مسکراہٹ سے نوازا۔ وہ مسکراہٹ بتاتی تھی کہ وہ اس کی بات سمجھ رہا ہے۔ اس نے یوسف کا

سیدھا..... پتل والا ہاتھ تھام لیا، جیسے کہہ رہا ہو کہ اب مزید کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں پھر اس نے آہستہ سے نفی میں سر ہلایا۔

یوسف نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور پھنکار کر بولا۔ ”مجھے تمہاری ہمدردی ضرورت نہیں۔ میں رقم لکھ رہا ہوں۔ تم صرف یہ بتا دو کہ تمہیں رقم کب چاہئے اور شریحات کب دو گے؟“ وہ یہ بھی بھول گیا کہ وہ اس کی بات نہیں سمجھ رہے ہیں۔

لیکن ایک کروڑ پر پہنچ کر اس کے اعصاب جواب دے گئے۔ پہلے تو اس کے اندر ایک عجیب سا سناٹا تیر گیا۔ سارے لفظ جیسے مر گئے۔ دیر تک وہ سکتے کی سی کیفیت میں رہا۔ پھر وہ اچھل کر اٹھا اور ان پر برس پڑا۔ اسے خود پر کوئی اختیار نہیں رہا تھا۔ ”احقو..... کیا تم دولت کی اہمیت کو نہیں سمجھتے؟ پتا بھی ہے ایک کروڑ کتنا ہوتا ہے اور تم چاہتے کیا ہو..... دو کروڑ..... ڈھائی کروڑ..... دس کروڑ؟ تم جو بھی مان گے، وہ دے گی، اور کیش دے گی اور تم مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو؟ میں پاگاہ نہیں ہوں۔ تمہارے گاؤں کا نقشہ بدل سکتا ہے اس دولت سے۔ تمہاری کاپیالٹ جائے گی۔ اس جفت ساز کو پتھر کے اوزاروں کی جگہ پلائیم کے اوزار بھی مل سکتے ہیں۔ سب کو ٹیلی وژن مل جائیں گے..... ریفریجریٹر مل جائیں گے۔ گھر گھر آسائشیں ہوں اور ہر گھر کی جگہ ایک محل ہو گا۔ تم ڈھنگ کے کپڑے پہنو گے۔ پوری دنیا دیکھ سکو گے بے وقوفو..... میں تمہیں سچ سچ کی دولت کی پیشکش کر رہا ہوں۔ ارے احقو..... تمہیں اندازہ بھی نہیں کہ تمہاری تو لائری نکل آئی ہے۔ سن رہے ہو میرا بات.....؟“

اسے احساس بھی نہیں تھا کہ وہ حلق کے بل چیخ رہا ہے..... پاگلوں کی طرح اس کی آنکھوں سے فرسٹریشن کے آنسو بہہ رہے تھے۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ اس کے منہ سے کف اڑ رہا ہے۔ اس نے جیب سے رومال نکال کر منہ صاف کیا۔ پھر اس نے دیکھا، وہ سب اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ بارزی لئی نے اس کا ہاتھ پکڑا وہ جان گیا کہ کھیل ختم ہوا اور وہ ہار چکا ہے۔ عین اس وقت جب وہ کروڑ پتی بننے۔ صرف ایک لفظ کے فاصلے پر تھا..... لیں!

اس نے بارزی لئی کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرانے کی نیم کامیاب کوشش کی۔ ”ٹھیک ہے باس۔ میں جانتا ہوں کہ میں ہار گیا ہوں۔ مجھے دھکے دے کر نکالنے کی ضرورت نہیں، میں خود چلا جاؤں گا۔“

بارزی لئی اس کا ہاتھ تھام کر اسے باہر لے آیا۔ یوسف نے بارزی لئی کو غور سے دیکھا۔ اسے حیرت ہوئی کہ بارزی لئی کے چہرے پر برہمی کا تاثر نہیں تھا، اس کے برعکس اس کے چہرے پر ہمدردی تھی اور وہ اسے مہمان نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

بارزی لئی نے یوسف سے بڑی مگر جوشی سے ہاتھ ملایا۔ پھر اس نے کئی بار اس کے کندھے کو نرمی سے تھپتھپایا، اس کے بعد آخری تھپکی دے کر نرمی سے اس کا رخ کلی کی طرف کر دیا، جیسے واپس جانے کا مشورہ دے رہا ہو۔

یوسف نے خود سے کہا، ”واہ بھئی یوسف! تم بھی ہو بڑی شے..... اس بڑھے کو بھی احساس ہے کہ تم ایک ناکام آدمی ہو اور اسے بھی تم پر ترس آ رہا ہے۔ یہ بتاؤ میاں، اب جینا میلکم کو کیا جواب دو گے؟“

وہ اس لئے ہوئے جواری کی طرح واپس چل دیا جسے یقین ہو کہ وہ کروڑوں کا جیتا ہوا داؤ محض اس لئے ہار گیا ہے کہ اس کے پاس داؤ کھیلنے کو کچھ نہیں بچا تھا۔ جب کہ اس کے پاس اکوں کی ٹریل تھی۔

○-----○-----○

اس روز آدمی رات کے بعد بستی کے بڑوں کا ایک پیغامبر وہاں آیا، جہاں مہمان مرد مقیم تھے۔ بین آنرک سوچا تھا ڈاکٹر لیوی غار سے لائے ہوئے پتھروں کا باریک بینی سے معائنہ کر رہا تھا۔ یوسف بظاہر مطالعہ کر رہا تھا لیکن اس کی نظریں تک کتاب پر نہیں تھیں۔ وہ اپنی شام کی ناکامی پر غور کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ جینا کو کیا جواب دیا جائے۔

ڈاکٹر لیوی نے اسے چونکا دیا۔ ”ضرور کچھ ہوا ہے۔“ اس نے پیغامبر کو رخصت کرنے کے بعد کہا۔ ”بڑوں کی ایک میٹنگ ہوئی ہے، جس میں ایک اہم فیصلہ کیا گیا ہے۔ بڑوں کی کونسل نے مس میلکم سمیت ہم سب کو فوری طور پر طلب کیا ہے۔“

یوسف اچھل پڑا۔ ”کیا..... کیا مطلب؟“

”تم جا کر مس میلکم کو جگاؤ۔ ویسے روشنی تو نظر آ رہی ہے، ممکن ہے وہ جاگ رہی ہو۔“

”چکر کیا ہے؟ کیا وہ مان گئے ہیں؟ انہوں نے فیصلہ کر لیا ہے؟“

”معلوم نہیں۔“ ڈاکٹر لیوی نے جواب دیا اور اسے ٹٹولنے والی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ ”مجھے لگتا ہے، آج جو تم ان سے ملنے گئے تھے تو تم نے کوئی گزبڑ کی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہاں کیا ہوا۔ لہذا میں یہ اندازہ نہیں لگا سکتا کہ اس کا کیا نتیجہ نکلا ہو گا۔ بہر حال

پیشوا کی کو اٹھ کھڑے ہوئے..... بارزی لئی نے اپنی زبان میں جینا میکم سے خطاب کیا۔  
 ”کیا بات ہے؟ یہ کیا ہو رہا ہے؟ مجھے فوراً بتاؤ۔“ جینا میکم نے ڈاکٹر لیوی سے کہا۔  
 یوسف نے بین آنزک سے کہا۔ ”تمہارے کچھ پلے پڑ رہا ہے؟“  
 ”نہیں، لیکن میرا خیال ہے، تم نے بھیل تباہ کر دیا ہے۔“ بین آنزک نے جواب دیا۔

بارزی لئی بہت دیر تک بولتا رہا۔ اس کے خاموش ہونے پر ڈاکٹر لیوی نے جینا کے سوال کا جواب دیا۔ ”یہ لوگ آپ کے لئے دعا گو ہیں۔ کہہ رہے ہیں کہ آپ کی یہاں آمد ان کے لئے سرفرازی کا باعث ہے۔“ وہ ایک لمحہ خاموش رہا۔ پھر بولا۔ ”میں آپ کی طرف سے ان کا شکریہ ادا کروں گا۔ لیکن مس میکم، کچھ بھی ہو، میری التجا ہے کہ آپ مبروخل سے کام لیں۔“

راحیلہ نے یوسف کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ”مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“  
 ”یہ ڈر کہ یہ لوگ مس میکم کو شرمیات نہیں دیں گے؟“  
 ”نہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ یہ مس میکم کو شرمیات دینے والے ہیں۔“ راحیلہ نے جمر جھری لیتے ہوئے کہا۔

مردوں نے بستی کے بڑوں سے ہاتھ ملائے اور بیٹھ گئے۔ کافی کا دور خاموشی کا دور تھا۔ یوسف کو جینا کے اعصاب چنختے محسوس ہو رہے تھے۔ یوسف نے خود کو دلاسا دینے کی کوشش کی لیکن اس کا کوئی جواز نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ تواضع اور خوش اخلاقی تو مشرق کی اور خصوصاً عربوں کی مہمان نوازی کا حصہ ہے۔ وہ اس کے بعد بڑی نرمی اور خوش اخلاقی سے انہیں گاؤں سے نکل جانے کا حکم سناسکتے تھے۔

اپنے اعصاب کو پرسکون رکھنے کے لئے کوئی مصروفیت تلاش کرنا ضروری تھا۔ یوسف نے بارزی لئی اور اٹکے کے چروں پر نظریں جمادیں۔ آخر ان لوگوں کا اپنی عمر سے اتنا..... اتنا زیادہ چھوٹا نظر آنے کا راز کیا ہے؟ وہاں روشنی کے لئے جو چراغ استعمال ہو رہے تھے وہ تیل سے بھری بڑی طشتیوں میں روٹی کی بتیاں جلائی گئی تھیں، اس روشنی میں ان کے چروں کو دیکھ کر یوسف کو احساس ہوا کہ کسی مقام پر ان کی عمریں ٹھہر گئی ہوں گی۔ اس کے بعد وقت ان پر اب تک اثر انداز نہیں ہوا تھا۔ اسے اس بات پر یقین ہو گیا اور یہ کیسے ہوا..... وہ سوچتا رہا۔

کافی کا دور ختم ہوا تو بارزی لئی اٹھ کھڑا ہوا۔ اتنے بہت سے بیٹھے ہوئے لوگوں

جو کچھ بھی ہوا، اس کے ذمے دار تم ہو گے۔ ممکن ہے، اس بلادے کا مقصد ہمیں گاؤں سے نکل جانے کا حکم دینا ہو۔ بہر صورت ہمیں فوری طور پر ملاقات کے لئے جانا ہے.....“

یوسف نے جیکٹ پہنی، سر پر ٹوپی رکھی کیونکہ سردی اچھی خاصی ہو رہی تھی، پھر وہ جینا کی اقامت گاہ کی طرف گیا۔ ”مس میکم!“ اس نے پکارا۔

”کون ہے؟ کیا بات ہے؟“

”میں جوزف ہوں۔ آپ جاگ رہی ہیں؟“

”ہاں۔ کیا بات ہے؟“

”بڑوں کی کونسل نے فوری طور پر ہم سب کو طلب کیا ہے۔“

”اوہ..... میں ابھی تیار ہوتی ہوں۔“ جینا کے لمبے میں بے تاب تھی۔

یوسف کو ایک لمحے کو خیال آیا کہ جینا کو ڈاکٹر لیوی کے خدشوں سے آگاہ کر دے۔ یہ کہ ممکن ہے، انہیں گاؤں سے نکلنے کا حکم دیا جائے اور وہ شام کو اپنی کوشش میں ناکامی کا احوال بھی سنا ڈالے لیکن اسے ہمت نہ ہوئی۔ ویسے بھی وہ آخری لمحے تک لڑنے کا قائل تھا۔ حقیقت اگر جینا کو چند منٹ بعد معلوم ہو جائے گی تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا لیکن چند منٹ پہلے معلوم ہو جانا تباہ کن بھی ہو سکتا تھا اور پھر کون جانے، حقیقت کیا ہو۔ بعض اوقات صورت حال بہت خراب نظر آتی ہے لیکن نتائج برعکس ہوتے ہیں۔

چند منٹ بعد جینا میکم، راحیلہ کے ساتھ باہر آئی۔ جینا نے گرم، سیاہ شال بدن پر لپیٹی ہوئی تھی۔ دوسری طرف بین آنزک اور ڈاکٹر لیوی بھی تیار ہو کر آ گئے۔ بین آنزک سو کر اٹھا تھا اور لگتا تھا کہ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا ہے۔

گاؤں کی گلیاں آدھے چاند کی روشنی میں نہائی ہوئی تھیں۔ کوہ ہرمن کی برف پوش چوٹی سے منعکس ہونے والی چاندنی بے حد روشن تھی..... اتنی کہ منہ کھولے ہوئے تاریک غار بھی صاف دکھائی دے رہے تھے۔

وہ کونسل ہاؤس کے دروازے پر پہنچے ہی تھے کہ پردہ ہٹا کر پیغامبر باہر آیا اور اس نے انہیں اندر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ پانچوں اندر چلے گئے۔

یوسف نے ایک نظر میں دیکھ لیا، اندر وہی لوگ تھے جنہیں اس نے شام کو قائل کرنے کی کوشش کی تھی اور ناکام رہا تھا۔ ان لوگوں کے اندر داخل ہوتے ہی وہ سب

رف مڑی۔ ”جلدی کرو..... مجھے بتاؤ..... کیا کہا ہے اس نے؟“ بیجان کی شدت سے اس کی آواز بدل کر رہ گئی تھی۔

ڈاکٹر لیوی نے پہلے اسے اور پھر یوسف کو دیکھا، جیسے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہو۔  
 وہ بات کہاں سے شروع کرے۔ پھر اس نے بارزی لئی کے سامنے سرخم کیا اور بولا۔  
 بارزی لئی نے کہا ہے کہ اس کے ہاتھ میں موجود برتن میں شمر حیات موجود ہے۔ یہ وہ  
 بل ہے جو خدا کے حکم سے موت کو دور سے دور تر کر دیتا ہے۔ یہ وہ پھل

جینا کی گہری سانس پھنکار سے مشابہ تھی.....  
 ”یہ پھل خدا کا تحفہ ہے.....“ ڈاکٹر لوی کہہ رہا تھا۔ ”یہ جنت سے بھیجا گیا۔  
 ان کے لئے ہے، جو نیک اور معصوم ہیں، جو گناہوں سے بچتے ہیں۔ ہر تین سال بعد  
 اس کی فصل بہت تھوڑی مقدار میں حاصل ہوتی ہے اور جب ایسا ہوتا ہے تو سننے چاند کی  
 باتیں رات بستی کے بڑے جمع ہو کر غور و خوض کرتے اور فیصلہ کرتے ہیں کہ اس بار  
 خدا کے اس تحفے کا حقدار کون ہے؟ آج یہ لوگ اسی لئے اکٹھے ہوئے ہیں اور.....  
 در یہ فیصلہ کر چکے ہیں۔“

یوسف سوچ رہا تھا کہ..... بس ایک لفظ کا فاصلہ ہے پھر مجھے پتا چل جائے گا کہ  
 بس اب کروڑ پتی ہوں یا پہلے جیسا تلاش۔  
 خاموشی میں جینا کی بھاری سرگوشی ابھری۔ ”کون ہے وہ خوش نصیب‘ جس کے  
 حق میں فیصلہ ہوا ہے؟“

ڈاکٹر لیوی چند لمحے لنگ رہا، جیسے لفظوں سے محروم ہو گیا ہو۔ اس نے پہلی بار بارزی لئی کو، بہتی کے بڑوں کو، جینا کو اور سب سے آخر میں یوسف کو دیکھا۔ پھر اس نے غلط انداز میں کہا۔ ”یہ لوگ فیصلہ کر چکے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ آپ اتنا فاصلہ طے کر کے ان کے گاؤں آئی ہیں۔ یہ بہت قابل قدر بات ہے۔..... اعزاز ہے ان کے لئے اور یہ کہ آپ اپنے ملک کی بہت اہم اور بزرگ ہستی ہیں۔ آپ کا وہاں بہت احترام کیا جاتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ان کے پاس آپ کی مدارات کے لئے کچھ بھی نہیں۔ شاید اس نیلے مرتبان میں بند عمر عزیز کے اضافی برس آپ کے اور آپ کے لوگوں کے کسی کام آسکیں۔ اس لئے انہوں نے اس بار اس خدائی تحفے کے لئے آپ کو منتخب کیا ہے۔ اگر آپ جاہل تو اس بار ثمر حیات کی فصل آپ کی ہے۔“

میں اس کا تہ اور بڑا لگ رہا تھا۔ اس لمحے ایسی خاموشی تھی کہ یوسف کو اپنے دل کے دھڑکنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

بارزی لٹی نے کسی جادوگر کے انداز میں اپنے لبائے میں ہاتھ ڈال کر ایک نیلگوں برتن برآمد کیا۔ برتن گول تھا۔ اس کا قطر کوئی چار پانچ انچ ہو گا۔ اس پر دھکنا بھی تھا۔ کمرے میں جینا کی گرمی سانس کی آواز گونجی اور وہ آگے کی طرف جھکی۔ ایک لمحے کو ایسا لگا جیسے وہ بے اختیار ہونے والی ہے۔ لگتا تھا، وہ برتن پر جھپٹے گی، اس کا دھکنا ہٹائے گی اور اندر موجود شے کو مٹھی بھر کر پھانک جائے گی۔ یوسف نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا..... یہ جتانے کے لئے کہ خود پر قابو رکھنا ضروری ہے۔ اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ جینا کی دوسری طرف بیٹھے ہوئے ڈاکٹر لیوی نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔

راحیلہ کی آنکھیں پھیل گئی تھیں اور ان میں تشویش کے سائے لہرا رہے تھے۔ اس کا ہاتھ بے اختیار اپنے منہ پر جاتھا تھا۔ بین آنرک آگے جھکا اور اس نے سرگوشی میں راحیلہ سے کچھ کہا۔

بارزی لہی نے ڈاکٹر لیوی کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔ ڈاکٹر لیوی اٹھا اور اس کی طرف رخ کر کے کھڑا ہو گیا۔ بارزی لہی نے اپنی زبان میں بہت آہستگی اور ٹھہراؤ کے ساتھ خطاب کا آغاز کیا۔ اس کا لہجہ بہت جاندار تھا۔ خطاب کافی طویل تھا۔ یوسف اس دوران اس کے چہرے کے بدلتے تاثرات، لہجے کے زیر و بم اور اس کی آنکھوں کو بغور دیکھتا رہا۔ وہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

خطاب کے دوران بارزی لئی نے کئی بار نظریں جھکا کر جینا کو دیکھا۔ ان لمحوں میں اس کی آنکھوں میں عجیب سا تاثر نظر آیا تھا..... ہمدردی، ترحم! اور ہر ایسے موقع پر اس نے جینا کے چہرے سے نظر ہٹا کر یوسف کو دیکھا تھا۔

ڈاکٹر لیوی، جو بڑی توجہ سے اس کی باتیں سن رہا تھا، اس کے چہرے پر عجیب ترین تاثرات نظر آ رہے تھے۔ وہ حیران تھا..... ششدر تھا لیکن انداز ایسا تھا، جیسے وہ محظوظ ہو رہا ہو۔ وقتاً فوقتاً وہ بارزی لئی کے چہرے سے نظر ہٹا کر یوسف کو دیکھتا، ایسے میں اس کی نگاہوں میں واضح بے یقینی ہوتی۔

بلاخرہ بازی لمبی کی تقریر ختم ہوئی۔ اس نے احتراماً ڈاکٹر لیوی کے سامنے سر خم کیا۔  
اس کے اس انداز میں بلا کا وقار تھا۔

جینا کو چند لمحے بعد احساس ہوا کہ بارزی لٹی خاموش ہو چکا ہے۔ وہ ڈاکٹر لیوی کی



جینا میکم نے مرتبان کو مضبوطی سے تھاما اور سینے سے بھینچ لیا۔ پھر اس نے نگاہیں اٹھا کر بارزی لئی کو دیکھا اور بولی۔ ”شکریہ..... بے حد شکریہ۔“ پھر وہ ڈاکٹر لیوی کی طرف پلٹی۔ ”شکریہ..... تمہارا بھی شکریہ..... بس، اب میں جا سکتی ہوں؟“

ڈاکٹر لیوی نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ کچھ کتنا چاہ رہا تھا کہ جینا نے جلدی سے کہا۔ انہیں ساتھ چلنے کی ضرورت نہیں۔ میں خود ہی چلی جاؤں گی۔ ”یہ کہہ کر وہ مرتبان کو اپنے سے بھینچے، کمرے سے نکل گئی۔

چند منٹ بعد یوسف، راحیلہ، بین آئزک اور ڈاکٹر لیوی باہر نکلے تو گلی سنانی۔ کوئٹہ ہاؤس اور ان کی اقامت گاہ تک کے درمیانی راستے پر جینا کا نام و نشان تک میں تھا۔ حالانکہ وہ تین فرلانگ سے کم ہی فاصلہ ہو گا۔ ہاں اوپر، گاؤں سے باہر جانے والی بحالی کی طرف سے بھاگتے ہوئے قدموں کی دور ہوتی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ آواز لبرائٹ کی نشاندہی کر رہی تھی۔ چند لمحے بعد برف پوش چوٹی کے پیش منظر میں جینا کا دلا نظر آیا۔

”بے چاری..... مضطرب ہستی!“ ڈاکٹر لیوی نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

”انہیں کیا ہو گیا؟“ راحیلہ چلائی۔ ”کہاں جا رہی ہیں یہ؟“

”انہیں خود بھی نہیں معلوم کہ وہ کیا کر رہی ہیں۔“ بین آئزک بولا۔ ”وہ بھٹک نہ گئیں۔ میں جا کر انہیں واپس لاتا ہوں۔“

بین آئزک نے قدم بڑھایا ہی تھا کہ یوسف غرایا۔ ”انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو۔“

بین آئزک نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ وہ رکنے کے موڈ میں ہرگز نہیں تھا لیکن ڈاکٹر نے اسے روک لیا۔ ”نہیں بین آئزک! انہیں جانے دو۔ مداخلت نقصان دہ ہو گی۔ تم سے اس وقت تک بھاگتی رہیں گی، جب تک مرنے جائیں۔ وہ ڈر رہی ہیں کہ ہم ریات میں حصہ نہ مانگ بیٹھیں۔“

یوسف کو پھر احساس فتح نے آدھو چا۔ ”میں کامیاب ہو گیا۔“ اس نے جیج کر کہا۔

کس میکم کو ان کا گوہر مقصود مل گیا لیکن ڈاکٹر، تم نے اندر پوری بات سچ نہیں بتائی۔

”جیج سچ بتاؤ، بارزی لئی کیا کہہ رہا تھا۔“

ڈاکٹر نے کہا۔ ”تم ٹھیک سمجھ ہو۔ میں مس میکم کے سامنے حقیقت نہیں بتا سکتا۔ تم بہت چالاک آدمی ہو دوست۔ نہ جانے کیسے تم نے انہیں یقین دلادیا کہ جینا میکم

یوسف نے بڑی کوشش سے خود کو نعرہ فتح لگانے سے باز رکھا۔ تاہم دل میں اس نے بڑے زور کا نعرہ لگایا..... کروڑ پتی یوسف عالم زندہ باد۔ پھر اسے ایک خیال نے چونکا دیا۔ اسے احساس ہوا کہ ڈاکٹر لیوی نے سب کچھ نہیں بتایا ہے، وہ کچھ چھپا گیا ہے۔

”ماں کو شرمیات مل گیا۔ ہم نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔“ بین آئزک نے کہا، جیسے سینے پر سے بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا ہو۔

جینا لڑکھڑاتے ہوئے اٹھی۔ اس کے اٹھتے ہی بارزی لئی نے بڑے ڈرامائی انداز میں برتن پر سے ڈھکنا ہٹا دیا۔ اوپر چند پتے تھے، نیچے سبزی مائل سیاہ کوئی چیز تھی۔ اس کی تیز منک سے کرا بھر گیا۔ وہ رات میں کھلنے والے پھولوں اور صندل کی سی ملی جلی خوشبو تھی۔ بارزی لئی نے پھر کچھ کہا۔ ڈاکٹر لیوی نے اس کی ترجمانی کی۔ ”یہ کہہ رہے ہیں کہ بستی کی طرف سے یہ تحفہ قبول فرمائیں۔ خدا اس ثمر میں چھپے اضافی برسوں کو آپ کے لئے محفوظ رکھے۔“

”میں..... میں کیا کروں؟“ جینا نے پوچھا۔ اس کے لئے بولنا دو بھر ہو رہا تھا۔

”مجھے کیا کہنا چاہئے؟ مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا ہے۔ یہ لوگ اس کے عوض مجھ سے کچھ بھی نہیں مانگ رہے ہیں! میں کیا کروں جواب میں؟“

”کچھ بھی نہیں۔ بس ان کا شکریہ ادا کریں۔ انہوں نے آپ کے لئے بہت بڑا ایثار کیا ہے۔ اس کی قیمت لگانے کی کوشش نہ کیجئے۔ اس سے انہیں تکلیف ہو گی۔ تو بین کا احساس ہو گا۔ ان سے کہیں کہ ان کی مہربانی ہے، جو آپ کبھی فراموش نہیں کریں گی اور آپ کو امید ہے کہ وہ اضافی زندگی، جو خدا آپ کو عطا فرمائے گا، نیکی اور دانائی لائے گی اور خدا کے احکامات کے مطابق بسر ہو گی۔ یہ سب کچھ آپ خود کہیں۔ پھر میں آپ کی بات دیانت داری سے ان لوگوں تک پہنچا دوں گا۔“

یوسف دیکھ رہا تھا کہ جینا بڑی مشکل سے خود کو سنبھالے ہوئے ہے۔ اس نے وہی کچھ لفظ بہ لفظ ذہن دیا، جو ڈاکٹر لیوی نے کہا تھا۔ انداز کسی پٹانائز کئے گئے معمول کا سا تھا، جسے علم نہ ہو کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ یوسف کو یہ احساس بھی تھا کہ احساس فتح کے جھٹکے جینا کے ناتواں وجود کو اندر سے جھنجھوڑے دے رہے ہیں۔

وہ خاموش ہوئی تو ڈاکٹر لیوی نے وہ سب کچھ بارزی لئی اور بستی کے بڑوں کو منتقل کر دیا۔ اس کے خاموش ہونے کے بعد بارزی لئی نے سرخم کیا اور بڑے احترام سے شرمیات کا مرتبان جینا میکم کی طرف بڑھادیا۔



اب ترین مادہ ہے، جس میں وقت کی دی ہوئی لامحدود مہلت پنہاں ہے۔  
مرتبان میں جو کچھ تھا، وہ اس کی خواہشات کی تکمیل کا وسیلہ تھا اور اب اس کے  
تکمیل کے درمیان کوئی شے خارج نہیں تھی۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی وہ جیت گئی  
اور اس بار اس نے موت پر فتح حاصل کی تھی۔

لیکن زندگی کے اس اہم ترین لمحے میں اسے احساس ہوا کہ وہ واضح طور پر یاد  
اکر پارہی ہے کہ اس کی خواہشات کیا تھیں۔ وہ کراچی میں اپنے محل کی آسائشات  
کرانیولی اس سرزمین پر کیوں آئی ہے؟

اس کی سوچیں ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں۔ وہ اس کی قوت ارادی کے حکم کی  
انہیں کر رہی تھیں۔ اس کے تصور میں بیت اللہ کی وہ تصویری کتاب لہرا رہی تھی،  
جسے بچپن میں دی گئی تھی۔ یہ مغربی سمت کا منظر دیا ہی تھا۔ کیا خبر، وہ بیت اللہ پر ہی  
فلن ہو۔

اس نے اپنے منتشر ذہن کو آزاد چھوڑ دیا۔ اوپر ستاروں کی وضو اور بڑھنے لگی۔  
اس کے اندر ایک آواز ابھری۔ کوئی کہہ رہا تھا۔ میرے احکامات کی تکمیل کرو، جو  
نے اپنے پیغمبروں اور اپنی کتابوں کے ذریعے تم تک پہنچائے ہیں۔ پھر دیر تک اس  
جود میں ان لفظوں کی بازگشت کو نبھتی رہی۔

وہ آسمان پر چمکتے ستاروں کو دیکھتی رہی۔ بہت آہستہ آہستہ اس پر ان لفظوں کی  
تکلی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا لیکن اس کی تنہائی مکمل تھی۔ کہیں کوئی نہیں تھا۔  
تھا، جو کوئی بھی تھا، اس کے اپنے اندر تھا۔ کہیں کوئی سایہ نہیں تھا، کوئی آواز نہیں  
بلکہ ہوا بھی جیسے رک گئی تھی۔

اس نے مرتبان کو اپنے قریب ہی..... چٹان پر رکھ دیا۔

معنویت اجاگر ہوئی تو الفاظ بہت سادہ ہو گئے اور انہوں نے اس کی روح کی  
بول کو چھو لیا۔ اس کے وجود میں ان دیکھی کھڑکیاں کھلنے لگیں۔ گلے میں نامعلوم  
سے دبے اور پوشیدہ بند ٹوٹنے لگے۔ اس کا گلا رندھا اور آنسوؤں کا سیلاب بہہ  
اس کے اندر کون تھا؟ یہ تو خدا بول رہا تھا۔ اب پہلی بار اسے احساس ہوا کہ خدا  
مردوں سے کچھ اور نہیں چاہتا بس یہی کچھ چاہتا ہے، جو اس نے کہا تھا اور وہ.....  
نے زندگی اس طرح بسر کی تھی کہ خدا اس کے ذہن میں رہا تھا۔ اس نے اپنے دل کو  
اپزیرائی کے قابل ہی نہیں چھوڑا تھا۔

نہیں، دشمن ہوں۔ یوسف، ڈاکٹر لیوی، راحیلہ..... حتیٰ کہ بین آنزک بھی.....  
جب کہ اسے طویل عرصے زندہ رہنے کی کلید مل گئی تھی تو وہ کسی پر اعتبار نہیں کر سکتی  
تھی۔

نیچے اسے گاؤں کی روشنیاں دکھائی دیں۔ وہ اسے گھات لگائے بیٹھے کسی درندے  
کی آنکھیں معلوم ہوئیں۔

وہ اب نڈھال ہو گئی تھی۔ پھر بھی وہ کوشش کر کے چڑھائی پر چڑھتی رہی۔ جب  
تک یہ یقین نہ ہو جاتا کہ وہ لوگ اس تک نہیں پہنچ سکیں گے، وہ مرتبان کھول کر ایک  
مٹھی ابدیت پھانکنے کی ہمت نہیں کر سکتی تھی۔ بالآخر وہ اس چٹانی جھجے تک پہنچ گئی، جہاں  
راستہ ختم ہو جاتا تھا۔ وہ وہاں رکی اور کھڑے ہو کر برف پوش چوٹی کو دیکھتی رہی۔

اب اس میں بالکل جان نہیں رہی تھی۔ توانائی اس کا ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ اتنی  
بلندی پر ہوا میں آکسیجن ناکافی رہ جاتی ہے، اسی لئے اس کے سینے میں نہیں سارہی تھی  
اس کی ٹانگیں، جو اتنی مشقت کی عادی نہیں تھیں، اب اس کا بوجھ اٹھانے سے معذوری  
ظاہر کر رہی تھیں۔ قریب ہی ایک لمبی، چوٹی مسطح چٹان تھی، جسے چرواہوں کی کئی سلسلیں  
آرام گاہ کے طور پر استعمال کرتی رہی ہوں گی۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی اس چٹان کی طرف بوم  
اور ڈھیر ہو گئی لیکن اس عالم میں بھی اسے مرتبان کی حفاظت کا خیال رہا تھا۔

بہت آہستہ آہستہ اس کی نظروں میں چھائی ہوئی دھند چٹنے لگی۔ دل کی دھڑکنیں  
معمول پر آگئیں۔ پیپہڑوں میں بھری ہوئی آگ دھیرے دھیرے سرد ہونے لگی۔ ہوا کی  
ٹھنڈک اور مٹھاس کے چھینٹوں نے اس کی تشویش کو بھی سرد کر دیا۔ پہلی بار اس نے  
پورے شعور کے ساتھ گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ اس کے عقب میں، اوپر تاروں کی طرف کوہ  
ہرمن کی جڑواں برف پوش چوٹیاں سر اٹھائے کھڑی تھیں۔

جینا میلکم پوری دنیا کے اوپر..... سر پر اکیلی کھڑی تھی!

ہوا تیز تھی، لیکن ناقابل برداشت نہیں تھی۔ ستارے کبھی اتنا نزدیک محسوس  
نہیں ہوئے تھے۔ وہ جھکتے ہوئے مغربی افق پر مغربی سمت کی پہاڑیوں کی چوٹیوں پر جڑے  
ہوئے تھے۔ ان میں ایک ستارہ سب سے بڑا، سب سے چمکدار تھا۔

اب اس کا ذہن پوری طرح کام کر رہا تھا۔ وہ کون ہے؟ کہاں ہے؟ اسے سب  
معلوم تھا۔ وہ جینا میلکم ہے..... دنیا کی امیر ترین عورت اور وہ اس وقت شام میں ایک  
پہاڑی کی چوٹی پر مرتبان کو سینے سے لگائے بیٹھی ہے۔ وہ مرتبان جس میں تیز خوشبو والا دنیا

لیکن اب وہ خود کو ٹٹولنے پر مجبور تھی۔ اسے اب یقین نہیں رہا تھا۔

اس نے مرتان کو غور سے دیکھا۔ چاندنی میں وہ نیلگوں مرتان چمک رہا تھا۔ جینا نے سوچنے کی کوشش کی کہ اسے اس جوہر حیات کی طلب کیوں تھی۔ اس کی کیا اہمیت تھی اور اب وہ اسے اپنے پہلو میں کیوں رکھے بیٹھی تھی مگر اب اسے پوری طرح یاد نہیں آ رہا تھا۔ دھیمی سی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔ جہاں جہاں اس کی املاک تھیں صنعتیں نہیں، وہاں کے محکمہ انکم ٹیکس سے اس کی سرحد جنگ چل رہی تھی۔ انکم ٹیکس دیتے ہوئے اس کا دم نکلتا تھا۔ انکم ٹیکس بچانے کی ہر ترکیب سے وہ استفادہ کرتی تھی اور وہ اسے جھپٹرتے تھے کہ اس کی موت کے بعد وہ ساری کسر نکال لیں گے اور اس کی موت اب تھوڑے ہی عرصے کی بات ہے۔

لیکن یہ تو ماضی کی باتیں تھیں، جو اب گھٹیا معلوم ہو رہی تھیں۔ یہ تو وہ وقت تھا، جب اسے خدا کی نظریں واضح طور پر اپنے وجود میں اترتی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ اندر ہی اندر لرز رہی تھی۔ اسے خود سے شرم آ رہی تھی۔

اسے اپنی گزری ہوئی زندگی یاد آنے لگی۔ کاروباری سودے، بے ایمانیاں، یہی کھاتے، اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے اس کی بے رحمی، اور ان سب کا حاصل کیا تھا؟ وہ کسی کو بھی خوشی نہ دے سکی۔ کسی کو کیا دیتی، وہ تو خود بھی ہمیشہ خوشی سے محروم رہی۔ اس نے سوچا، وہ زندگی ایک ڈراؤنا خواب تھی۔ حقیقت تو وہ ہے، جو فلسطین آنے کے بعد اس پر گزری۔ حقیقت تو وہ آنسو ہیں، جو اس رات نزارتھ میں خود بخود اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے تھے۔ وہ محسوسات تھے جنہوں نے اس میدان میں جہاں صدیوں پہلے داؤد ایمان سے مسلح ہو کر ایک دیو کے مقابل آئے تھے، اس کے دل کو چھو لیا تھا۔ حقیقت وہ زمین تھی، جہاں مسیح کے قدم پڑے تھے۔ حقیقت وہ لمحہ تھا جب اس نے دریائے اردن کے مقام آغاز پر خدا سے دعا کی تھی کہ وہ اس کے گناہوں کو اپنی رحمت سے دھو ڈالے۔

اس نے پھر چاندنی میں چمکتے مرتان کو دیکھا.....

ہاں..... یہ نعمت جو مرتان میں ہے، موت کے فرشتے کو خالی ہاتھ لوٹانے کے لئے خدا کے حکم کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ وہ حیات بخش جو ہر ہے، جس کے عوض وہ شیطان کو اپنی روح تک فروخت کرنے پر آمادہ تھی۔ یہ وہ قدیم ترین غذا ہے جسے برگزیدہ بندوں کی نسلوں نے آج تک محفوظ رکھا ہے۔ خدا کے حکم سے اسے کھانے کے بعد وہ زیادہ جی

اس لمحے اس نے اس جینا میکلم کو تنقیدی نگاہوں سے دیکھا، جو دولت سمیٹے اور بڑھانے کی ہوس میں جیتی رہی تھی۔ وہ ایک گناہ گار عورت اور ناکام انسان تھی۔ فیض عورت، جس سے انسانیت کو، اس وطن کو جس نے اسے مرتبہ، دولت اور عزت دی تھی، اس وطن کے لوگوں کو..... کسی کو بھی تو کوئی فیض نہیں پہنچا تھا۔ اس سے توام کے باپ کو بھی کوئی فیض نہیں پہنچا تھا، جو اس سے بہت زیادہ محبت کرتا رہا تھا۔

اس لمحے پہلی بار اس نے خود کو صحیح روپ میں دیکھا۔ خود کو سمجھا۔ اس کے بار نے اسے دنیا کی ہر چیز سے بڑھ کر چاہا تھا لیکن اس نے اپنے باپ کی تمام خوبیاں اور قوتیں رد کر کے صرف اس کی خامیاں اور کمزوریاں اپنائی تھیں۔ زندگی نے اسے سب کچھ دیا، لیکن اس نے زندگی کو کچھ بھی نہیں دیا تھا۔ اس نے پوری زندگی ضائع کر دی تھی۔ اس نے نہ شادی کی، نہ کسی کو محبت دی، نہ انسانی نسل کو آگے بڑھایا۔ وہ ایک خشک، مقصد، بجز زندگی تھی جو اس نے گزاری تھی اور وہ اس خشک، بے مقصد اور بجز زندگی سے ابد تک چپے رہنا چاہتی تھی تاکہ وہی کچھ کرتی رہے، جو اب تک کرتی رہی ہے۔

اسے اپنے بھائی کا خیال آیا، جس نے محبت کی اور محبت پر اپنا سب کچھ قربان دیا۔ باپ کی دولت بھی، جو کروڑ پتی باپ کا بیٹا ہو کر ہنسی خوشی غربت کی زندگی گزارا، جس نے باپ کی نسل کو آگے بڑھایا، جس نے دولت مند بہن کے سامنے کبھی ہاتھ نہیں پھیلایا۔ خود محنت مزدوری تک کی۔ جس نے زندگی سے سچی محبت کی لیکن ہوس میں بہ جتلا نہیں ہوا۔ جو نہ مرنے کی عمر میں مر گیا لیکن اپنے پیچھے بہت کچھ چھوڑ گیا۔

اور ایک وہ تھی! اس نے خود اپنی زندگی تباہ کی اور اب اپنی بھتیجی کو بھی تباہ کر رہا ہے۔ اس نے راحیلہ کو بھی قید کر لیا۔ اس پر فطری زندگی اور اس کی خوشیوں، دروازے بند کر دیے۔ اس کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر کہ وہ تحفظ کی خواہاں تھی۔ راحیلہ کو غیر مشروط تحفظ بھی فراہم کر سکتی تھی۔ آخر وہ اس کا خون تھی۔ اس کے بھائی اولاد۔ اس کا حق تھا..... بہت کچھ اس کا حق تھا۔ لیکن اس کی سفاکی نے راحیلہ کو اجاڑ دینے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی۔

کوہ ہرمن کی چوٹی کی طرف سے ہوا چلی۔ جینا میکلم کا جسم تھر تھرا کر رہ گیا۔ تھر تھراہٹ نے اسے احساس دلایا کہ وہ ایک کمزور، بوڑھی اور تنہا عورت ہے۔ وہ ایک مقدس پہاڑ پر، ایک چٹان پر بیٹھی تھی اور اس کے پاس ایک مرتان تھا، جس میں شرجیا کا ست تھا۔ ایک وقت تھا، جب اسے یقین تھا کہ اس کا حصول اس کی دلی خواہش

وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ یہاں..... اس لمحے وہ اسے بہت قریب محسوس ہو رہا تھا۔ بہت قریب۔ اسے بچھتا ہونے لگا۔ کاش خدا اسے اتنا اختیار دے کہ وہ وقت کو پیچھے دھکیل کر وہاں تک لے جاسکے اور پھر اپنا فیصلہ تبدیل کرے۔ وہی تو وہ موقع تھا، جہاں اس نے خوشیاں گنوا کر ہوس کا روگ اپنا لیا تھا۔ لیکن اب..... اب تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

اس کا وجود ایک چیختی ہوئی اداسی سے بھر گیا۔ اس نے محبت بھی کی تو کیسی بے رنگ، بے روح، بے ثمر! لیکن اگلے ہی لمحے اسے احساس ہوا کہ وہ محبت مری نہیں تھی، اس کے اندر موجود تھی۔ اور اب کسی ہری بھری، ننھی کونیل کی طرح سراٹھا رہی تھی۔ بد صورتی فنا ہو رہی تھی۔ خوب صورتی ابھر رہی تھی۔

اسے اپنے اندر سکون کا، تقسیم کا احساس ہوا۔ ستاروں کی روشنی پیلی پڑنے لگی۔ کوہ ہرمن کی چوٹی اور بلند محسوس ہونے لگی۔ پھر سورج کی پیلی کرن چوٹی کو چھو کر منعکس ہوئی اور پلٹ کر جیسے چاروں طرف بکھر گئی۔ جینا کا جسم تھر تھرا ہوا۔ کیونکہ ابھی ایک لمحہ پہلے جو کچھ غیر واضح تھا، اب پوری طرح واضح ہو گیا تھا۔ اس نے ثمر حیات کے مرتبان کو دیکھا اور اس لمحے اس نے جان لیا کہ وہ ثمر اس کے لئے نہیں ہے۔ اسے ابدیت نہیں چاہئے، نہ آج..... نہ آئندہ کبھی۔

وہ اٹھی لیکن اپنے قدموں پر کھڑا رہنا اس کے لئے دشوار ہو گیا تھا۔ اسے سردی لگ رہی تھی لیکن سکون کا احساس ہر چیز پر حاوی تھا۔ اس نے شال کو اچھی طرح جسم پر لپیٹا اور گاؤں کی طرف چل دی۔

چند قدم آگے جانے کے بعد وہ رکی اور اس نے پلٹ کر چٹان پر رکھے مرتبان کو دیکھا۔ دھوپ پہاڑ کی چوٹی عبور کر کے اتر آئی تھی اور نیلگوں مرتبان زرد دھوپ میں نمایا ہوا تھا۔ اسے یاد آیا کہ بیت الجبل کے بڑوں نے اسے وہ ثمر حیات دے کر کتنے بڑے ایثار کا مظاہرہ کیا تھا۔ اب اگر وہ اسے استعمال نہیں کرنا چاہتی تو مناسب یہی تھا کہ ثمر حیات انہی لوگوں کو واپس کر دے۔ وہ پلٹی، اس نے واپس جا کر مرتبان اٹھایا اور گاؤں کی طرف چل دی۔



سکے گی۔ کتنا؟ سو سال؟ دو سو سال؟ اور اگر وہ ہر سو سال بعد آکر یہ تحفہ خدا حاصل کر لے تو کون جانے؟ ہزار سال..... دو ہزار سال.....

ستاروں کی اس روشن چھاؤں میں اس کے چہرے پر ایک ضد کا سایہ لہرایا۔ ہاں..... سب سے اہم بات یہ ہے کہ جینا کو زندہ رہنا چاہئے..... اسے مرنا نہیں چاہئے۔

لیکن اگلے ہی لمحے اس ستاروں بھرے منظر نے اسے پھر مسحور کر لیا۔ وہ آواز پھر گونجی۔ اس بار وہ بے لفظ تھی۔

اس نے سوچا، آخر اس بات کی کیا اہمیت ہے کہ جینا میکلم تا ابد جئے؟ وہ یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن میب ماضی کے عکس، زندگی کی ہوس کے جواز لمحہ بہ لمحہ ماند پڑتے جا رہے تھے۔ کیا وہ خدا کے اس تحفے کی مستحق تھی؟ کیا وہ اس قابل تھی کہ بیت الجبل کے نیک اور برگزیدہ بندوں پر اسے فوقیت دی جاتی؟ انہیں نظر انداز کر کے اسے منتخب کیا جاتا۔ یہ نعمت تو خدا کی خاص نعمت ہے، اس کے رحم کی علامت ہے اور موت کیا ہے؟ وہ تو خدا کے پاس پہنچنے کا نام ہے۔ ایک بار اس نے ڈاکٹر لیوی سے زندگی، موت اور خدا کے بارے میں اس کے نظریے معلوم کئے تھے۔ ڈاکٹر لیوی نے جواب دیا تھا، نہ میں زندگی میں یقین رکھتا ہوں نہ موت میں۔ میں تو اس سفر پر یقین رکھتا ہوں جو خدا نے ہمیں سونپا ہے اور اس سفر کی منزل خدا خود ہے۔ وہ ہمارے اندر ہے۔ ہم نہیں رہیں گے، وہ تب بھی موجود ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ میں کبھی خوفزدہ نہیں ہوتا، کبھی خود کو تنہا محسوس نہیں کرتا کیونکہ جب بھی سفر ختم ہو گا، میں اس سے جاملوں گا۔

جینا کو یوسف کا خیال آیا، جس نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ ثمر حیات کا مرتبان اس کے قبضے میں تھا۔ اس نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ آخری بار اسے خوشی کب ملی تھی۔ اسے یاد آگیا۔ نزار تھ میں۔ گیلی لی میں اور جودہ کی پہاڑیوں میں..... اور بین آئزک بھی اس کی خوشی تھا۔ وہ اسے ماں کہہ کر پکارتا تو وہ خوشی سے بھیگ بھیگ جاتی۔ اور خوشی فطرت کے حسین نظاروں میں پنہاں تھی۔ صنوبر کے درختوں کے جھنڈ میں تھی۔ بڑے اور روشن ستارے میں تھی۔

جینا کو وہ شخص یاد آیا جسے اس نے چاہا تھا۔ وہ تھوڑا سا عرصہ بہت خوش کن رہا تھا۔ وہ اس عرصے میں بہت خوش رہی تھی لیکن پھر اس نے اسے چھوڑ دیا..... دھکا دیا تھا اسے۔ اس لئے کہ وہ باپ کی دولت کو بڑھانا چاہتی تھی، اس سے دستبردار ہونے کا

راحیلہ خالی خالی نگاہوں سے اسے نکلتی رہی۔ وہ کوئی جواب نہ دے سکی۔  
 ”خیر چھوڑو۔ میرا خیال ہے، وجہ میں جانتا ہوں۔ پھر تم نے مرتبان کا کیا کیا؟“  
 ”میں نے پھوپھی میکلم کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے جو کو بلایا اور اسے کہا کہ وہ  
 بان پارزی لئی کو واپس دے آئے۔“  
 ”اور اس وقت تم خوفزدہ ہوئیں؟“  
 ”ہاں۔ جو کے چہرے پر تاثر ہی ایسا تھا۔“  
 ”کیا تاثر تھا وہ؟“  
 ”بہت خراب۔ میں بیان نہیں کر سکتی۔“  
 ”مس میکلم.....؟“  
 ”وہ سو رہی ہیں۔“

ڈاکٹر لیوی نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”اسی لئے تو میں نے روانگی ملتوی کر دی۔ مس  
 م کو آرام کی ضرورت ہے۔ خیر..... تم میرے ساتھ چلو لیکن اتنا کہہ دوں کہ حوصلہ  
 نہ۔ کچھ بھی سامنے آسکتا ہے۔ ایک فاضل ٹارچ ساتھ لے آنا۔“  
 راحیلہ اندر چلی گئی۔ ڈاکٹر لیوی سوچتا رہا۔ جینا نے گزشتہ شام اس سے ملاقات کی  
 لیکن شرمیلیات کے بارے میں اسے کچھ نہیں بتایا۔ اس وقت بین آنزک بھی اس کے  
 ساتھ تھا۔ راحیلہ بھی موجود تھی۔  
 ”ڈاکٹر لیوی..... مجھے ایک بات بتاؤ۔“ جینا نے بالکل اچانک کہا تھا۔ ”زندگی کا  
 مقصد ہے؟“  
 ”یہ زندگی ایک امتحان ہے۔ اس کا مقصد خدا کے احکامات کے مطابق زندگی بسر کرنا  
 ہے۔“

”اور خدا کے احکامات کیا ہیں؟“  
 ”وہ آسمانی کتابوں میں موجود ہیں۔“  
 ”کتابوں میں؟“  
 ”جی ہاں۔ آپ بھی جانتی ہیں کہ آسمانی کتاب کوئی ایک نہیں، چار ہیں۔“  
 ”اور تمہارے خیال میں.....؟“  
 ”میں آپ کا مطلب سمجھ رہا ہوں۔“ ڈاکٹر لیوی نے اس کی بات کاٹ دی۔ پھر  
 اٹھ بے بسی سے بین آنزک کی طرف دیکھا۔

روانگی کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ عین وقت پر پتا چلا کہ جوزف ڈیوڈسن  
 پراسرار طور پر غائب ہے۔ ڈاکٹر لیوی، خواتین کی اقامت گاہ پہنچا۔ اس نے راحیلہ کو  
 پکارا۔ ”مس ڈیشان!“  
 راحیلہ فوراً ہی دروازے پر آئی۔ ”کچھ پتا چلا؟“ اس نے پر تشویش لہجے میں  
 پوچھا۔

”یقین سے نہیں کہا جاسکتا۔“ ڈاکٹر لیوی نے جواب دیا۔ ”تم نے کہا تھا کہ جیسے ہی  
 کچھ معلوم ہو، تمہیں ضرور بتاؤں۔ سو میں آگیا ہوں۔ ابھی ایک مقامی لڑکے سے میری  
 بات ہوئی ہے۔ اسے بارزی لئی نے جوزف کی تلاش میں بھیجا تھا۔ وہ ابھی پہاڑ کی طرف  
 سے آیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ایک غار میں یا تو کوئی پاگل ہے، یا کوئی شیطان ہے، جو چیچ  
 چیچ کر رو رہا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس نے خود اسے دیکھا ہے۔ لڑکا بہت خوفزدہ تھا۔“  
 راحیلہ بے یقینی سے اسے دیکھتی رہی۔ ”لیکن جوزف پاگل تو نہیں ہے۔“  
 ”یہ ہمیں کسی بھی نوع کی پہلی اطلاع ملی ہے۔ میں بہر حال چھان بین تو کروں گا۔“  
 ”پلیز..... مجھے بھی ساتھ لے چلیں۔ ممکن ہے میں کسی کام آسکوں۔“  
 کچھ مدد کر سکوں۔“ راحیلہ کے لہجے میں التجا تھی۔  
 ”تو تم شیطانی قوتوں سے خوفزدہ نہیں ہو؟“

”میں صرف جو کے لئے خوفزدہ ہوں۔“ راحیلہ نے جواب دیا۔  
 ”اس خوف کی نوعیت کیا ہے؟“

”مجھے نہیں معلوم لیکن کل جب پھوپھی میکلم واپس آئیں، میں اسی وقت سے  
 خوفزدہ ہوں۔ وہ تھکی ہاری، بھرا ہوا مرتبان ساتھ لئے واپس آئی تھیں۔ ان کے ہاتھ پاؤں  
 سرد ہو رہے تھے۔ انہوں نے مجھے شرمیلیات دینا چاہا لیکن میں نے انکار کر دیا۔“  
 ”کیوں؟“



”مجھے اب صرف حق کی تلاش ہے۔ ڈاکٹر لیوی! میں سچ جانتا چاہتی ہوں۔“ بیونا نے مضبوط لہجے میں کہا۔

”میں بین آئزک کے سامنے بات نہیں کر سکتا۔“

”کیوں؟“ جینا اور مین آنزک نے بیک وقت پوچھا۔

”میں اس سوال کا جواب بھی بین آئزک کے سامنے نہیں دے سکتا۔“

”لیکن کیوں انکل؟“ اس بار بین آنزک بولا۔

”اس لئے کہ میں تمہارا آئیڈیل ہوں اور رہنا چاہتا ہوں۔ میں تمہیں تکلیف نہیں دینا چاہتا۔“

”لیکن حقیقت جتنا بہت ضروری ہے۔ خواہ اس کے لئے کتنی ہی تکلیف اٹھانی پڑے۔“ بین آئزک نے کہا۔

ڈاکٹر لیوی اسے کچھ دیر ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔ ”ضروری نہیں کہ جو مجھے حقیقت نظر آئے، تمہیں بھی سچ لگے۔“

”لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ میں آپ کو اپنا رہنما مانتا ہوں لیکن خود بھی سوچتا ہوں..... ذہن رکھتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے، لیکن تم ایک وعدہ کرو۔ مجھ سے تعلق کبھی نہیں توڑو گے۔“ ڈاکٹر لیوی کے لہجے میں عجب سی استقامت تھی۔

”یہ وعدہ لینے کی آپ کو ضرورت نہیں انکل۔ آپ ہی میرا خاندان ہیں۔ میں آپ کو کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔“

”میں تمہارے جواب کی منتظر ہوں ڈاکٹر لیوی۔“ جینا نے مداخلت کی۔

ڈاکٹر لیوی کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ جیسے کوئی بھولی بستی یاد کر رہا ہو۔ پھر اس نے سر اٹھایا۔ ”جو کچھ میں نے سمجھا اور حانا“ آپ کے اصرار پر بتا رہا ہوں۔ اس سے

میرا ایمان ہے کہ خدا کی ہدایت کے بغیر کچھ نہیں ہوتا۔  
میرا حال، میں نے بتا ہوا تھا کہ میں ایک بار برسوں پہلے بیت الجبل آتا تھا اور میں یہاں اس

لئے آیا تھا کہ میں نے سنا تھا، یہاں بارزی لئی نام کا ایک شخص رہتا ہے۔ ”وہ بین آزرک کی طرف مڑا۔ ”ہماری رگوں میں بھی بارزی لئی کا خون دوڑ رہا ہے۔“ کئی اشتیاق مجھے

بہاں کھینچ لیا تھا۔ یہاں آکر میں بارزی لئی سے ملا۔ وہ اس وقت بھی ویسا ہی تھا، جیسا اب ہے۔ اس کے مزاج میں ملا کا انکسار ہے۔ سب سے اچھے ملتا ہے جسے خود کتہ ہو۔ میں نے

جینا اور بین آئزک اس کی باتیں بڑے غور سے سنتے رہے تھے۔ اس کے خاموش  
نے کے بعد کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر جینا نے پوچھا۔ ”پھر تم نے کیا کیا ڈاکٹر لیوی؟“  
”میں نے اسی وقت اسلام قبول کر لیا تھا۔“ ڈاکٹر لیوی نے ہنسی کے بغیر اعتراف

اس بار خاموشی بہت گہری، بہت سنگین تھی۔ بین آئزک کسی گہری سوچ میں ڈوب  
یا تھا۔ ڈاکٹر لیوی اس کے چہرے کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ اسے حیرت تھی کہ اس  
مہتمم کا رد عمل اتنا شدید نہیں ہے، جتنی اسے توقع تھی۔

ہے بچایا جاتا رہے تو آدمی مرتے دم تک بچہ رہتا ہے۔ کبھی بڑا نہیں ہوتا۔  
 ڈاکٹر لیوی نے راحیلہ کو غور سے دیکھا۔ اس کے چہرے سے خوف اور تشویش جیسے  
 مل گئی تھی۔ اس کی جگہ مضبوطی نے لے لی تھی۔ ڈاکٹر لیوی کا تجربہ تھا کہ یہ تاثر اس  
 وقت خواتین کے چہروں پر نمایاں ہوتا ہے جب وہ پوری مضبوطی کے ساتھ کوئی اہم فیصلہ  
 لیتی ہیں۔

راحیلہ نے ڈاکٹر لیوی کا ہاتھ تھام لیا۔ اسی وقت تاریکی میں ایک سایہ ان کی طرف  
 ہلکا اندھیرے میں وہ صرف اس کی خوف سے بھری آنکھوں کی سفیدی ہی دیکھ سکے۔ وہ  
 نالی لڑکا تھا، جس نے انیس یوسف کی پہلی خبر دی تھی۔ ڈاکٹر لیوی نے اس سے اس کی  
 بان میں کہا۔ ”آؤ..... تم بس اس غار کی طرف اشارہ کر دینا۔ پھر تم جتنی تیزی سے  
 اہو وہاں سے بھاگ لیتا۔“ یہ کہہ کر اس نے لڑکے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ لڑکے نے  
 لدی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ بہت خوفزدہ دکھائی دے رہا تھا۔  
 وہ تینوں گاؤں سے دور اس راستے پر چل دئے جو تاریک غاروں کی طرف جاتا  
 تھا۔

یوسف کی گمشدگی کا پتا اس وقت چلا تھا جب ان کا قافلہ واپسی کے لئے تیار تھا۔  
 اپنے میزبانوں کو الوداع کہہ چکے تھے۔ اچانک راحیلہ نے توجہ دلائی کہ جوزف ڈیوڈسن  
 لڑ نہیں آ رہا ہے۔ کسی کو یہ یاد نہیں آ رہا تھا کہ اس نے اسے آخری بار کب اور کہاں  
 بھٹا تھا۔

ان کی اقامت گاہوں کی تلاشی لی گئی لیکن یوسف موجود نہیں تھا۔ اسے پکارا  
 یا..... آوازیں دی گئیں لیکن کچھ نتیجہ نہ نکلا..... ایوری، شلومو اور بین آنزک  
 ی اسے تلاش نہ کر سکے تو روانگی ملتوی کر دی گئی۔

جیسے جیسے وقت گزرتا گیا ڈاکٹر لیوی کو یقین ہوتا گیا کہ جوزف کے ساتھ کوئی  
 بیڑی ہوئی ہے۔ اسے جوزف کے مس میکلیم سے معاہدے کے متعلق کچھ علم نہیں تھا  
 لیکن اتنا اندازہ بہر حال تھا کہ جوزف کی کامیابی جینا میکلیم کے شرحیات کھانے میں مضمر  
 ہے۔ اس اعتبار سے جوزف کامیابی کے بہت قریب پہنچ کر ہار گیا تھا۔ ڈاکٹر لیوی کا نظریہ تھا  
 کہ خدا کو انسان کو سزا دینے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ بدی خود تباہی کا سامان ہوتی ہے۔  
 دی جب خطا کرتا ہے تو خود اپنے اندر اپنی سزا کا بیج بو دیتا ہے۔ وقت آنے پر اسے وہ  
 مل کاٹی پڑتی ہے۔

”تو تمہارے خیال میں بارزی لئی کا استدلال درست تھا؟ جینا نے پوچھا۔  
 ”اب آپ نے بھی اس کا استدلال سن لیا ہے۔ فیصلہ خود کیجئے۔“ ڈاکٹر لیوی۔  
 جواب دیا۔  
 ”مجھے ایک بات بتائیں۔ آپ نے یہ بات مجھے پہلے ہی کیوں نہیں بتادی.....  
 بین آنزک نے کہا۔

”مناسب وقت پر بتانے کا ارادہ تھا۔“ ڈاکٹر لیوی نے کہا۔ ”تمہارے آتے ہی  
 نے سوچا کہ تمہیں پہلی بار وطن..... گھر میسر آیا ہے۔ اگر میں تمہیں حقیقت بتاؤں  
 اول تو وہ تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ کیونکہ تم اپنا وطن..... اپنا گھر چھوڑنا نہ  
 چاہو گے۔ اور اگر تم نے میری بات سمجھ لی تو گھر آتے ہی بے گھری کے دکھ میں مبتلا  
 جاؤ گے۔ یہ میں نہیں چاہتا تھا۔ خود میں نے یہاں آنے کے بعد جو کچھ دیکھا ہے، اس۔  
 مجھے سب کچھ چھوڑ کر سبیاں ترکاریاں کاشت کرنے پر مجبور کر دیا۔ صدیوں کے۔  
 گھروں کو یہاں آتے ہی رواداری اور انسانیت نوازی ہونا چاہئے تھی تاکہ آنے والے  
 وقتوں میں امن اور خوشحالی کی فصل کاٹی جاسکے لیکن انہوں نے نفرتیں اور غرور کے  
 بوئے اور اب دہشت گردی کی فصل تیار کھڑی ہے۔ یہاں کوئی کسی کو معقول بات نہ  
 سمجھا سکتا۔“

”ایک بات تو ہے ڈاکٹر لیوی۔“ جینا نے کہا۔ ”اپنے آباؤ اجداد کا مذہب چھوڑنا  
 بہت مشکل کام ہے۔“

”خرابی صرف اتنی ہے۔“ ڈاکٹر لیوی نے کہا۔ ”حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ خدا  
 حکم کے سامنے انا کا کوئی کام نہیں.....“

راحیلہ گرم کوٹ پہنے ہاتھ میں برقی لائٹیں لئے باہر نکلی تو ڈاکٹر لیوی بری طر  
 چونکا۔ اسے راحیلہ پر ترس آنے لگا۔ لڑکی جوزف سے محبت کرتی تھی لیکن اس محبت  
 اعتراف خود سے بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس لئے کہ اس کی دانست میں جوزف بدی  
 نمائندہ تھا۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ جوزف برا نہیں تھا۔ محض بے وقوف تھا۔ بے وقوف  
 کمزور اور بھٹکا ہوا اور اگر وہ اس سے محبت کرتی تھی تو اس کے لئے ضروری تھا کہ حقاً  
 کا سامنا کرے۔ ڈاکٹر لیوی کو راحیلہ پر ترس آ رہا تھا..... اس پر کہ اب اس کے ساتھ  
 کیا آئے گا۔ لیکن وہ اسے بچانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ یہ انسان کا بنیادی حق ہوتا ہے۔  
 اذیتوں سے گزر کر کچھ سیکھنا..... جاننا..... ارتقاء کے عمل سے گزرتا..... اذیتوں

پلوں گا۔“ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر مضبوط ڈوری کا لچھا اور ایک گیلی میخ نکالی۔ میخ کو غار کے دہانے کے قریب ایک چٹان میں گاڑ کر اس میں ڈوری کا ایک سرا مضبوطی سے بچ میں باندھ دیا۔

”آپ تو ہر چیز کا خیال رکھتے ہیں۔“ راحیلہ نے پرستاش لہجے میں کہا۔  
وہ مسکرایا۔ ”غار میں اندھا دھند کبھی نہیں اترنا چاہئے۔ واپسی کا راستہ ہمیشہ محفوظ رکھنا چاہئے۔“

”بے چارہ جو!“ راحیلہ بولی۔ ”اگر وہ اس غار میں گیا ہے تو اس نے اس بات کا خیال نہیں رکھا۔“

”ہاں۔ یہ تو ہے۔“

”تو جلدی کریں نا.....“

”جلد بازی بھی نہیں کرنی چاہئے۔ بہت نقصان دہ ہے۔“

ڈاکٹر لیوی نے بڑی احتیاط سے غار کے دہانے کی گر تھامی اور اندر اتر گیا۔ راحیلہ اس کے پیچھے تھی۔ وہ تنگ ڈھلوانی راستے پر سر جھکائے چل دئے۔ جیسے جیسے وہ آگے بڑھے، ہوا بھاری ہوتی گئی۔ سانس لینا دو بھر ہو رہا تھا۔

کوئی چار سو گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ڈاکٹر لیوی ٹھنکا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر راحیلہ کو رکنے کا اشارہ کیا۔ انداز ایسا تھا جیسے سماعت پر زور دے رہا ہو۔ سرنگ کے اس طرف..... دور سے گھٹی گھٹی سی آواز سنائی دی۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ آواز انسانی ہے یا کسی جانور کی۔ ”میرا خیال ہے کہ ہم اپنی تلاش کے انجام تک پہنچ گئے ہیں۔“ ڈاکٹر لیوی نے گمبیر لہجے میں کہا۔ ”اپنا حوصلہ مجتمع کر لو۔“

راحیلہ اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔

وہ پھر آگے بڑھنے لگے۔ سرنگ بتدریج اتر رہی تھی۔ کچھ آگے جا کر وہ اچانک اپنی سمت مڑ گئی۔ اب وہ ایک چھوٹے سے کمرے میں تھے۔

ڈاکٹر لیوی کی لائٹن کی زرد روشنی میں یوسف نظر آیا۔ وہ ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل بیٹھا تھا۔ اس کا سر تقریباً زمین سے لگا ہوا تھا۔ وہ ایک ایسا باکسر لگ رہا تھا جسے حریف بالکر کے گھونسوں نے زمین چاٹنے پر مجبور کر دیا ہو۔ اس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے، ہاتھ جگہ جگہ سے چھلے ہوئے تھے اور خشک خون سے سیاہ ہو رہے تھے۔ ایک آنکھ کے اوپر کٹ لگا ہوا تھا۔ خون بہہ کر اس کے رخساروں اور گردن تک آیا تھا۔ اس کے متورم

ڈاکٹر لیوی کو خدشہ تھا کہ جوزف نے جب شرحیات کے لئے جینا کے استرا واکے متعلق سنا ہو گا تو خود کو ختم کرنے کے متعلق سوچا ہو گا لیکن لڑکے نے جب اسے آکر بتایا کہ غار میں کوئی دھاڑیں مار مار کر رو رہا ہے تو اس نے سوچا کہ موت سے بدتر کوئی ایسا پیش آیا ہے۔

کوئی میں منٹ بعد وہ غاروں کے علاقے میں پہنچے۔ لڑکا اب اتنا خوفزدہ تھا کہ ڈاکٹر لیوی سے چمٹا جا رہا تھا۔ وہ پانچ بڑے غاروں کے سامنے سے گزرے۔ لڑکے نے اوپر ایک چھوٹے غار کی طرف اشارہ کیا۔ اس کا دہانہ اتنا تنگ تھا کہ اس میں بیٹھ کر ہی داخل ہوا جا سکتا تھا۔

انہوں نے قریب جا کر دیکھا۔ پہلی نظر میں وہ کسی غار کا دہانہ ہی معلوم ہوا۔ ڈاکٹر لیوی نے بیٹھ کر لائٹن اندر لٹکائی تو پتا چلا کہ وہ تنگ اور نیچا ڈھلوانی راستہ ہے۔ ڈاکٹر لیوی نے لڑکے سے پوچھا۔ ”تمہیں یقین ہے؟“ لڑکے نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ڈاکٹر لیوی نے باہر بیٹھے بیٹھے یوسف کو پکارا۔ ”جوزف..... جوزف.....“  
راحیلہ بھی گھٹنوں کے بل اس کے پاس بیٹھ گئی اور اس کی آواز میں آواز ملانے لگی۔  
اندر سے انہیں کوئی آواز نہ آئی لیکن لڑکے کی سماعت زیادہ تیز تھی۔ اس کے چہرے پر اچانک دہشت کا تاثر ابھرا اور وہ پلٹ کر گاؤں کی طرف یوں بھاگا جیسے اس کے پیچھے بلائیں لگ گئی ہوں۔

”یہ کیا؟ مجھے تو کچھ سنائی نہیں دیا۔“ راحیلہ نے کہا۔

”فی الحال ہمارے پاس کوئی اور سراغ بھی تو نہیں۔ تم ہمیں رکو..... میں اندر جا کر دیکھتا ہوں۔“

”میں بھی ساتھ چلوں گی۔“

”دیکھو۔ کسی غار میں داخل ہونے کے لئے اور طرح کے حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔“ ڈاکٹر لیوی نے اسے سمجھایا۔ ”بہت سے لوگوں کو تنگ جگہیں، گھٹن اور تاریکی راس نہیں آتی۔“

”میرے پاس حوصلہ نہیں، صرف عزم و ارادہ ہے۔“ راحیلہ نے جواب دیا۔ ”اگر وہ اندر ہے تو اسے مدد کی ضرورت بھی ہوگی۔“

ڈاکٹر لیوی نے سر کو تھپہی جنبش دی۔ ”ابھی تم اپنی لائٹن روشن نہ کرنا۔ بلاوجہ بیک وقت دو لائٹنیں روشن کرنا مناسب نہیں اور میرے قریب رہنا۔ آگے آگے میں

”میں..... میں یوسف عالم..... میں اس بد معاش فراڈیے سے عاجز ہوں۔ مجھے اس کی صورت، اس کی آواز زہر لگتی ہے اور اب میں سینکڑوں سال اسے بھگتوں گا۔“

ڈاکٹر لیوی نے سر کو تھپسی جنبش دی۔ ”لیکن روئے زمین پر ایک لمحے کی سچی شرمندگی ہزاروں سال کی.....“

”شرمندہ کون کبخت ہو رہا ہے؟“ یوسف نے دہاڑ کر اس کی بات کٹ دی۔

”مجھے کوئی پشیمانی نہیں۔ افسوس ہے..... اس بات کا کہ یوسف عالم بدبودار آدمی ہے اور جب میں پیتا ہوں تو بھول جاتا ہوں کہ میں کون ہوں۔ اس لئے میں بے جا رہا ہوں اور بھنٹی آنکھوں والی، یہ جام تمہاری اور تمہارے چاکلیٹ سولجر کی صحت کے نام۔“ وہ راحیلہ کی طرف مڑا۔ اس نے بوتل کھولی اور منہ سے لگائی۔ لیکن بوتل میں کچھ بھی نہیں تھا۔ ”ہائے..... اب میں کیا کروں؟“ وہ دردناک لہجے میں چلایا۔ اس نے بوتل سامنے دیوار پر دے ماری۔ ”اب میرا نشہ اکھڑ رہا ہے۔ مجھے یاد آ رہا ہے کہ میں غلیظ یوسف عالم ہوں۔“ وہ فرش پر ڈھے گیا۔

راحیلہ بڑھی اور اس کے پاس گھٹنوں کے بل جا بیٹھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ چند لمحے تو اس کی سمجھ میں ہی نہ آیا کہ کیا کہے، کیا کرے۔

”تو تم نے پورا مرتبان صاف کر دیا ثمرحیات کا؟“ ڈاکٹر لیوی نے نرم لہجے میں پوچھا۔

”پورا مرتبان صاف کر دیا ثمرحیات کا۔“ یوسف نے اس کی نقل اتاری۔ ”تو اور کیا کرتا؟ میں عقل مند آدمی ہوں۔ ہوں کہ نہیں؟ اب ایسا بھی نہیں کہ اس پورے معاملے میں کوئی مجھے ہی بے وقوف ثابت کر دے۔“

”وہ کیسے یوسف عالم؟“ ڈاکٹر لیوی نے اسے اس کے اصل نام سے پکارا، جو اس نے نشے کے عالم میں خود عیاں کر دیا تھا۔

”دیکھو..... مس میکلم نے ثمرحیات نہیں کھایا۔ تو اب مجھے کیا ملے گا؟ کچھ نہیں۔ اس معاملے میں بھی کو کچھ نہ کچھ ملا ہے۔ ہے نا؟ بھنٹی آنکھوں والی کو چاکلیٹ سولجر مل گیا۔ جینا میکلم کو مذہب مل گیا۔ بین آئزک کو وطن اور گھر مل گیا۔ تم اپنی سبزیوں کی طرف واپس چلے جاؤ گے۔ میں بے وقوف خالی ہاتھ رہ گیا۔“

”ہاں یوسف! بے وقوف تو تم ہو۔“

”تھا۔ اب نہیں ہوں۔ میں نے ثمرحیات کھالیا ہے۔ اب میں پوری دنیا کا بادشاہ

ہونٹ سیاہ ہو رہے تھے، وہ بائیں ہاتھ پر زور ڈال کر اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سیدھے ہاتھ میں اس نے ایک بوتل کو پکڑا ہوا تھا۔ ایک ٹوٹی ہوئی برقی لائٹیں اس کے پیروں کے پاس پڑی تھی۔

”جو.....“ راحیلہ نے چیخ کر اسے پکارا اور آگے بڑھنے کی کوشش کی لیکن ڈاکٹر لیوی نے اسے روک لیا۔

یوسف نے آہستہ سے سر گھما کر انہیں دیکھا لیکن اس کی آنکھوں میں دھندلاہٹ تھی۔ اس نے آہستہ سے خود کو اٹھایا اور غار کے فرش پر بیٹھ گیا۔

”جو..... تم زخمی ہو۔“ راحیلہ آگے بڑھی۔ اس بار ڈاکٹر لیوی نے اسے نہیں روکا۔

یوسف نے اچانک اسے پہچان لیا۔ ”تم کیا چاہتی ہو؟“ اس نے پاگلوں کی طرح چیخ کر کہا۔ چھوٹے سے کمرے میں اس کی آواز گونجتی رہی۔ ”تم ثمرحیات کے چکر میں میرے پیچھے آئی ہو نا۔ لیکن اب کچھ بھی نہیں بچا بھنٹی آنکھوں والی حینہ۔ وہ سب تو میں کھا گیا۔ تم اپنے چاکلیٹ سولجر کے پاس واپس چلی جاؤ۔“

راحیلہ نے پلٹ کر ڈاکٹر لیوی کو ملتجیانہ نگاہوں سے دیکھا۔ وہ اچانک سہمی ہوئی چھوٹی سی بچی بن گئی تھی۔ ”یہ..... یہ تو دیوانہ ہو گیا ہے! ہوش و حواس کھو بیٹھا ہے اب کیا کیا جائے؟“

ڈاکٹر لیوی نے آگے بڑھ کر روشنی کا رخ یوسف کی آنکھوں کی طرف کر دیا۔ چند لمحے وہ اس کی آنکھوں کے ڈھیلوں کو دیکھتا رہا، پھر اس نے گہری گہری سانسیں لیں۔

”نہیں۔ یہ پاگل نہیں ہوا۔“ اس نے کہا۔ ”یہ نشے میں دھت ہے۔“

”ہاں..... میں نے پی ہے اور خوب پی ہے مسخرے اسکالر۔“ یوسف نے چیخ کر کہا۔ ”اور تمہیں معلوم ہے وہ ثمرحیات کہاں ہے۔ وہ میرے پیٹ میں ہے۔ میں نے پورا پھل کھالیا، اب میں مر نہیں سکتا، اس لئے پی رہا ہوں۔ اور پیوں گا۔“

”لیکن عام آدمی کو اگر یہ معلوم ہو کہ وہ موت سے محفوظ ہو گیا ہے تو وہ خوش ہوتا ہے۔“ ڈاکٹر لیوی نے کہا۔

یوسف ہنسنے لگا۔ ”میں عام آدمی نہیں۔ اب تو میں کم از کم پانچ سو سال جیوں گا۔“

”تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟“

یوسف نے انگارا آنکھوں سے اسے گھور کر دیکھا اور حلق کے بل چلایا۔

ابتدا سے بات کرتے ہیں۔ یہ بتاؤ یہ ثمرحیات تمہیں کیسے ملا؟

”راحیلہ نے مجھے دیا تھا کہ بارزی لئی کو واپس کر دوں۔ اس نے کہا تھا کہ جینا کو اب اس کی ضرورت نہیں۔ اس طرح میں پھنسا اس مصیبت میں۔“

”تو تم نے امانت میں خیانت کی..... چوری کی؟“

”یوں کہو کہ میں نے رکھ لیا۔ اس سے بستی والوں کو کیا فرق پڑتا؟ وہ تو یہ تحفہ جینا بیکم کو دے ہی چکے تھے۔ یعنی وہ اس سے دستبردار ہو چکے تھے اور جینا نے اسے ٹھکرا دیا تھا۔ اب میں نے رکھ لیا تو یہ چوری کہاں سے ہو گئی؟“

ڈاکٹر لیوی چند لمحے سوچتا رہا۔ ”منطقی اعتبار سے تمہاری بات کو تسلیم کیا جاسکتا ہے۔“ بالآخر وہ بولا۔ ”لیکن مذہبی اور اخلاقی اعتبار سے تمہارا یہ فعل درست نہیں۔ ویسے سلمان تو خیانت کو بہت برا سمجھتے ہیں۔ وہ جس پیغمبر کی امت ہیں، وہ ایمین تھے۔“

یوسف نے شرمندگی سے سر جھکا لیا لیکن خاموش رہا۔

”لیکن بہر حال تم سے پہلے اور جینا کے بعد ایک شخصیت اور بھی تھی، جس نے اس تحفے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔“

”وہ کون ہے؟“ یوسف نے چونک کر پوچھا۔

”راحیلہ۔“ ڈاکٹر لیوی نے جواب دیا۔

”راحیلہ!“ یوسف نے حیرت سے دہرایا۔ پھر اس نے راحیلہ کو دیکھا جو سر جھکائے ٹہنی تھی۔

”ہاں، کل صبح مس میکم نہاڑ سے واپس آئی تو یہ فیصلہ کر چکی تھی کہ وہ ثمرحیات دہاتھ بھی نہیں لگائے گی۔ اس نے راحیلہ کو ثمرحیات دینا چاہا۔ یہ بہت بڑی ترغیب تھی۔ خاص طور پر ایک عورت کے لئے۔ عورتیں اپنے حسن اور جوانی کو سدا بہار دیکھنے یا ہمیشہ آرزو مند ہوتی ہیں لیکن پھر راحیلہ نے اس ترغیب کو ناکام بنا دیا۔“

یوسف نے سر جھٹکا۔ ”لیکن کیوں؟“ اس نے پوچھا۔ ”راحیلہ نے اسے استعمال ہوں نہیں کر لیا؟“

”اس لئے کہ وہ اس دنیا کو قبول نہیں کر سکتی، جس میں سو سال بعد اس کا محبوب وجود نہ ہو۔ تم موجود نہ ہو۔“

یوسف نے جھٹکے سے سر گھما کر راحیلہ کو دیکھا اور پھر دوبارہ ڈاکٹر لیوی کی طرف زبہ ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ”تم پاگل ہو گئے ہو کیا؟“ وہ غرایا۔

بن جاؤں گا۔“ یوسف نے پلکیں جھپکائیں اور نفی میں سر ہلایا۔ اس بار وہ بولا تو اس کی آواز دھیمی تھی اور لہجے میں دہشت تھی۔ ”مگر اب مجھے ہمیشہ یوسف عالم کے ساتھ رہنا ہو گا۔ ہر صبح آئینے میں اس منحوس کی صورت دیکھنی پڑے گی۔ دن رات اسے بھگتنا پڑے گا اور میں اس سے خوفزدہ ہوں۔ میرے خدا..... میں واقعی خوفزدہ ہوں۔“ اس نے ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔ اس کا بدن لرز رہا تھا۔

راحیلہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”یوسف..... یوسف..... اتنا پریشان نہ ہو۔“

یوسف نے اسے جھٹک دیا۔ ”ٹھیک ہے..... دیکھو اور مجھ پر ہنسو۔ یوسف عالم اور خوفزدہ! یوسف عالم اور پریشان! کتنا بڑا مذاق ہے یہ۔ مجھے تو خود بھی ہنسی آرہی ہے۔ آؤ..... ہم سب مل کر نہیں۔“ وہ خوفناک انداز میں ہنسا اور پھر گڑ گڑانے لگا۔ ”خدا کے لئے۔ چلے جاؤ اور مجھے تنہا چھوڑ دو۔ اب تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔“

راحیلہ نے اس کے چہلے ہوئے ہاتھ کو سہلایا۔ وہ تیز، گیلی چٹانوں کی رگڑ کا نتیجہ تھا۔ وہ اندھیرے میں، خود سے گھبرایا ہوا غار میں داخل ہوا تو کئی بار چٹانوں سے رگڑ لگی ہو گی۔ وہ زخم خوردہ جانور کی طرح سب کی نگاہوں سے چھپتا پھر رہا ہو گا۔ یہ سوچ کر راحیلہ کا دل اس کے لئے تڑپ اٹھا۔ ”یوسف..... کوئی نہیں ہنس رہا ہے تم پر.....“

”اے..... یہ یوسف کسے کہہ رہی ہو؟“ یوسف بری طرح اچھلا۔ ”میں جوزف ہوں..... جوزف ڈیوڈسن۔“

”اب چھپانے کا کیا فائدہ؟“ ڈاکٹر لیوی نے کہا۔ ”تم خود کئی بار بتا چکے ہو کہ تم یوسف عالم ہو۔ ویسے مجھے شک تو پہلے ہی سے تھا۔“

”تم میری بات سنو.....“ راحیلہ نے مضطربانہ کہا۔ پھر ڈاکٹر لیوی کی طرف مڑی۔ ”آپ اس کی کچھ مدد نہیں کر سکتے؟ آپ تو سمجھ رہے ہیں کہ اسے کیا ہوا ہے۔ آپ ہی کچھ کریں نا!“ اس کے لہجے میں التجا تھی۔

”میں کوشش کر سکتا ہوں۔“ ڈاکٹر لیوی نے کہا اور بڑھ کر ان دونوں کے بہت قریب آکھڑا ہوا۔ اس کی نگاہوں میں دونوں کے لئے ہمدردی تھی۔ وہ جھک کر ان کے قریب بیٹھ گیا۔ اس نے لائین کا رخ بدل دیا تاکہ روشنی براہ راست یوسف کے چہرے پر نہ پڑے۔ اس نے نرم لیکن مستحکم لہجے میں یوسف کو مخاطب کیا۔ ”دیکھو یوسف.....“

”یہ..... یہ تو مجھ سے نفرت کرتی ہے۔“

راحیلہ خاموش بیٹھی رہی۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد ڈاکٹر لیوی نے پھر یوسف کو مخاطب کیا۔ ”تو بہر حال تم نے شرحیات خود کھالیا۔ کیوں؟“

”وجہ میں بتا چکا ہوں۔“

”ممکن ہے کوئی اور وجہ بھی ہو۔“

”میرے پاس کچھ بچا ہی نہیں تھا۔ وہاں گھاٹی میں بین آنرک پھسلا اور ہم سمجھے کہ اسے گولی لگی ہے۔ تو میں نے راحیلہ کا رد عمل دیکھ.....“

”عجیب بات ہے۔ لوگ محبت میں ناکام ہو کر خود کشی تو کرتے ہیں لیکن مایوس ہو کر آب حیات کوئی نہیں پیت۔“

”اے..... تم کے بے وقوف بنارہے ہو!“ یوسف نے چڑ کر کہا۔ ”مضحکہ اڑا رہے ہو میرا۔“

”ہاں۔ اور یہ ضروری ہے۔ تمہاری بچت اسی میں ہے کہ اپنی مضحکہ خیزی کو خود سمجھ لو۔ یہ وقت ہر شخص پر آتا ہے۔“

یوسف نے سر جھٹکا۔ ”میں سمجھا نہیں!“

”چھوڑو، بعد میں سمجھا دوں گا۔ یہ بتاؤ کہ تم نے کتنا شرحیات کھایا؟“

”پورا..... تمام کا تمام۔“

”اور تمہارے خیال میں اس کا کیا نتیجہ نکلے گا؟“

”وہی جو دوسروں پر نکلا آیا ہے۔ بارزی لئی پر..... اٹلکے پر..... یعنی میں تین چار سو سال جیوں گا۔“

”تمہیں اب بھی اس پر یقین ہے؟“

یوسف کی نگاہوں کی دھندلاہٹ اب کم ہو رہی تھی۔ اس نے نظریں جما کر ڈاکٹر لیوی کو دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں ایسی اذیت اور مایوسی تھی کہ راحیلہ کا دل کٹنے لگا۔

”ہاں۔“ آخر کار اس نے جواب دیا۔ ”کیا یہ درست نہیں؟“

”نہیں۔“ ڈاکٹر لیوی نے کہا۔

غار کی اس دبیز خاموشی میں یوسف کی کلائی پر بندھی گھڑی کی ٹک ٹک بہت بلند آہنگ معلوم ہو رہی تھی۔ یوسف کی سمجھ میں جیسے بات آئی ہی نہیں تھی اور جب بات اس کی سمجھ میں آئی تو وہ چلا یا۔ ”کیا..... کیا کیا تم نے!“

”میں نے کہا۔ ایسا نہیں ہے۔“ ڈاکٹر نے ہموار لہجے میں کہا۔ ”یہ سمجھنا درست نہیں ہے۔“

شاک صرف یوسف کو نہیں لگا، راحیلہ بھی حیران رہ گئی۔ ”ڈاکٹر لیوی! آپ مذاق کر رہے ہیں؟“ راحیلہ نے پوچھا۔

”نہیں۔ البتہ بعد میں ہم اس سلسلے میں مذاق ضرور کریں گے۔ خوب نہیں گے اس پر۔“

یوسف بے یقینی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ”کیا مطلب؟ یہ درست نہیں ہے.....“

”میں یہ بتا رہا تھا کہ تم چاہے جتنا شرحیات کھا لو..... جتنا کھایا ہے، اس سے دگنا کھا لو۔ ہر روز کھاؤ، پورے سال کھاؤ، چاہے تمام عمر کھاؤ۔ جتنی زندگی تمہیں ملی ہے، اتنا ہی جیو گے۔ اللہ نے تمہاری موت کا جو دن معین کیا ہے، موت اسی دن آئے گی۔ شرحیات زندگی میں کچھ دن تو کجا، ایک سیکنڈ کا اضافہ بھی نہیں کر سکے گا۔“

یوسف کی آنکھوں میں طمانیت لہرائی لیکن فوراً ہی اس کی جگہ شک ابھر آیا۔ ”یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ مجھے بسلانے کی کوشش کر رہے ہو۔ تم ہمیں یہاں لائے، تم نے جینا کو بتایا کہ یہاں شرحیات کا پھل اب تک محفوظ ہے.....“

”دراصل تم یہی سنتا چاہتے تھے۔ میں نے یہ نہیں کہا ہو گا۔ میں نے مس میکم کو بتایا کہ بیت الجبل میں بہت معمر لوگ موجود ہیں اور روایت ہے کہ ان لوگوں نے شرحیات کے پھل کو محفوظ کر لیا ہے۔ لیکن شرحیات تو کبھی تھابی نہیں، محفوظ کہاں سے کیا جا سکتا۔“

”تو یہ مہم ہی جعلی تھی؟“

”بارزی لئی کو چھوڑ کر بیت الجبل کے تمام لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ وہ شرحیات ہے..... زندگی کو محفوظ رکھنے والا جو ہر۔ بارزی لئی تو ہم پرست نہیں۔ وہ بہت دانشمند آدمی ہے۔ اس کا رشتہ دار ہونے کے ناتے میں بھی تو ہم پرست نہیں۔“ ڈاکٹر لیوی سکرایا۔

”کاش مجھے معلوم ہو جائے کہ حقیقت کیا ہے!“ یوسف بڑبڑایا۔ ”تم کس چیز پر یقین رکھتے ہو؟“

”اب بات چلی ہے تو بتا دوں کہ میں اللہ پر یقین رکھتا ہوں اور اللہ پر یقین رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ توہمات اور خرافات کو یکسر مسترد کر دیا جائے۔ انسان کے دل و



ذہن میں دونوں کے لئے جگہ نہیں ہو سکتی۔ ایک پر یقین کرنے کے لئے دوسرے کو چھوڑنا پڑتا ہے۔“

”اللہ پر تو میرا بھی ایمان ہے۔“ یوسف نے جلدی سے کہا۔ ”اور میں تو تمہات اور خرافات پر صرف ضرورتاً یقین کر بیٹھا تھا۔ البتہ آخر میں مایوسی نے مجھے بھٹکا دیا۔“

”تو پھر مسئلہ ہی کوئی نہیں رہا۔“

”اب میں کیا کروں؟“

”خدا سے رجوع کرو، توبہ کرو، رہنمائی چاہو اور اس کے احکامات کے مطابق زندگی گزارنے کا عہد کرو۔“

یوسف نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔ ”اے اللہ..... میری مدد کر۔“  
ڈاکٹر لیوی اٹھ کھڑا ہوا۔ ”ہاں..... وہ تمہاری مدد ضرور کرے گا“ ہمیشہ کرتا ہے‘  
اس نے کبھی کسی کو مایوس نہیں کیا۔ شب بخیر۔“

سرنگ میں مڑنے سے پہلے ڈاکٹر لیوی نے مسکرا کر انہیں دیکھا پھر وہ مڑ کر ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ چند لمحوں میں اس کے قدموں کی آہٹیں بھی معدوم ہو گئیں۔ راحیلہ نے اپنی لائین روشن کر لی۔ یوسف نے کہا: ”اگر ڈاکٹر لیوی نے سچ کہا ہے تو میرا دنیا کا سب سے بڑا احمق ہوں۔“

”ثمرحیات پر تو ہم سب کو یقین تھا۔ تمہیں، مجھے، پھوہی میکم کو۔ ڈاکٹر لیوی کا مضحکہ خیزی سے یہی مطلب تھا۔ ہم سب پختہ کار، پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ ہمیں پہلے ہی سمجھ لیتا چاہئے تھا لیکن خواہشیں آدمی کو کمزور کر دیتی ہیں۔ عقل کی چلنے ہی نہیں دیتیں۔ اب دیکھ لو، پھوہی میکم نے ثمرحیات ملنے کے بعد اسے ٹھکرا دیا۔“

”اور بین آنزک؟“

”اس کے متعلق کیا پوچھنا چاہتے ہو تم؟“

”میں سمجھتا تھا، تم اور وہ..... میرا مطلب ہے، تم اس سے محبت.....“

”میں تو یہاں موجود ہوں تمہارے ساتھ۔ ہے کہ نہیں؟“

یوسف نے بے دھیانی سے سر ہلادیا، جیسے اس کی بات سنی ہی نہ ہو۔ پھر وہ جھوٹے  
 منگلا۔ ”میرے خدا..... میری طبیعت گبڑ رہی ہے۔ خدا کے لئے..... ہمیں رہنا  
 میرے ساتھ..... کہیں میں مرقو نہیں رہا ہوں۔ یا امرتو نہیں ہو رہا ہوں۔ ڈاکٹر لیو  
 نے کہا کما تھا..... ذرا دہرائاتو.....“

راحیلہ نے ڈاکٹر لیوی کی بات دہرا دی۔ پھر اس نے کہا۔ ”تمہیں کچھ نہیں ہو گا  
 ہف.....“

یوسف لڑکھڑاتا ہوا اٹھا۔ راحیلہ اسے سہارا دے ہوئے تھی۔ یوسف نے قے کر دی۔ بدبو اتنی تھی کہ خود یوسف کا دماغ پھٹنے لگا لیکن راحیلہ بدستور اسے سہارا دے کھڑی تھی۔ وہ پہلا موقع تھا کہ یوسف کو راحیلہ کی محبت کا یقین آیا اور خود اسے بھی راحیلہ پر وٹ کر پیار آیا۔

زرا دیر بعد طبیعت کچھ سنبھلی تو اسے ایک اور خیال نے لرزادیا۔ ”تو میری پول کھل گئی؟“ اس نے پوچھا۔ ”ڈاکٹر لیوی کو معلوم ہو گیا کہ میں جوزف ڈیوڈسن نہیں، یوسف عالم ہوں۔“

راحیلہ نے اثبات میں سر ہلادیا۔

”اب کیا کروں؟ اسرائیل میں تو ڈاکٹر لیوی مجھے مروا دے گا۔“

”ڈاکٹر لیوی تو خود بھی مسلمان ہو چکے ہیں۔“ راحیلہ نے کہا اور جینا سے ڈاکٹر لیوی کی تمام گفتگو دہرا دی۔

”میں نہیں مانتا۔“ یوسف کی شکی طبیعت پھر مچلی۔ ”اگر یہ درست ہے تو وہ اسرائیل میں کیا کر رہا ہے؟“

”کیا کر رہا ہے۔ سبزیاں کاشت کر رہا ہے۔“

”ہاں..... یہ تو ہے۔ خیر چھوڑو۔ دیکھا جائے گا۔“ یوسف نے کہا۔ وہ مطمئن  
اب بھی نہیں تھا۔ ”اب باہر کیسے نکلیں گے؟“

”ڈاکٹر لیوی ہمارے لئے ایک چیز چھوڑ گئے ہیں۔ یہ دیکھو ڈوری۔ یہ غار کے دہانے پر ایک چٹان سے بندھی ہوئی ہے۔“

یوسف چند لمے پر خیال انداز میں ڈوری کو تکتا رہا پھر بولا۔ ”ٹھیک ہے، تم آگے چلو گی راحیلہ، تم میری رہنمائی کرو گی۔“



واپسی کا سفر ہو رہا تھا۔ وہ سنگلاخ ڈھلوانوں سے اتر آئے تھے۔ وہ لوگ اب بھی غمناک تھے۔ ایوری، شلومو اور ان کے ساتھی قافلے کو کورڈے رہے تھے۔ سفر کے دوران کوئی دشوار مرحلہ آتا تو بین آنزک پیچھے آ جاتا اور جینا کو بازوؤں پر اٹھا لیتا۔ ابتدا میں جینا نے احتجاج کیا لیکن بین آنزک ہمیشہ یہی کہتا کہ وہ پھول کی طرح ہلکی پھلکی ہے اور اسے

کوئی زحمت نہیں ہو رہی۔ وہ جینا سے بچوں کے سے لاڈ کرتا، اسے گیت سنانا اور ہر بار وہ اس سے ضد کرتا کہ وہ یہیں رہ جائے۔

”ماں..... ہمیں رہ جاؤ ہمارے ساتھ۔“ وہ ملتجیانہ لہجے میں کہتا۔ ”شام کو میں کھیتوں سے لوٹ کر گھر آؤں گا تو تمہیں اسی طرح ہانپوں میں اٹھالیا کروں گا اور میں تمہیں ایسے پیارے پیارے گیت سنایا کروں گا۔ سنو۔“ یہ کہہ کر وہ گانے لگتا:

دیکھو سردیاں گزر گئی ہیں  
بارش بھی جا چکی ہے  
زمین کے سینے پر پھول کھل رہے ہیں  
گیت گانے کی رات آ گئی ہے

جینا مسکرائی۔ ”جب تم کراچی میں پہلی بار میرے پاس آئے تھے تو شاید تم نے یہی گیت سنایا تھا مجھے۔ کتنی پرانی بات لگتی ہے۔“

”یہ ہمارے ہاں محبت کا سب سے خوبصورت گیت ہے اور میں تو پہلی نظر میں ہی آپ کی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔“

”کیسے بے شرم بیٹے ہو تم۔“ جینا نے اسے ڈنپا۔ ”حالانکہ ابتدا ہی سے تم راحیلہ پر مرے تھے۔ بین آئزک، سچ بتاؤ، راحیلہ سے محبت کرتے ہو یا؟“

وہ ہنس دیا۔ ”جی ہاں، کرتا ہوں لیکن وہ اور بات ہے۔ میں راحیلہ سے شادی کروں گا اور انکل نتھانیل کی طرح یہاں کی زمین سے چمٹ جاؤں گا۔ وہ صحیح کہتے ہیں۔ اسرائیل کو سب سے زیادہ ضرورت اجناس کی ہے۔ آپ بھی ہمارے ساتھ رہنے گا اور دیکھئے گا کہ میں کتنی محنت کرتا ہوں۔“

”میں نہیں سمجھتی کہ تم ایسا کرو گے۔“ جینا نے کہا۔ ”تم تو عربوں سے جنگ لڑو گے۔“

”نہیں ماں۔ میں نے دیکھ لیا کہ جنگجو سے کسان بڑا ہوتا ہے۔ ہاں آدمی کو اپنے دفاع کے لئے تیار رہنا چاہئے۔“

”اور تمہارے انکل تو بدل گئے ہیں.....“

”تھوڑا سا تو میں بھی بدل گیا ہوں لیکن اب وطن نہیں چھوڑا جائے گا مجھ سے۔“

”اچھا یہ بتاؤ راحیلہ سے بھی بات کی تم نے؟“ جینا نے پوچھا۔

”نہیں..... لیکن کروں گا، دو ایک دن میں۔“

”تمہارا کیا خیال ہے، راحیلہ تم سے محبت کرتی ہے؟ وہ عمر میں تم سے بڑی ہے۔“ بین آئزک نے چونک کر اسے دیکھا۔ پہلی بار وہ ذرا پریشان نظر آیا۔ ”میں اس کی ت جیت لوں گا۔ اسے مجبور کر دوں گا کہ وہ مجھ سے محبت کرے اور ماں، میں تو اس ت بھی بڑا تھا، جب بچہ تھا۔“

”مجھے نیچے اتار دو بین آئزک۔“

جینا کے نیچے اترنے کے بعد وہ ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ پھر اچانک جینا نے کہا۔ ”اور تمیں عجیب شے ہوتی ہیں بین آئزک، اور میری راحیلہ تو عجیب تر ہے۔ اس نے کبھی ی سے محبت نہیں کی..... سوائے آسانکات کے اور آسانکات میں نے اسے خوب اہم کیں۔ میں نہیں چاہتی بین آئزک کہ تمہارا دل ٹوٹے۔“

”آپ یہاں رہنے کا وعدہ تو کریں ماں۔ ایسا کچھ نہیں ہو گا۔“ بین آئزک نے بے اعتماد سے کہا۔ ”آپ ہماری شادی میں رقص کریں گی یا؟“

جینا پھر مسکرائی لیکن نہ جانے کیوں اس کا دل بو جھل ہو گیا تھا۔

○-----○-----○

سفر کے دوران یوسف بار بار ڈاکٹر لیوی کے ساتھ چلتا رہا۔ اس کے ذہن پر بوجھ ت تھا۔ پہلی بار وہ اس کی طرف آیا اور اس کے ساتھ قدم ملا کر چلنے لگا۔ پھر اچانک اس نے کہا۔ ”شکریہ ڈاکٹر۔“

”شکریہ کی کیا بات ہے۔ آدمی کو آدمی کے کام آنا چاہئے۔“ ڈاکٹر لیوی نے جواب دیا۔

”آپ جانتے ہیں، وہاں میری حالت بہت تباہ تھی۔“

ڈاکٹر نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”جانتا ہوں۔ تمہاری حالت واقعی بہت خراب تھی۔“

”لیکن اب بھی میں مطمئن نہیں ہوں۔ تمام سوالوں کے جواب نہیں مل سکے ہیں۔“

ڈاکٹر لیوی نے پھر اثبات میں سر ہلایا۔ ”کچھ سوالوں کے جواب تو شاید کبھی نہ مل سکیں۔ بہر حال، مجھ سے جو ہو سکا ضرور کروں گا۔“ اس نے یوسف کو حوصلہ افزا

کراہٹ سے نوازا۔ ”پوچھو۔“

ہمیشہ تو نہیں چل سکتا۔ کبھی نہ کبھی یہ فراڈ کھل جائے گا۔ کبھی نہ کبھی کوئی منتخب آدمی، ثمرحیات سے نوازا گیا ہو گا، مرجائے گا اور پول کھل جائے گا۔ پوری بستی کو معلوم ہوئے گا کہ ثمرحیات جعلی ہے۔“

ڈاکٹر لیوی مسکرایا۔ ”تم ایک بات بھول رہے ہو۔ انہوں نے اس سلسلے میں بڑی ایکی سے کام لیا ہے۔ کسی کو نہیں معلوم ہوتا کہ ثمرحیات کسے دیا گیا ہے۔ بستی کے انہوں نے اسے مقدس راز سمجھ کر اس کی حفاظت کی ہے۔ جسے ثمرحیات دیا جاتا ہے اسے رازداری کا حلف لیا جاتا ہے۔ وہ کبھی کسی کو نہیں بتا سکتا کہ وہ ثمرحیات کا حق دار یا پکا ہے۔“

یوسف نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا۔ ”اور میرا خیال ہے، ثمرحیات پر یقین رچیات کے مستحق کی عمریوں بھی بڑھا دیتا ہو گا۔ اس کی قوت حیات اور قوت مدافعت کی تو بڑھ جاتی ہو گی۔ ایسے میں امکان یہی ہو گا کہ وہ زیادہ جی سکے گا۔“

”بالکل۔“

”اور اگر جینا میکلم نے ثمرحیات کھالیا ہوتا تو.....“

”لیکن انہوں نے نہیں کھایا۔“ ڈاکٹر لیوی نے اس کی بات کاٹ دی۔  
”ادھر دیکھیں میری طرف۔ آپ کو تو شروع سے ہی ثمرحیات کی حقیقت معلوم ہوئی۔ ہے نا؟“

ڈاکٹر لیوی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ”نہیں، ایسی کوئی بات میں۔ مجھے نہ پہلے کچھ معلوم تھا..... نہ آج کچھ معلوم ہے۔“  
یوسف کی آنکھوں میں پرانی خوفزدگی لوٹ آئی۔ ”لیکن غار میں تو تم نے کہا.....“

”میں نے کہا تھا کہ میں اس پر یقین نہیں رکھتا۔ میں نے کہا تھا کہ خدا اور توہمات بیک وقت یقین نہیں رکھا جاسکتا۔ آدمی خدا پر یقین رکھتا ہو تو توہمات پر یقین رکھنے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ میں اب بھی کہہ رہا ہوں کہ خدا پر کامل یقین ہو تو آدمی کو کسی چیز کا..... کسی بات کا خوف نہیں رہتا۔“

یوسف کے چہرے پر ضد کا تاثر ابھرا۔ ”یعنی میری بھائی کا واحد صورت خدا پر کامل یقین ہے؟“

”زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر ہر شخص ایسی ہی صورت حال سے دوچار ہوتا

”گاؤں میں کچھ لوگوں کی عمر تین سو سال سے بھی زیادہ تھی۔“ یوسف جیسے پھر پڑا۔

”کون لوگ؟“

”بارزی لئی، اٹلک.....“ وہ کہتے کہتے رک گیا۔ اسے وہ لوگ نظر آئے، جہ کے چہرے اور جسم جیسے ماہ و سال کی گردش سے محفوظ تھے۔

”یہ کس نے کہا کہ وہ اتنے بوڑھے ہیں؟“ ڈاکٹر لیوی نے پوچھا۔

”انہوں نے ہی بتایا تھا اور وہ لگتے بھی تھے۔ پرانے، متروک اوزاروں کی مدد سے کام کرتا ہوا وہ جفت ساز.....“

”ہاں، دلچسپ بات ہے اور میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ بیت الجبل میں تمہیر بہت معمر لوگ بھی ملیں گے اور تم نے دیکھا کہ انہوں نے اب بھی ہزاروں سال پرانے طریقے اپنائے ہوئے ہیں۔ ایسے مناظر تخیل کو ہمیز کر دیتے ہیں..... ہے نا؟“  
”در حقیقت ان کی عمریں کیا ہوں گی؟“

”کون جانے! اس موسم اور فضا میں، اس آب و ہوا، جدید دور کی اعصاب شکن زندگی سے اتنا دور رہنا..... ایسے میں وہ غیر معمولی عمر تو پائیں گے ہی، اور یہ بھی دیکھ کہ ان میں سے کچھ بہت پرانے، تاریخی واقعات کے شاہد ہیں۔ لیکن یہ بھی ذہن میں رکھو کہ اس بستی میں کوئی کتاب نہیں۔ یہاں یادداشت کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ پھر یہاں روایات اور بزرگوں سے سنے ہوئے واقعات بھی یادداشت میں یوں محفوظ ہو جاتے ہیں کہ بیان کرنے والے کو خود بھی یہ یقین ہو جاتا ہو گا کہ وہ ان کا یعنی شاہد ہے۔“

یوسف پھر خوفزدہ ہو گیا۔ وہ مایوسی پھر عود کر آئی لگی، جو بیت الجبل میں پوری شدت سے ابھری تھی۔ ”اچھا..... اگر یہ درست نہیں تو پھر انہوں نے طویل العمری کا چکر کیوں چلا رکھا ہے؟“

”میرے خیال میں یہ بھی بہت پرانا چکر ہے، اسے سیزمین شپ کہو۔ اس سے ثابت کیا جاتا ہے کہ اللہ اپنے فرماں بردار اور وفادار بندوں کو بے حد نوازتا ہے۔ اس طرح بستی کے لوگوں میں گناہ سے بچنے اور نیک بننے کا جذبہ ابھرتا ہے۔ سب خدا کے تحفے کے حصول کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ چکر بستی کے بڑوں کے لئے قوت کا منبع ہے اور عام لوگوں کے لئے نیکی اور پارسائی کی ترغیب۔“

یوسف چند لمحے ڈاکٹر لیوی کی بات پر غور کرتا رہا۔ پھر وہ تقریباً چلا اٹھا۔ ”لیکن یہ

نرک نے پوچھا۔

”نہیں بین آنرک.....“

”تم نے فوراً ہی نفی میں جواب دے دیا۔ سوچا تک نہیں۔ میں یہ اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ مجھے تم سے محبت ہے۔“

”ڈیزر بین آنرک..... سچائی اور دیانتداری بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔“

”تو تم نے کبھی مجھ سے محبت نہیں کی۔ ہم تو بہت قریب رہے ہیں، بہت پیب.....“

”ہاں، لیکن وہ ویسی محبت نہیں، جیسی تم سمجھ بیٹھے.....“

وہ اس وقت اس مقام پر بیٹھے تھے جہاں انہوں نے بیت الجبل جاتے ہوئے پہلی بار اؤ ڈالا تھا۔ وہ دونوں ایک چٹائی چھجے پر بیٹھے تھے۔ ابوری، شلومو اور ان کے ساتھی پہرا ے رہے تھے۔ بین آنرک غیر مسلح تھا۔ گھائی والی جنگ کے بعد راحیلہ نے اسے اب تک ایک بار بھی مسلح نہیں دیکھا تھا۔

”میں نے جینا ماں کو بتایا تھا کہ میں تم سے شادی کروں گا۔ انہوں نے کہا کہ تم نے بھی کسی سے محبت نہیں کی ہے۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ تمہیں صرف آسائشات سے عشق ہے۔ کیا یہ سچ ہے راحیلہ؟“

”کبھی ایسا تھا بین آنرک۔“ راحیلہ نے جواب دیا۔

”لیکن تم بدل گئی ہو۔ ہاں، تم بدل گئی ہو۔ میں بھی بدل گیا ہوں۔ اب مجھے جنگ و جدل اور خوں ریزی سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ بلکہ دل برا ہو گیا ہے۔ میں فصلیں اگانا چاہتا ہوں..... کاشت کاری کرنا چاہتا ہوں۔“

راحیلہ کو ایک بھولا بسرا منظر یاد آیا..... نگاہوں میں پھر گیا۔ ”اس روسی کی طرح، جو ہمیں راستے میں ملا تھا۔ جو چھوٹا سا پودا لگا رہا.....“

”ہاں۔ وہ مجھ سے بہتر انسان تھا۔ اس نے کسی چیز کو زندگی دی جب کہ میں نے زندگی چھین لی۔ میں نے جو ظلم سے ہیں، اگر انہوں نے مجھے ظالم بنا دیا تو بات کیا ہوئی۔ بات تو جب ہے کہ ان کرناک خوالوں سے مجھے ظلم سے نفرت ہو جائے۔“

”لیکن بین.....“

”میں اپنے انکل جیسا بننا چاہتا ہوں۔“

”اور بن جاؤ گے۔ تمہارے انکل بہت اچھے انسان ہیں بین آنرک.....“

”ہے۔“ ڈاکٹر لیوی نے کہا۔ ”وہ خوش نصیب ہوتے ہیں، جن پر یہ وقت بہت جلدی جائے۔“ وہ خاموش ہو کر چند لمحے یوسف کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔ ”لیکن یہ نہ بھوا کہ میں خدا پرست ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سائنس داں بھی ہوں۔“

”تو اس سے مجھے کیا مدد ملے گی؟“

”عملیت پسندی کا راستہ تجربات کی طرف جاتا ہے.....“

یوسف نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”تمہارا مطلب ہے کہ تم نے اسے.....“

”دس سال پہلے جب میں پہلی بار بیت الجبل گیا تھا تو میں نے بارزی لئی سے ار مادے کی تھوڑی سے مقدار طلب کر لی تھی۔“

”لیبارٹری ٹسٹ کے لئے؟“

”نہیں۔ میں نے آزمائش کے لئے اسے کھایا تھا۔“

”نتیجہ کیا نکلا؟“ یوسف کے لہجے میں سنسنی تھی۔

”نتیجہ تمہارے سامنے ہے۔ میرے بڑھاپے کا عمل جاری ہے..... بلکہ میرے خیال میں اور تیز ہو گیا ہے۔“

یوسف نے بڑھے ڈاکٹر کو دیکھا، اس بار اس کی نگاہوں میں اس کے لئے محبت یا اس سے جتا جتنا کوئی جذبہ تھا۔ ”لیکن تمہیں تو اس پر یقین ہی نہیں تھا۔“ اس نے اعتراض کیا۔ ”میرا مسئلہ تو وہیں کا وہیں رہا۔“

”ہاں، لیکن یہ تو تم بھی مانو گے کہ تجربہ بہترین کسوٹی ہوتا ہے۔“

دونوں خاموشی سے قدم بہ قدم چلتے رہے، پھر یوسف نے پوچھا۔ ”ڈاکٹر تم جینا کو بیت الجبل کیوں لے کر گئے تھے؟“

”میں بتا چکا ہوں۔“

”بین آنرک کا وعدہ نبھانے کے لئے؟ میں نہیں مانتا۔ مجھے اصل وجہ بتاؤ۔“

ڈاکٹر لیوی نے اسے بہت غور سے دیکھا۔ ”تم ایک بات بتاؤ مجھے۔ کوہ ہرمن سے تم ویسے ہی واپس آئے ہو جیسے گئے تھے؟“

یوسف نے جواب نہیں دیا۔ وہ اس سلسلے میں کچھ سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ کم از کم فی الوقت وہ خود کو اس نئی روشنی میں دیکھنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

○-----○-----○

”راحیلہ..... تم مجھ سے شادی کر کے ایک کسان کی بیوی بننا چاہتی ہو؟“ بین

میں مسلمان ہوں..... مسلمان ماں باپ کی بیٹی۔ یہ بہت طویل کہانی ہے۔ مجھے اپنی عزت نفس بحال کرنی ہے۔ مجھے واپس وطن جانا ہے۔ وہاں وہ زندگی گزارنی ہے، جو مجھے گزارنا تھی اور میں نے نہیں گزارا۔ مجھے تلافی کرنی ہے۔“

”تھا؟“

”ہاں..... اگر ضروری ہوا تو تھا..... بالکل تھا.....“

اس لمحے نوجوان بین آنزک پختہ کار، جہاں دیدہ، حساس اور مہربان مرد بن گیا۔ ”تم ٹھیک کہتی ہو، انسان کے اندر بھی صحرا ہوتے ہیں۔ بنجر اور ناکارہ زمین ہوتی ہے۔ اسے لہلہانا اور وہاں پھول کھلانا بھی، اتنا ہی ضروری ہوتا ہے۔ ٹھیک ہے راحیلہ! گڈ لک۔ خدا تم پر ہمیشہ رحمتیں نازل فرمائے۔“

اسی وقت یوسف آگیا۔ ”دس منٹ بعد روانگی ہے۔“ اس نے اطلاع دی۔

○-----○-----○

وہ بغیر کسی دشواری کے سرحد پار کر کے اسرائیل میں داخل ہو گئے۔ وہاں ڈان سے ذرا پیچھے ان کی جیبیں موجود تھیں۔ اس رات وہ اپنے ٹرالرز میں سوئے۔ امریکا سے آئی ہوئی ڈاک ان کی منتظر تھی۔ اگلے روز جینا میکلم اپنی ڈاک میں کھوسی گئی۔ وہ مئی کی نو تاریخ تھی اور میف سے جہاز چودہ تاریخ کو روانہ ہونے والا تھا۔ اگلے روز انہیں میلا روانہ ہونا تھا۔

واپسی کے سفر میں وہ پھر درختوں کے اس جھنڈ سے انتبیغہ کے جرمن چرچ سے اور گیلی لی کے ساحل سے گزرے۔

جانے وہ بین آنزک کی مسلسل التجاؤں کا اثر تھا یا جھیل کے حسین منظر کا جادو کہ جینا میکلم کا دل وہاں انک گیا۔ اس نے شوفر سے گاڑی روکنے کو کہا۔

واپسی کے انتظامات یوسف کے ذمے تھے۔ وہ اپنی گاڑی سے اتر کر جینا کی طرف آیا۔ وہ ساحل کے منظر کو یوں دیکھ رہی تھی، جیسے دل میں اتار رہی ہو۔

”کیا ہوا؟ کوئی گریڑ ہے؟“ یوسف نے پوچھا۔

جینا نے چونک کر اسے دیکھا۔ اسے اس کی موجودگی کا احساس ہی ابھی ہوا تھا۔ ”نہیں، کوئی بات نہیں۔ بس یہاں سے رخصت ہونے کو دل نہیں چاہتا۔“

یوسف کے سامنے، ماہان لدوانے کا مسئلہ پہلے ہی سے تھا اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ جینا غیر انسانی حد کو پہنچی ہوئی مستعدی کا مطالبہ کرنے والی ہے۔ چنانچہ اس نے کہا ”میرا

بین آنزک نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”تم یہیں رک جاؤ راحیلہ۔ تم نہیں جانتیں، محبت کیا ہوتی ہے۔ جان جاؤ گی تو تم بھی میری طرح محبت کرنے لگو گی۔ ہم دونوں مل کر اس نظر انداز کی گئی زمین کے سینے سے ہری بھری زندگی کھینچیں گے..... پھول کھلائیں گے.....“

”لیکن جینا.....“

بین آنزک نے اس کی بات کاٹ دی ”وہ یہیں رہیں گی، دیکھ لینا، وہ یہیں رہیں گی۔ وہ یہاں سے جا ہی نہیں سکتیں.....“

راحیلہ اس کے یقین پر مسکرائی۔

وہ مسکراہٹ بین آنزک کے لئے حوصلہ افزا تھی۔ ”راحیلہ! حوصلے سے کام لو۔ اپنے دل کی آواز سنو.....“

”میں اپنے دل کی آواز سن چکی ہوں بین آنزک!“

پہلی بار بین آنزک کی آنکھوں میں تقسیم کی چمک لہرائی۔ لیکن وہ اداس ہو گیا۔ وہ بدستور راحیلہ کا ہاتھ تھامے، بیٹھا سوچتا رہا۔ آخر کار اس نے پوچھا۔ ”جوزف ڈیوڈ سن؟“

”ہاں۔“ راحیلہ، یوسف عالم کہتے کہتے رک گئی۔ کوئی حس کہہ رہی تھی کہ یہ انکشاف کا وقت نہیں۔

”یہ کیسے ممکن ہے!“ وہ غصے سے چلایا۔ ”تم اس جیسے شخص سے کیسے محبت کر سکتی ہو۔ جانتی بھی ہو، وہ کون ہے، کیا ہے؟ وہ جھوٹا، فراڈ، مادہ پرست، جس کے نام کے بارے میں بھی یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ یہ اس کا نام ہے۔“

راحیلہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموش رہنا ہی مناسب تھا۔

”وہ تم سے محبت کرتا ہے؟“ بین آنزک نے پوچھا۔ پھر خود ہی جواب دیا۔ ”یقیناً کرتا ہو گا۔“

راحیلہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ”مجھے معلوم نہیں۔ میرا خیال نہیں، خود اسے بھی معلوم نہیں۔ ابھی تو وہ میری طرح ہے..... جیسی میں پہلے تھی۔ ابھی وہ شاید کسی سے محبت کرنے کی اہلیت سے ہی محروم ہے لیکن بین آنزک، مجھے واپس جانا ہے۔“

”کیوں راحیلہ؟ رک جاؤ۔ میں تمہارے دل سے جوزف کی محبت بھی مٹا دوں گا۔ تمہیں اتنی محبت دوں گا.....“

”نہیں بین آنزک! بات صرف جو کی نہیں۔ مجھے واپس جانا ہے۔ یہ نہ بھولو کہ

خیال ہے، سفر و کنا مناسب نہیں۔ اگر ہمیں اس جہاز پر سفر کرنا ہے تو فوری طور پر مینہ پھینچنا ضروری ہے۔“

جینا نے کھڑکی سے سر نکالتے ہوئے کہا ”مجھے ایک دن اور رکنے دو یہاں۔“  
آغاز تعلق سے اب تک وہ پہلا موقع تھا کہ جینا میکلم نے یوسف کے دل کو چھو لیا۔

”ٹھیک ہے مس میکلم۔“ یوسف نے کہا اور واپس آکر پڑاؤ کے سلسلے میں ہدایات دینے لگا۔

کار میں جینا کے ساتھ بیٹھے ہوئے بین آئزک نے نعرہ فتح بلند کیا۔ ”بیت المقدس جو آجائے، واپس جانا نہیں چاہتا۔“ وہ ایک پرانی کماوت تھی۔

”اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں واپس نہ جاتی۔“ جینا نے تھکے تھکے لہجے میں کہا، اچانک وہ بہت نڈھال لگنے لگی۔

فادر ہوفساتر کی اجازت سے انہوں نے جھیل کے کنارے پڑاؤ ڈالا۔

لیکن قیام کا وہ ایک دن پھیلتا چلا گیا!

ایسا لگتا تھا کہ جینا کا وہاں سے جانے کو کبھی دل نہیں چاہے گا۔ وہاں اسے آزادی کا احساس ہوتا تھا۔..... جیسے وہ آزاد فضا کی تازہ ہوا میں سانس لے رہی ہے۔ جیسے اس کی روح جو برسوں سے تاریک و خانوں میں قید تھی رہا ہو گئی ہے۔

لیکن بعد میں پتا چلا کہ اس قیام کا ایک سبب اور بھی تھا۔ جینا بہت زیادہ تھک گئی تھی۔ وہ اتنی نڈھال ہو گئی تھی کہ سفر کی متحمل ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ چنانچہ جیفہ سے روانہ ہونے والے بحری جہاز کا کسی نے تذکرہ نہیں کیا۔

جینا جھیل کے کنارے آرام کرسی میں نیم دراز رہتی۔ اس کی ٹانگوں پر ہلکا کبل پڑا ہوتا۔ یا پھر وہ ٹرائلر میں اپنے بستر پر جو کھڑکی کے ساتھ ہی تھا، لیٹی باہر جھیل کو دیکھتی رہتی۔ بین آئزک اسے کمائیاں اور گیت سناتا رہتا یا پھر وہ بڑے اٹھک سے ڈاکٹر لیوی سے باتیں کرتی نظر آتی۔ اسے جیسے پروا ہی نہیں رہی تھی کہ اس کی کاروباری مملکت کا کاروبار ٹھیک سے چل بھی رہا ہے یا نہیں۔

یہ بات طے تھی کہ وہ بالکل بدل گئی ہے اور اس کا احساس سب سے زیادہ یوسف کو ہوتا تھا۔ اس کی ظاہری شخصیت کی تبدیلیاں یوسف کے لئے زیادہ حیران کن تھیں۔ اسے ایسا لگتا تھا کہ جیسے کیونوس پر موجود کوئی بہت جانی پہچانی تصویر رخ بدل کر بیٹھ گئی

ہے۔ جھیل کے کنارے، وہ اسے آرام کرسی میں نیم دراز دیکھتا تو اسے احساس ہوتا کہ جینا اس قدر مختصر الوجود ہو گئی ہے۔ وہ اس کا شانہ انداز، اندر کی آگ اور اس کا فطری تحکم اس نے اس کی شخصیت کو بھاری بھر کم تاثر دے رکھا تھا۔ اب طمانیت کی کیفیت میں گویا سکڑ کر رہ گئی تھی۔ اس کی کلائیاں بے حد کمزور نظر آتی تھیں۔ نیلی رنگیں بہت ایساں ہو گئی تھیں۔ چہرہ استخوانی نظر آنے لگا تھا۔ پہلے اس کی آنکھوں میں ہمیشہ بہت زیادہ مینے کی خواہش دہکتی رہتی تھی۔ اب چہرے پر نرمی تھی۔ فلسطین کی حدت نے اس کی لمبت کے برف زاروں کو پگھلا دیا تھا۔ پتلے ہونٹ، جو پہلے بھنے رہنے کے عادی تھے، اب سکر اہٹ کی وجہ سے نیم دار بننے لگے تھے۔

ایک بات اور تھی..... اور یوسف کو وہ دیکھ کر شاک لگا۔ اب جینا کے مضطرب تھ بھنجی ہوئی مٹھیوں کی شکل میں نہیں رہتے تھے۔ اب وہ ہاتھ کھلے رہتے تھے.....

اس کی جلد میں ایک عجیب سی نرم، سرمئی رنگت اتر گئی تھی۔ زندگی اب بس اس کی آنکھوں تک محدود ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ وہ کہیں سے جینا میکلم نہیں رہتی تھی، اس سے وہ سب واقف تھے۔ اب وہ ننھی منی سی، بہت تھکی باری بوڑھی عورت تھی۔ انتہیغہ میں قیام کے چھٹے دن ڈاکٹر لیوی جینا کے پاس وہ بات کرنے آیا، جو کئی دن سے اس کے ذہن پر بوجھ بنی ہوئی تھی۔ وہ اب میتلا واپس جانا اور اپنے کام میں لگ جانا چاہتا تھا۔ اس وقت یوسف اور راحیل وہیں موجود تھے۔ بین آئزک شمال کی طرف ایک بانیداد برائے فروخت دیکھنے گیا تھا، جسے خریدنے کا اس کا ارادہ تھا۔

”سبزیاں اگانا بہت چھوٹا کام ہے۔“ ڈاکٹر لیوی نے کہا ”لیکن مجھے بہت بڑا کام لگتا ہے۔“

یوسف کو ایک اور حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔ جینا کی آنکھیں بہت تیزی سے بھر آئیں لیکن اس نے اتنی ہی تیزی سے آنسوؤں کا گلا گھونٹ دیا۔ ”میں بہت خود غرض ثابت ہوئی ہوں۔ ہے نا؟“ وہ بولی ”ٹھیک کہتے ہو۔ تمہیں جانا تو ہے۔ میں نے تم سب کے لئے وقت کے پیہیے کو بہت دیر روکے رکھا ہے اور اپنے لئے بھی۔ وطن میں میرا بھی انتظار ہو رہا ہوگا۔“

ڈاکٹر لیوی اس کے قریب بیٹھ گیا۔ ”آپ یہیں رہ جائیں نا۔ میں جانتا ہوں کہ بین آئزک آپ کو سگی ماں کی طرح چاہتا ہے۔ وہ آپ کو قائل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔“



ان میں کشتی اتفاقاً دریافت کر لی تھی۔ وہ بہت پرانے طرز کی کشتی تھی جس کے ساتھ دو توار بھی تھے۔

”کس کی ہے یہ؟“ راحیلہ نے پوچھا۔

”معلوم نہیں۔“ یوسف نے جواب دیا ”ممکن ہے، پیٹر کی ہو اور ممکن ہے جان کی ہو۔“ اس نے حضرت عیسیٰ کے حواریوں کا حوالہ دیا۔

راحیلہ مسکرانے لگی۔ یوسف نے اسے سہارا دے کر کشتی میں بیٹھنے میں اس کی مدد کی۔ اس کی گرفت میں گر بجوشی بھی تھی اور مضبوطی بھی۔

یوسف کشتی کھینے لگا۔ دونوں خاموش تھے، وہاں انہیں گرمی اور گھٹن کے برعکس خنکی کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ ذرا گہرے پانی میں پہنچے تو ہوا بھی چلنے لگی۔ مغربی افق پر سورج جاتے جاتے اپنی نشانی چھوڑ گیا تھا۔ سرخ لہریے، جو اب آہستہ آہستہ اودھی رنگت اختیار کر رہے تھے۔ موتی جیسے آسمان پر زردی مائل چاند آہستہ آہستہ اوپر کا سفر طے کر رہا تھا۔ وہ بہت خوبصورت منظر تھا۔

کوئی آدھے گھنٹے تک دونوں خاموش بیٹھے تھے۔ کشتی جھیل کی سطح پر بہتی رہی۔ یوسف نے کشتی کو آہستگی سے موڑا۔

”اوہ..... کتنا خوبصورت منظر ہے، کس قدر غیر ارضی.....“ راحیلہ نے بلند آواز میں کہا۔

یوسف نے سر ٹیڑھا کر کے چاند کو دیکھا۔ ”واقعی خوب صورت منظر ہے۔ لیکن نقش آنکھوں والی، میں تم سے فطرت کے حسن پر تبادلہ خیال کرنے کے لئے تمہیں یہاں نہیں لایا ہوں۔ مجھے تم سے کچھ اور طرح کی باتیں کرنی ہیں۔“

”میں خود بھی تمہارے ساتھ اسی لئے آئی ہوں یوسف۔“ راحیلہ نے سادگی سے کہا۔

”کچھ باتیں ہیں جو صاف ہو جانی چاہئیں۔“ یوسف نے سر ہلاتے ہوئے کہا ”اوپر جو کچھ تم نے میرے ساتھ کیا، سب سے پہلے تو میں اس پر تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔“ اس نے جھیل کے اس طرف کوہ ہرمن کی طرف اشارہ کیا ”اس وقت میں بڑی بے کسی کی حالت میں تھا۔“ راحیلہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن یوسف نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔ ”رکو..... پہلے مجھے اپنے سینے کا بوجھ ہلکا کرنے دو۔ تم بہت اچھی لڑکی ہو۔ تم نے بہت نازک وقت میں میرا ساتھ دیا..... مجھے سنبھالا۔ کیوں؟ یہ مجھے

آپ مجھے بھی اس کا حامی سمجھ لیں اور پھر میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو ابھی ہماری ضرورت ہے۔ پلیز..... آپ یہیں ٹھہر جائیں۔“

یوسف سوچ رہا تھا کہ واقعات کے جس سلسلے کا اس نے آغاز کیا تھا، اگر جینا میلکم نے ڈاکٹر لیوی کی بات مان لی تو یہ اس کا کتنا عجیب انجام ہوگا۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد جینا نے پوچھا ”تم کب جاؤ گے؟“

”کل..... بین آئزک کی واپسی کے بعد۔“ ڈاکٹر لیوی نے جواب دیا۔

”میں آج رات یا کل صبح تک اس سلسلے میں فیصلہ کر لوں گی۔“ جینا نے سر ہلاتے ہوئے کہا ”اب مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ میں سوچنا چاہتی ہوں۔“

وہ سب وہاں سے ہٹے تو جینا جھیل کے کنارے بیٹھی اونگھ رہی تھی۔

○-----○-----○

اس رات جینا آرام کے لئے جلدی چلی گئی۔ یوسف، راحیلہ کی تلاش میں ٹھٹھا ہوا نزار کی طرف جا نکلا۔ راحیلہ اسے باہر مل گئی۔ ”کیا خیال ہے، جھیل کی طرف نہ چلیں۔“ یوسف نے کہا۔ ”تم بہت تھکی ہوئی لگ رہی ہو۔ مجھے ایک کشتی مل گئی ہے۔ سوچا جھیل کی سیری کر لیں۔“ وہ کندھوں پر ایک چادر ڈالے ہوئے تھا۔

غار والی رات کے بعد سے اب تک انہیں تنہائی میں بات کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ لیکن دونوں ہی جانتے تھے کہ کسی نہ کسی وقت انہیں کھل کر بات کرنی پڑے گی۔

راحیلہ نے سوچا، وہ وقت آپہنچا ہے۔ اس نے ہچکچائے بغیر جواب دیا ”ضرور۔ پھوپھی میلکم بھی سو گئی ہیں۔ میرا خیال ہے، اب انہیں میری ضرورت نہیں پڑے گی۔“

وہ خاموشی سے جھیل کے شمالی کناروں کی طرف چل دیے۔ ہوا ساکت تھی لیکن گوی بھی سورج غروب ہونے کے بعد گرد کی طرح بیٹھتی چلی جا رہی تھی۔ راحیلہ کاٹن کی شلوار قمیض پہنے ہوئے تھی۔ یوسف نے کن آنکھیں سے اسے دیکھا۔ وہ بہت صحت مند لگ رہی تھی۔ اس کی رنگت میں جیسے جان پڑ گئی تھی۔ اس نے بالوں کو جوڑے میں باندھ رکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں وہ چلچل، جس نے یوسف کو پہلی ملاقات میں دہلا دیا تھا، اب غائب ہو چکا تھا۔ اس کی شخصیت تبدیل ہو کر رہ گئی تھی۔ کھلی آب و ہوا کی وجہ سے اور ذہن سے خوف کے جالوں کے اتر جانے کی وجہ سے اس کی شخصیت بالکل مختلف لگ رہی تھی۔

دس منٹ کے بعد وہ جھیل کے کنارے ان جھاڑیوں تک پہنچے، جہاں یوسف نے

لگیوں سے سلانا رہا۔ ”وہ منظر اتنا اچانک ابھرا تھا“ جیسے جادو کے زور پر ابھرا ہو۔ میں نے دیکھا کہ میں ایک کار چلاتا ہوا آیا ہوں اور میں نے ایک خوبصورت بنگلے کے گیٹ کے سامنے کار روکی ہے۔ میں نے ہارن بجایا ہے۔ ایک عورت نے اگر گیٹ کھولا ہے۔ اس کے ساتھ ایک آٹھ سالہ لڑکا بھی ہے۔ اندر بجر پلا راستہ ہے، جو ہرے بھرے لان کے درمیان سے گزرتا ہے۔ عورت اور لڑکے نے میرا خیر مقدم کیا۔ لڑکے نے چیخ کر کہا ہے..... ابو گھر آگئے۔ ہم اندر چلے گئے ہیں۔ اندر میز پر کھانا لگا ہوا ہے۔ وہ جدید طرز کا پر آسائش بنگلا ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ عورت کا چہرہ تمہارا ہے اور لڑکا ہم دونوں کے ملے جلے نقش لے ہوئے ہے۔ میں کوئی پانچ منٹ تک اس منظر میں کھویا رہا۔ پھر میں نے سر جھٹکا..... خود کو ڈانٹا اور اس کے طلسم سے نکل آیا لیکن یہ احساس قائم رہا کہ مجھے وہ تصور بہت..... بہت زیادہ اچھا لگا ہے۔“

راحیلہ کا چہرہ تہمتا رہا تھا..... نظرس جھک گئی تھیں۔ یوسف کے خاموش ہونے کے بعد اس نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر لڑکوں جیسا شرارتی تاثر تھا اور وہ بڑی محبت سے اس چادر کو سلائے جا رہا تھا۔ راحیلہ نے پہلی بار اسے چادر اوڑھے دیکھا تھا۔ وہ اس میں بہت اچھا اور اپنی عمر سے چھوٹا لگ رہا تھا۔

یوسف نے جیب سے پیکٹ نکالا اور سگریٹ سلگائی۔ ”لیکن راحیلہ، تم کار اور بنگلے سے بہلنے والی لڑکی تو نہیں اور پھر مجھے تو کار اور بنگلا میرا بھی آسان نہیں۔“

”ہاں، میں کار اور بنگلے سے بہلنے والی لڑکی نہیں ہوں۔“ راحیلہ نے دھیرے سے کہا۔

”ہوتی بھی..... اور میں کار اور بنگلا حاصل بھی کر لیتا تو جن ذرائع سے حاصل کرتا، وہ تمہیں پسند نہ آتا، میں ایک ناکارہ اور حرام خور انسان ہوں راحیلہ۔ تم نے تو مجھے پہلی ملاقات میں..... پہلی نظر میں پہچان لیا تھا۔ مجھے دنیا کی ہر نعمت کی آرزو ہے لیکن میں اس کے حصول کے لئے طویل، مسلسل اور صبر آزما جدوجہد نہیں کر سکتا۔ میں ہمیشہ شارٹ کٹ تلاش کرتا ہوں۔“

راحیلہ نے کہا ”تم نے بھی میری کمزوری پہلی ملاقات میں پانچ منٹ بعد ہی بھانپ لی تھی۔“

”ہاں..... لیکن اب تم بدل گئی ہو۔“

راحیلہ نے نفی میں سر ہلایا ”نہیں..... بنیادی طور پر میں ذرا بھی نہیں بدلی

نہیں معلوم لیکن وہ وقت ایسا تھا کہ ہم بھی جذباتی ہو رہے تھے۔ تم نے جو کچھ کہا، اپنا جگہ لیکن اگر تم بین آنرک سے محبت کرتی ہو تو میں تمہیں تمہارے لفظوں کی ان زنجیروں سے اس لمحے آزاد کر رہا ہوں۔“

راحیلہ نے چند لمحے سوچا۔ پھر پوچھا۔ ”اور اگر میں ان زنجیروں سے آزادی نہیں چاہتی ہوں تو؟“

”میں کوئی اچھا آدمی نہیں ہوں راحیلہ!“

”تو میں بھی کوئی اچھی لڑکی نہیں ہوں۔“

یوسف ہنس دیا ”یعنی ہم دونوں مشینی شہر کے بدبودار پرزے ہیں۔“ لیکن وہ فوراً ہی سنجیدہ ہو گیا ”میں یونہی کہہ رہا تھا، مائنڈ نہ کرنا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ اصل بات کیسے کروں اور اصل بات یہی ہے تاکہ ہم ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہیں۔“

راحیلہ نے سر کو تقیبی جنبش دی۔ وہ یوسف کے اس اعتراف کے بعد اسے شک آمیز نظروں سے گھور رہی تھی۔

یوسف آہستگی سے کشتی کھینچے ہوئے کچھ سوچتا رہا۔ پھر اس نے مزاحیہ انداز میں پوچھا۔ ”تو بنفشی آنکھوں والی، اب ہمیں کیا کرنا چاہئے؟“

راحیلہ نے بھی چند لمحے سوچنے کے بعد جواب دیا ”میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ کاش مجھے معلوم ہوتا۔“ اس کے لہجے میں بے پناہ خلوص تھا..... سچائی تھی۔

”پہلی بار جب میں نے تمہیں میکم پیلس میں میز کے پیچھے بیٹھے دیکھا اور جب تم نے چشمہ اتار کر مجھے دیکھا تو پہلی نظر میں مجھے ناک آؤٹ کر دیا۔ میں نے زندگی میں تم جیسی خوبصورت لڑکی نہیں دیکھی تھی۔ پہلی بار کوئی لڑکی میری نظروں میں کھب گئی تھی۔ میں نے تمہیں ناپسند کیا کیونکہ انکور کھٹے تھے.....“

راحیلہ کے ہونٹوں پر موہوم سی مسکراہٹ تھرکنے لگی۔ ”تو پھر تم بدلے کب؟“ اس نے پوچھا۔

”میں وہی بتانے جا رہا تھا۔“ یوسف نے کہا ”وہ دن یاد ہے، جب میں بین آنرک کی ناکام تلاش کے بعد تل ابیب سے حیفہ واپس آیا تھا“ میں اور تم ایک ہوٹل میں ملے تھے۔ ہم جان گئے تھے کہ کھیل ختم ہو گیا۔ اس رات میں سونے کے لئے بستر پر لیٹا۔ میں نے آنکھیں بند کیں تو کھٹ سے ایک منظر میری بند آنکھوں میں لہرا گیا۔“ اس نے چادر کو اچھی طرح جسم پر لپیٹا اور پھر عجیب سے انداز میں..... بڑے پیار سے چادر کو

یوسف اس کا جواب دینے کے بجائے اپنے خدشات کی بات کرنے لگا۔ ”ہمارا  
 بھائی کس طرح کا ہو گا۔ میں جانتا ہوں کہ میں کس طرح کا آدمی ہوں۔ ایک ساتھ ہم جس  
 طرح کی زندگی گزاریں گے، اس میں گرم جوشی کی گنجائش کہاں سے نکلے گی۔ جذبوں کی  
 شدت اس وقت ہمیں گرما رہی ہے، وہ کیسے پنپ سکے گی۔ وہ تو ٹھنڈ کر رہ جائے گی۔“  
 وہ چپ ہوا تو راحیلہ نے کہا ”کو نہیں یوسف! کہتے رہو۔ سینے کا تمام بوجھ اتار  
 دے۔“

”ہم دونوں مدافعانہ اسٹائل رکھتے ہیں۔ جو کچھ میسر ہے، اس سے دستبردار ہونا بی فطرت نہیں۔ نتیجہ کیا نکلے گا؟ جو خوبصورت جذبہ ہمیں ایک دوسرے کے قریب لایا، وہ تو فنا ہو جائے گا۔ کچھ بھی نہیں بچے گا ہمارے پاس۔ آہستہ آہستہ ان دنوں کی صورت یادیں بھی مٹ جائیں گی.....“

”آدمی جو کچھ اتنی مشکلات سہہ کر سیکھے، اتنی آسانی سے بھول سکتا ہے؟“ راحیلہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”یہ یادیں“ یہ جذبات، یہ خوبصورت محسوسات پانی پر ستاروں عکس تو نہیں کہ پانی ذرا متلاطم ہوا تو مٹ جائیں.....“

”کچھ فائدہ نہیں راحیلہ۔ میں آنکھوں پر پٹی چڑھائے رکھتا ہوں۔ میں دیکھنا ہی نہیں چاہتا..... اعتراف کرنا بھی نہیں چاہتا کہ مجھے مدد کی ضرورت ہے۔ میں یہ اعتراف نہیں کروں گا کہ جب میں مشکل میں تھا تو میں نے مدد کے لئے ڈاکٹر لیوی سے نوع کلب۔ مجھ میں صرف احسان شناسی کا ہی نہیں، خودداری کا بھی فقدان ہے.....“

”جانتے ہو، ایسے ہی موقعوں پر مجھے تم پر ٹوٹ کر پیار آتا ہے۔ ایسے ہی لمحوں میں تم سے زیادہ محبت محسوس ہوتی ہے اور ایسے وقت میں میں تمہارے لئے سب کچھ کر سکتی ہوں۔ تم جو کچھ تسلیم کر سکتی ہوں..... جو طلب کرو، دے سکتی ہوں۔“

”شادی بھی کر سکتی ہو؟“

”اب؟ ہاں کر سکتی ہوں۔“

”اب کر سکتی ہو۔ کب سنے؟ یہ فیصلہ کب کیا تم نے..... اور کیوں کیا؟“

”بیت الجبل میں..... کوہ ہرمن کے اس غار والے واقعے کے فوراً بعد.....“

یوسف کے انداز میں بدگمانی ہویدا ہو گئی۔ ”یعنی وہ وقت‘ جب میں نے اپنی حماقت

کو تماشا بنا دیا تھا۔ اس بات سے اس واقعے کا کیا تعلق؟“

”یوسف غلط مت سمجھو۔“ زاحیلہ تقریباً چیخ اٹھی۔ ”یہ اس لمحے کی بات ہے“

ہوں۔“ وہ بولی ”میں تمہارے متعلق تمہارے انداز میں سوچ رہی ہوں۔“

”لیکن اس طرح بات نہیں بنے گی۔ ان چند ماہ میں بدلا کیا ہے؟ مختلف کیا ہوا ہے؟ بس اتنا کہ ہم دونوں غیر محسوس طور پر ایک دوسرے کے دل میں اتر گئے ہیں۔ اب ہم واپس جا رہے ہیں۔ میرے پاس اٹھارہ سو ڈالر ہیں، جو میں نے بچائے ہیں اور میں وطن بچپنوں کا تو پھر بے کار ہوں گا۔ تم تو پھر جینا کے ساتھ ہو گی۔ تمہاری جاب تو پکی ہے اور اگر جینا کی اصلاح ہو گئی ہے، اس کا جینے کا ہو کا ختم ہو گیا ہے تو اس سے تمہارا کام اور آسان ہو جائے گا۔ تو تم میکم مینشن میں ہو گی اور میں فلم پروڈیوسرز اور مدیروں کو بھگت رہا ہوں گا۔ یہی ایک کام آتا ہے مجھے۔ اب بتاؤ، ہم دونوں ایک ساتھ کہاں فٹ ہوتے ہیں؟“

”معلوم نہیں“ راجیلہ نے کہا..... لیکن فوراً ہی اضافہ کیا۔ ”لیکن مجھے یقین ہے کہ کہیں نہ کہیں ہم فٹ ہوتے ضرور ہیں۔“

”بہن آئزک کی طرف تمہارا جھکاؤ تو سمجھ میں آتا ہے۔ وہ حوصلہ مند ہے.....  
بہادر ہے.....“

”بعض معاملات میں تم بے جا طور پر خود کو کمتر سمجھتے ہو۔“ راحیلہ نے کہا ”اور سب سے بڑی بات یہ کہ تم عورتوں کو نہیں سمجھتے۔ میں نے تم سے ایک بار پہلے بھی کہا تھا کہ تم جتنے حوصلہ مند ہو، وہ میرے لئے بہت کافی ہے۔“

یوسف ہنس دیا ”شام میں صورت حال خراب ہوئی تو میں نے لڑنے کا کام دوسروں پر چھوڑ دیا اور خود ایک محفوظ جگہ منہ چھپا کر بیٹھ گیا۔ واقعی میں بہت حوصلہ مند اور بہادر آدمی ہوں!“

”اچھا..... ایسا ہوا تھا۔ مجھے تو یاد نہیں۔“ راحیلہ نے کہا ”مجھے تو اتنا یاد ہے کہ شدید فائرنگ کے دوران بھی تمہیں میرا اور پھوچی میکم کا خیال رہا تھا۔ تم نے ہم دونوں کے لئے اپنی زندگی خطرے میں ڈالی تھی۔“

یوسف کے لمبے میں اچانک وحشت در آئی ”میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے رزق کے کوپن میں کوئی گولی چھید کر ڈالے۔“

”تو کیا میں بھی تمہارے رزق کا کوین تھی؟“

یوسف کے یاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔

”تم اتنے سخت کیوں ہو یوسف؟“ راحیلہ نے پوچھا۔

اتھ..... تمہارے لئے جنم تک بھی جاسکتی ہوں، جاسکتی تھی۔ لیکن میں تم سے ادی نہیں کر سکتی تھی۔ یہ ممکن نہیں تھا اور یوسف عالم، اب تم کسی غار میں جا کر چھپ بس سکتے۔ اب تم خود کو بحیثیت ایک انسان دیکھ چکے ہو۔ خود کو اپنے ضمیر کی روشنی میں لکھ چکے ہو۔ تم نے دعا مانگی..... اللہ سے مدد طلب کی۔ اب تم اپنی دعا تو واپس نہیں لے سکتے۔“

یوسف تادیر خاموش بیٹھا رہا۔ اس کی نظریں اپنی گھڑی کے چمکیلے ڈائل پر پڑیں جانتی ہو، کیا وقت ہوا ہے؟“

نہیں..... کیا بہت دیر ہو گئی؟“

”پونے بارہ بجے ہیں۔“

”چلو..... واپس چلیں۔“

”لیکن مسئلہ تو حل نہیں ہوا۔“ یوسف نے کہا۔

”ہاں..... ہم کسی نتیجے پر نہیں پہنچے۔“

”یعنی ہم ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہیں لیکن ہمیں یہ نہیں معلوم کہ ہمیں کرنا کیا ہے؟“

”میں بہت دکھی ہو رہی ہوں یوسف!“

یوسف نے کشتی کا رخ کنارے کی جھاڑیوں کی طرف کر دیا۔ اس کے ہاتھوں میں خفیف سی لرزش تھی۔

کشتی کو انہی جھاڑیوں میں چھپا کر وہ راحیلہ کی طرف مڑا۔ اس نے راحیلہ کو اپنی

ہانہوں میں سمیٹ لیا۔ وہ بھی اس کے سینے سے چپک گئی۔ اس نے سر اٹھائے بغیر کہا۔

”بس اس سے آگے نہ بڑھنا یوسف۔ میں نہیں چاہتی کہ اچھا بننے کے اس مرحلے میں اپنی

برائی پر ہمیشہ کے لئے مہر لگا دیں۔“

”بے فکر رہو۔ ایسا نہیں ہو گا۔“ یوسف نے سرگوشی میں کہا۔

چند لمحے بعد وہ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کیمپ کی طرف چل دیے۔ وہ اپنے خیالوں

میں، اپنے اپنے خوف کے خول میں ترپ رہے تھے..... خود کو الزام دے رہے تھے۔



کیمپ میں غیر معمولی سرگرمی کے آثار دکھائی دیے۔ روشنی ہو رہی تھی بلکہ چہل

پہل نظر آ رہی تھی۔ وہ دونوں کچھ نہیں بولے لیکن ایک دوسرے کے ہاتھ پر ان کی

جب تم نے اعتراف کیا کہ تم کس قسم کے آدمی تھے..... جب تمہیں اپنا آپ برا رہا تھا..... جب.....“

یوسف نے تند لہجے میں اس کی بات کاٹ دی۔ ”اعتراف وہ لفظ ہے جو مجھ سے نکلا نہیں جاتا۔ میں نے خود کو تماشا بنا لیا کیونکہ میں اس وقت خوف زدہ تھا لیکن خواہ آدمی کو بدل نہیں سکتا بی بی۔ میں بدلا نہیں ہوں۔ اب بھی پہلے جیسا ہی ہوں اور یہ رہوں گا۔“

”تم غلط کہہ رہے ہو۔ تم بدل گئے ہو۔“

”مجھے ایک بات بتاؤ۔ اس رات سے پہلے میں تم سے شادی کو کتنا تو تم لیتیں؟“

جبلت راحیلہ کو وہ جھوٹ بولنے پر اکسا رہی تھی، جو یوسف سننا چاہتا تھا لیکن کا ضدی پن ہتھیار ڈالنے پر آمادہ نہیں تھا۔ اس کی زبان وہ جھوٹ بولنے پر تیار نہ تھی۔ اس نے ہونٹ بھیج کر کہا ”نہیں۔“

”کیوں بھلا؟“ یوسف کا لہجہ فاتحانہ تھا۔

اب راحیلہ کا قہقہہ جواب دینے لگا۔ اس محبت کا جو حشر ہو رہا تھا، اسے دیکھ کر کا وجود تلیوں سے بھر گیا۔ ”تم مجھے دشواریوں میں ڈال رہے ہو یوسف۔“ اس نے ”میں تمہیں تکلیف نہیں پہنچانا چاہتی۔“

”یقین کرو، دوسروں سے تکلیف پہنچانا میرے لئے کوئی نئی بات نہیں۔ کوئی! تکلیف پہنچانے سے ڈرے، گریز کرے، یہ البتہ نئی بات ہے۔ تم بے فکر ہو کر با کرو۔“

”عورت جب کسی سے محبت کرتی ہے۔ تب بھی اس کی کمزوریوں سے چنٹی ہے بعض باتوں کی وجہ سے وہ اسے برا بھی لگتا ہے۔ عورت میں تضادات بھی ہوتے ہیں اس کے اندر ساتھ ساتھ چلتے بھی رہتے ہیں.....“

”بکو اس! عورت جس سے محبت کرتی ہے تو بس محبت کرتی ہے بات ختم۔“ یوسف نے منہ بنا کر کہا ”اس کا محبوب کتنا ہی لفکا ہو، وہ اس سے محبت کرتی رہتی ہے.....“

”خدا کی پناہ! تم نہ صرف اپنی کمزوریوں کو اپنے لئے زنجیر بنا کر رکھتے ہو..... بلکہ ان میں جھنکار پیدا کرنا بھی تمہیں بہت اچھا لگتا ہے۔ کم از کم مجھے تو میری کمزوریاں چھپانے دو۔ میں کہہ چکی ہوں کہ میں کوئی اچھی لڑکی نہیں تھی۔ میں تمہارے“

ن لایا تھا اسے صرف موت ملی تھی۔

”چل کر بیٹھو“ میں تمہیں بتاتا ہوں۔“ ڈاکٹر لیوی نے کہا۔

وہ قریب ہی منڈیر جتنی اونچی دیوار پر بیٹھ گئے۔ سامنے ہی جھیل تھی جس پر ندی کھیت کر رہی تھی۔ یوسف نے سگریٹ سلگالی۔

”نوبیج کی بات ہے۔“ ڈاکٹر لیوی نے کہا ”میں کھانے کے بعد چل قدمی کر رہا تھا۔ جینا نے مجھے پکارا۔۔۔۔۔۔ ڈاکٹر لیوی یہ تم ہو؟ میں نے جواب دیا تو وہ بولیں۔ مجھے نیند بس آرہی ہے۔ پلیز۔۔۔۔۔۔ میرے پاس آ جاؤ۔

”میں ان کے ٹرائل میں چلا گیا۔ وہ تکتے لگائے بیڈ پر بیٹھی جھیل کو تک رہی تھیں۔ اندنی میں ان کے چہرے کے نقوش اور تاثرات بے حد واضح تھے مگر اندر گھٹن تھی۔ ان نے سوچا شاید گھٹن ہی کی وجہ سے انہیں نیند نہیں آرہی ہے۔“

”انہوں نے کیا کہا آپ سے؟“ یوسف نے پوچھا۔

ڈاکٹر لیوی جواب دینے سے پہلے ایک لمحے سوچا رہا۔ ”کچھ چیزیں۔۔۔۔۔۔ کچھ باتیں نہیں پریشان کر رہی تھیں۔ انسان جب بوڑھا ہو جاتا ہے تو یہ پریشانی اسے لازماً ہوتی ہے۔ وہ وقت ہوتا ہے جب اسے ایک ناقابل تردید حقیقت کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ وہ چاہتی تھیں کہ کوئی انہیں پر سکون کرے۔۔۔۔۔۔ یقین دہانی کرائے۔۔۔۔۔۔“

”آپ ان کی مدد کر سکتے؟“ راحیلہ نے پوچھا۔

ڈاکٹر لیوی نے جواب دینے کے بجائے اپنی بات جاری رکھی۔ ”ہم کافی دیر باتیں کرتے رہے۔۔۔۔۔۔ شاید ایک گھنٹے سے بھی زیادہ۔ ان کا چہرہ زرد ہو رہا تھا اور وہ بہت ٹھکی ہوئی لگ رہی تھیں۔ لیکن ان کے چہرے پر عجیب سی نرمی چھا گئی تھی۔ ان کے ہیلے ڈھالے ہاتھ پہلوؤں سے لگے ہوئے تھے۔ میں نے سوچا اب انہیں نیند آ جائے گی۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ آرام کریں، لیکن انہوں نے مجھ سے مزید ٹھہرنے کے لئے کہا۔ میں بیٹھا رہا۔ کچھ دیر بعد انہوں نے کہا۔ ڈاکٹر لیوی پلیز۔۔۔۔۔۔ میرا ہاتھ تھام لو، میں نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔۔۔۔۔۔“

”انہوں نے مرنے سے پہلے کچھ کہا؟“ یوسف نے پوچھا۔

”وہ دو مرتبہ بولی تھیں۔ ایک بار انہوں نے آہ بھر کر کہا ”زندگی میں اس سے پہلے اتنی پرسکون کبھی نہیں تھی۔ انہوں نے آنکھیں موند لیں۔ کچھ دیر بعد انہوں نے آنکھیں کھولیں، مجھے دیکھا اور بولیں، ڈاکٹر لیوی میں یہیں رہوں گی۔ یہ کہہ کر انہوں نے پھر

گرفت اور مضبوط ہو گئی۔ غیر ارادی طور پر ان کے قدموں کی رفتار بڑھ گئی۔

چاند اور اوپر چڑھ آیا تھا۔ چرچ کے ساتھ والا باغ چاندنی میں نمایا ہوا تھا۔ انہیں ڈاکٹر لیوی نظر آیا۔ وہ فادر ہوفستار کے ساتھ تھا۔۔۔۔۔۔ وہ دونوں دھیمی آواز میں گفتگو کر رہے تھے۔ انہیں آتے دیکھا تو خاموش ہو گئے۔ ان کے چروں پر تناؤ تھا۔

راحیلہ کا ہاتھ بے اختیار اپنے سینے پر پہنچ گیا۔ ”کیا بات ہے ڈاکٹر لیوی؟“ اس نے بلند آواز میں پوچھا۔ اس کا لہجہ اس کی اعصاب زدگی کا مظہر تھا۔

ان دونوں نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ ”بیٹے۔۔۔۔۔۔ خود کو صدمے کے لئے تیار کر لو۔ بہت افسوس ناک اور اداس کن خبر۔۔۔۔۔۔“ ڈاکٹر لیوی نے کہا۔

یوسف آگے بڑھ آیا جیسے راحیلہ کو تحفظ فراہم کر رہا ہو۔ وہ سمجھ گیا تھا۔ دوسری طرف راحیلہ بھی جان گئی تھی کہ کیا بات ہے لیکن آدمی سب کچھ جاننے کے باوجود بھی اس کی ڈوری نہیں چھوڑتا۔ وہ پھر بھی پوچھتا ہے۔ سو راحیلہ نے بھی پوچھا۔ ”کیا پوچھی میکم کی طبیعت خراب ہو گئی ہے؟“

ڈاکٹر لیوی نے نرم لہجے میں کہا ”وہ چلی گئی ہیں۔“

یوسف نے راحیلہ کے جسم میں لرزش محسوس کی اور اس کا ہاتھ اور مضبوطی سے تھام لیا۔ ”چلی گئیں؟ لیکن کہاں؟“ اس نے پوچھا۔

”مجھے افسوس ہے ایک گھنٹا پہلے مس میکم انتقال کر گئیں۔“

راحیلہ نے یوسف سے ہاتھ چھڑایا اور دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔ ”نہیں۔۔۔۔۔۔ میرے خدا۔۔۔۔۔۔ نہیں!“ وہ بڑبڑا رہی تھی۔

فادر ہوفستار نے آگے بڑھ کر راحیلہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”وہ کوئی تکلیف اٹھائے بغیر چلی گئیں۔ ٹائبریس سے ڈاکٹر آ رہا ہے لیکن وہ موت کی تصدیق کے سوا کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ بہت تھک گئی تھیں مگر اب وہ بہت سکون سے ہیں۔“ یہ کہہ کر فادر ہوفستار پلٹے اور چلے گئے۔

آخر کار یوسف نے خاموشی توڑی اور ڈاکٹر لیوی سے مخاطب ہوا۔ ”ہوا کیا۔۔۔۔۔۔ طبیعت خراب ہو گئی تھی ان کی؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔“ وہ احساس جرم کا شکار ہو رہا تھا۔ اس کے لئے یہ بہت بڑا شاک تھا۔ اسے سب کچھ یاد آیا، اس کی نگاہوں میں ہر منظر پھر گیا۔ کیسی ستم ظریفی تھی۔ وہ جس عورت کو ابدی زندگی کا خواب دکھا کر

”لیکن.....“ یوسف نے کچھ کہنا چاہا تھا.....

بین آزرک نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”وہ مجھے چھوڑ کر کبھی نہ جاتیں۔“

”مرنے والے کی آخری خواہش کا احترام ضروری ہوتا ہے۔“ راحیلہ نے کہا تھا۔

یوسف نے مستفسرانہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”ان کے آخری الفاظ یاد کرو یوسف!“ راحیلہ نے کہا۔ ”انہوں نے کہا تھا.....“

کٹر لیوی میں بیس رہوں گی۔“

یوں یہ مسئلہ طے ہوا تھا اور اب جینا میلکم انتبیغہ میں منوں مٹی کے نیچے سو رہی

ی۔

راحیلہ نے چلتے چلتے یوسف کو دیکھا۔ وہ وہی کالی چادر کندھوں پر الے ہوئے تھا

راے احساس بھی نہیں تھا کہ وہ بار بار انگلیوں سے اسے سلالتا ہے۔ وہ عام سی چادر

ی۔ اچانک راحیلہ کی نظر چادر کے بارڈر پر باریک کڑھائی میں لکھے ایک لفظ پر پڑی۔ وہ

من اتفاق تھا کیونکہ کڑھائی سرمئی دھاگے سے کی گئی تھی اور وہ چادر بہت پرانی تھی،

س کا رنگ بہت پھیکا پڑ گیا تھا۔ وہ سرمئی حروف تو نئی چادر پر بھی آسانی سے نظر نہیں

تے ہوں گے۔

یوسف نے جھاڑیوں سے وہ کشتی نکال لی اور جھیل میں اتاری..... دونوں

منے سامنے بیٹھ گئے۔ دونوں خاموش تھے..... اپنے اپنے خیالوں میں کھوئے ہوئے۔

راحیلہ متاسف تھی۔ جینا میلکم دنیا میں اس کی واحد رشتے دار تھی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا

بے آج ہی اس کے ماں اور باپ دونوں مرے ہوں۔

”بہت اداس ہو راحیلہ؟“ یوسف نے پوچھا۔

”ہاں.....“ صرف اداسی ہی رہ گئی ہے۔ باقی سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔ اداسی بھی

تم ہو جائے گی۔ باقی تو کچھ بھی نہیں رہتا۔“

یوسف نے سگریٹ سلگالی۔ ”صورت حال اور دشوار ہو گئی ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”میرا اشارہ اسی صورت حال کی طرف ہے، جو پچھلی بار بھی جوں کی توں رہ گئی

نہی۔“

راحیلہ اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ یوسف ان نظروں کا مفہوم سمجھ

میں پا رہا تھا۔ ”میرا بھی یہی خیال ہے لیکن میں نے جب سے اب تک اس سلسلے میں

آنکھیں موند لیں اور پرسکون ہو گئیں۔ لگتا تھا، سو رہی ہیں۔ میں مزید چند رہ منٹ بیٹھا رہا

کہ ان کی نیند پکی ہو جائے تو انھوں.....“ وہ کہتے کہتے رکا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب

سی آسانی نری اتر آئی۔ ”لیکن جب میں نے اپنا ہاتھ چھڑایا تو مجھے ایک احساس نے چونکا

دیا۔ میں نے غور سے انہیں دیکھا تب مجھے احساس ہوا کہ اب کوئی ان کی نیند خراب نہیں

کر سکے گا۔“

ڈاکٹر لیوی کے خاموش ہونے کے بعد بھی دیر تک خاموشی رہی۔ پھر راحیلہ نے

پوچھا۔ ”میں جا کر انہیں دیکھ سکتی ہوں؟“

”ہاں۔ کیوں نہیں؟“ ڈاکٹر لیوی نے جواب دیا۔

راحیلہ اٹھی اور ٹرالر کی طرف چل دی۔ یوسف اسے جاتے دیکھتا رہا۔ پھر وہ ڈاکٹر

لیوی کی طرف مڑا۔ ”کیا یہ مناسب ہو گا؟“

”کیا؟“

”راحیلہ کا وہاں جانا۔“

”ہاں۔ اسے جانا ہی چاہئے۔“

کچھ دیر بعد راحیلہ ٹرالر سے نکلی۔ یوسف ڈاکٹر لیوی کو وہیں چھوڑ کر اس کی

طرف بڑھ گیا لیکن راحیلہ کے چہرے کے تاثر نے اسے ہلا دیا۔ ”کیا بات ہے راحیلہ؟“

اس نے پریشان ہو کر کہا ”کیا تمہیں رونا بھی نہیں آ رہا ہے؟“

راحیلہ نے اسے یوں دیکھا، جیسے اس کی بات سمجھنے سے قاصر ہو۔ ”روؤں.....“

لیکن کیوں؟ وہ تو اتنی پرسکون..... اتنی خوش ہیں.....“

○-----○-----○

آخری رسومات بہت سادگی سے ادا کی گئیں۔ تدفین انتبیغہ کے قبرستان میں

ہوئی۔ بین آزرک، ڈاکٹر لیوی کے ساتھ رہا۔ راحیلہ اور یوسف ایک ان دیکھی ڈور سے

بندھے ساتھ ساتھ تھے۔ اگرچہ دونوں خاموش تھے۔

تدفین کے بعد ایک خاموش تقسیم کے تحت دونوں کے قدم ایک ساتھ جھیل کے

مشرقی کنارے کی طرف اٹھنے لگے۔

جینا میلکم کی گیلی لی میں تدفین راحیلہ کی ذمے داری پر ہوئی تھی۔ لاش کو وطن

واپس لے جانے کے انتظامات کی بات چلی تو وہ بھڑکی۔ ”نہیں..... وہ ہمیں دفن ہوں

گی۔ جی خوشی اور حقیقی سکون انہیں ہمیں تو حاصل ہوا تھا۔“



سوچا نہیں....." وہ بولی۔

”تم مجھ سے محبت کرتی ہو؟“ یوسف نے اکھڑ لہجے میں پوچھا۔

”ہاں یوسف۔ کتنی بار سننا چاہتے ہو یہ بات؟“

”مجھ سے شادی کرو گی؟“

راجیلہ کے ہونٹوں کے کناروں پر بے حد خوبصورت مسکراہٹ پھوٹی ”پرہیز پوز کر رہے ہو؟“

”ہاں۔“

”تو میرا جواب بھی ہاں میں ہے۔ میں تم سے شادی کروں گی۔“

”مذاق مت کرنا بخشی آنکھوں والی۔ اب تم اربوں کی جائیداد کی وارث ہو۔“

”تو کیا تمہیں دولت سے شادی کرتے ہوئے خوف آ رہا ہے؟“

”نہیں۔ یہ تصور تو میرے لئے خوش آئند ہے لیکن تم اس پوزیشن میں مجھ جیسے لفٹے اور پھکڑ آدمی سے شادی کرو گی، تو یہ بے وقوفی کہلائے گی۔ خواہ تمہیں مجھ سے محبت ہو۔ جلد یا بدیر تمہیں پچھتاوا ہو گا۔ پھر تم مجھے دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال پھینکو گی۔ ہم دونوں کے لئے بہتری یہی ہے کہ تم مجھے ابھی ٹھکرا دو۔ مجھے عیاشات کی عادت ہو گئی تو پھر میرے لئے وہ بہت تکلیف دہ ہو گا۔“

راحیلہ کی مسکراہٹ معدوم ہو گئی، اس نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک کاغذ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ ”یہ پڑھ کر تمہیں اطمینان ہو جائے گا بھادر انسان۔“ اس نے کہا۔ ”یہ چھوٹی میلکم کا وصیت نامہ ہے۔“

یوسف نے مختصر وصیت نامہ پڑھا۔ اس پر گواہوں کی حیثیت سے ڈاکٹر لیوی اور بین آنزک کے دستخط تھے۔ وصیت کے مطابق جینا نے اپنی تمام منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد حکومت پاکستان کے نام کر دی تھی اور امید ظاہر کی تھی کہ اس سے پوری قوم کو فائدہ پہنچے گا۔ وصیت نامے میں لکھا تھا کہ چند روز پہلے جینا نے اپنے وکیل کو جو ہدایات بھیجی ہیں، ان پر پوری طرح عمل کیا جائے۔

یوسف حیران رہ گیا۔ موت سے اتنے قریب جینا میٹکم کو صرف اپنے ملک اور قوم کا احساس تھا۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی اور اس کی حب الوطنی کا ثبوت تھا ”لیکن یہ تو انہوں نے تمہارے ساتھ بہت زیادتی کی۔“ چند لمحے کی خاموشی کے بعد یوسف نے کہا۔ ”تم نے تو اپنی زندگی انہیں سونپ دی تھی، حاصل کچھ بھی نہیں۔“

”یہ بات نہیں۔ انہوں نے میرے نام سے ایک ٹرسٹ قائم کر دیا تھا۔ اس کی آمدنی میری ہے..... تاحیات!“

یوسف خاموش رہا۔ وہ مطمئن اور پرسکون ہو گیا تھا لیکن اس نے اپنے انداز سے یہ بات ظاہر نہیں ہونے دی تھی۔ وہ راحیلہ کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا، جس کے چہرے پر عجیب سا تاثر تھا..... جیسے اس نے اپنی بات پوری نہیں کی ہو۔

اس کا اندازہ درست تھا کیونکہ ایک لمحے کے بعد راحیلہ نے کہا ”یعنی تمہیں ایک دولت مند عورت کا کھلونا بننے کا ڈر نہیں ہونا چاہئے۔ تمہیں تو ایک غریب اور مفلس لڑکی سے شادی کرنی ہے۔“

یوسف کی آنکھوں میں استعجاب جھلکا۔ ”کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں!“

”پھوپھی میلکم مجھے کھونے کا کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتی تھیں۔ میرے سر پر تین شرائط انہوں نے تلواری طرح لٹکا دی تھیں۔ پہلی..... اگر وہ مجھے ڈس کر دیتیں تو ٹرسٹ خود بخود ختم ہو جاتا۔ دوسری..... اگر میں اپنی مرضی سے انہیں چھوڑتی تو بھی ٹرسٹ ختم ہو جاتا.....“ وہ کہتے کہتے رک گئی۔

”اور تیسری؟“ یوسف نے پوچھا۔

”تیسری شرط کی تلواریں اب بھی موثر ہے۔ میں شادی کروں گی تو ٹرسٹ خود بخود ختم ہو جائے گا۔“

یوسف چند لمحے اسے بے یقینی سے دیکھتا رہا ”کیا یہ سچ ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں۔ تمہیں بہت مانوسی ہوئی ہے یوسف؟“

”نہیں۔ لیکن مس نیلکم کی سوچ پر افسوس ہوا ہے۔ وہ تم سے اپنی بنجر زندگی کا

انتقام لے رہی تھیں۔ اللہ انہیں معاف کرے۔“

راحیلہ نے نفی میں سر ہلایا ”نہیں“ ایسی کوئی بات نہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ وہ ذہنی طور پر بیمار تھیں اور پھر میں نے وہ سب کچھ خود قبول کیا تھا۔ انہوں نے میرے ساتھ کوئی زبردستی تو نہیں کی تھی۔“

”تم کم عمر تھیں، نہیں جانتی تھیں کہ کیا کر رہی ہو۔“

راجیلہ نے کہا ”مجھے یقین تھا کہ وہ کسی نہ کسی دن مجھے اس قید سے آزاد کر دیں گی۔ مجھے یہ بات محسوس ہوتی تھی مگر انہیں وطن واپس جانے کا اور کچھ بھی تبدیل کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ میں جانتی ہوں، اپنے انداز میں سہی، وہ مجھ سے محبت کرتی تھیں۔

کرتے دیکھ رہا تھا..... صبح سے شام تک ان تھک محنت! اور حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس میں اسے کشش محسوس ہو رہی تھی۔ پہلی بار اسے احساس ہو رہا تھا کہ وطن کے وہ عام اور غیر اہم لوگ..... وہ گمنام لوگ درحقیقت کتنے اہم ہیں۔

اس نے سوچا شاید وقت آگیا ہے کہ اب میں زندگی کو بے وقوفوں کے نقطہ نظر سے دیکھوں اور گزاروں۔ یہ نیا تجربہ بھی سہی۔

لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ خود کو ہلانے والی بات ہے۔ درحقیقت وہ تبدیل ہوا تھا اور آدمی دنیا سے لڑ سکتا ہے مگر اپنے آپ سے نہیں لڑ سکتا۔ وہ اپنی روح میں جھانکنے کے تجربے سے گزر چکا تھا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ زندگی کے جس رخ سے وہ خوف کھاتا رہا تھا، اب وہی رخ اسے اچھا لگ رہا تھا۔

اس نے خود سے کہا کہ اب وہ پہلے جیسی زندگی نہیں گزار سکتا۔ وہ زندگی بھر دیانت داری اور بے ایمانی کی سرحد پر تھی ہوئی رسی پر بازی گروں کی طرح چلتا رہا تھا کہ یہی اس کا مزاج تھا لیکن اب اسے نئی طاقت، نئی توانائی میسر تھی۔ اب اسے نہ صرف اپنا سامنا کرنا تھا بلکہ راحیلہ بھی تھی، اور وہ نہ خود سے شرمندہ ہونا چاہتا تھا، نہ راحیلہ سے۔ پھر بھی وہ چند لمحے خود سے، اپنے فیصلے سے لڑتا رہا۔ فطرت ثانیہ بھی اپنی طاقت میں فطرت سے بہت قریب پہنچ جاتی ہے۔ اس نے اپنی تبدیلی پر راحیلہ کو مورد الزام ٹھہرایا، وہ اس سے زیادہ کمزور تھی، اسی لئے اس نے فیصلے کا بوجھ اس پر ڈال دیا تھا۔ اس نے اسے ترغیب دی تھی کہ ٹرسٹ کی دولت کو بچانے کے لئے وہ شادی کرنے کے بجائے بغیر شادی کئے ازدواجی زندگی گزاریں۔

ہاں..... راحیلہ کمزور تھی لیکن انسان تو کمزور ہوتا ہے۔ یہی بشریت ہے اور راحیلہ کی کمزوری یوسف کے لئے قوت بخش تھی۔ بالکل ویسے جیسے اس کی کمزوری نے راحیلہ کو قوت دی تھی۔ اس نے جان لیا کہ وطن پہنچ کر وہ دونوں زندگی کی جدوجہد ایک دوسرے کے شانہ بشانہ کر سکیں گے۔

اس نے نگاہیں اٹھا کر سامنے بیٹھی راحیلہ کو دیکھا۔ وہ خوبصورت، بے حد خوبصورت لڑکی، جو اس کی خاطر سب کچھ کرنے کو تیار تھی، نظروں میں الجھن لئے خاموشی سے اسے تنک رہی تھی۔ وہ اس کے جواب کی منتظر تھی۔

راحیلہ نے نظریں جھکا لیں۔ یوسف مسکرایا اور اس نے ہاتھ بڑھا کر انگلیوں سے اس کی ٹھوڑی کو اوپر اٹھایا ”نہیں بی بی!“ اس نے کہا ”میں اپنے بچوں کو جائز باپ دیتا

انہیں میری پروا تھی۔“

”بہر حال اب تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ ہے نا؟ شادی ہوتے ہی ٹرسٹ ٹوٹ جائے گا۔“

”ہاں۔ اب بتاؤ، تم اب بھی مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو؟“

یوسف نے کوئی جواب نہیں دیا، بس اسے گھورتا رہا۔

راحیلہ نے کہا ”ایک صورت اور ہے۔ میں تم سے محبت تو نہیں چھوڑ سکتی۔ ہم خفیہ طور پر شادی کر لیں گے۔ اس طرح ٹرسٹ کا فنڈ ہمارا رہے گا۔ اگر تم چاہو تو میں اس پر بھی تیار ہوں۔ لیکن فیصلہ اب تمہیں کرنا ہے۔ باقاعدہ شادی کی صورت میں ہم فلاح ہوں گے۔“

یوسف اپنے دونوں ہاتھوں کو دیکھتا رہا۔ پھر وہ نظریں اٹھائے بغیر بولا ”مجھے دولت کی ہمیشہ پروا رہی ہے۔ میرا تجربہ ہے کہ دولت بڑی چیز ہے۔ دولت ہو تو حوصلہ بلند رہتا ہے۔ آدمی شرافت سے نفیس زندگی گزار سکتا ہے۔ اپنا پیٹ بھرا ہو تو دوسروں کی فکر کی جا سکتی ہے..... دکھ بانے جا سکتے ہیں۔ دولت کو کوئی بے وقوف ہی ٹھوکر مار سکتا ہے۔“ اس نے نظریں اٹھا کر راحیلہ کو دیکھا۔ ”تم نے مجھے زبردست پیش کش کی ہے..... تم بھی اور دولت بھی، دونوں مجھے مل رہی ہیں۔ اس پیشکش کو کوئی بیوقوف ہی ٹھکرا سکتا ہے۔ ہے نا؟“

راحیلہ نے اس کی چیخ کرتی ہوئی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ”ہاں..... یہ تو ہے۔ تم ایسا کرو گے تو بے وقوفی ہی کرو گے۔“

”تم اپنی بھی تو کہو۔ ہم دونوں ہی وقت کے تربیت کردہ انسان ہیں۔ ہم بے وقوف نہیں۔ تمہیں ایک ایسے شخص کے ساتھ زندگی گزارنا، غربت کے خلاف جدوجہد کرنا اچھا لگے گا، جس کی کمانے کی صلاحیتیں مشکوک ہیں۔ تم نے بھی یہ تو سوچا ہو گا۔ ایک میسر ہے تو کھایا کیوں نہ جائے۔“

”میں نے سوچا ہے، اسی لئے تو وہ تجویز پیش کی ہے۔ لیکن فیصلہ تمہیں کرنا ہے۔ میں تمہارے ہر فیصلے کو قبول کروں گی۔ جو تم کو گے وہ کروں گی۔ اب تم سوچو اور فیصلہ کرو۔“

یوسف اس کے کہنے سے پہلے ہی سوچنے میں مصروف تھا۔ اور جو کچھ وہ سوچ رہا تھا، وہ خود اس کے لئے عجیب تھا۔ وہ اپنے وطن کے عام لوگوں کی طرح خود کو ہر عام کام

چاہتا ہوں اور میں انشاء اللہ ان کی پرورش رزق حلال سے کروں گا۔ ٹرسٹ کو بھول جاؤ۔ ہم شادی کریں گے۔“

راحیلہ نے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھاما اور اپنی پیشانی سے لگا لیا۔ یوسف کو چند لمحے بعد اس کے آنسوؤں کا احساس ہوا۔ ”کیا میں نے غلط جواب دے دیا؟“ اس نے پوچھا۔

راحیلہ نے نفی میں سر ہلایا اور اس کے ہاتھ کو اور سختی سے بھیجنے لیا۔ ”یہ طمانیت کے آنسو ہیں یوسف! تم نے ہر مسئلہ حل کر دیا۔ جہاں میں کمزور ہوں، وہاں تم طاقتور ہو تو مجھے کبھی خوفزدہ نہیں ہونا پڑے گا۔ میں اب زندگی میں کسی چیز سے نہیں ڈروں گی۔“ وہ خاموش ہو گئی۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے پوچھا۔ ”تمہیں یقین ہے ناکہ تم خوش رہو گے؟ دیکھو نا..... ہمیں از سر نو زندگی گزارنا ہوگی۔“

یوسف نے گہمیر لہجے میں کہا ”نہیں..... مجھے ذرا بھی یقین نہیں لیکن میں چاہتا بی بی ہوں۔ لہذا میں خوشی کے تصور سے دستبردار ہو کر نئی زندگی کا آغاز کروں گا۔ پھر جو خوشی ملے گی، وہ بونس ہوگی۔ نہ ملی تو افسوس نہیں ہوگا۔“

راحیلہ اسے محبت پاش نظروں سے دیکھتی رہی۔ اتنے سچے جواب کی اسے توقع نہیں تھی۔ یوسف اب پھر اپنی چادر کو سہلا رہا تھا۔ راحیلہ نے پوچھا ”یہ چادر.....“

”یہ چادر میری ماں کی ہے۔“

”اور یہ اس پر جو نام لکھا ہے..... طاہر؟“

”کون سا نام؟“

راحیلہ نے چادر تھام کر اسے دکھایا۔ وہ حیران رہ گیا ”میری نظر پہلے کبھی اس پر نہیں پڑی تھی۔“

”تمہارے والد کا کیا نام تھا؟“

”مجھے نہیں معلوم۔“ یوسف نے کہا ”بس میں نے ماں کی یہ نشانی سنبھال کر رکھ لی تھی۔ کبھی عدم تحفظ کا احساس بڑھ جائے تو اسے نکال کر اوڑھ لیتا ہوں۔ یہاں برسوں بعد نکلی ہے یہ چادر۔ میں نہیں چاہتا کہ یہ ختم ہو..... پھٹ جائے۔“

”مجھے اپنی ماں کے متعلق بتاؤ۔“ راحیلہ نے کہا۔

یوسف کہیں کھو سا گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے بولنا شروع کیا۔ راحیلہ محویت سے سنتی رہی۔

○-----○-----○

حیفہ پہنچنے سے پہلے انہوں نے قتل ایب میں بہت وقت گزارا۔ وہاں کا ہر قاتل ذکر تمام دیکھا۔ یوسف کا جی چاہتا تھا کہ وہ اس شہر کے چپے چپے سے واقف ہو جائے۔ حیفہ پہنچے تو انہوں نے ہوٹل میکیدو میں قیام کیا۔ اگلے روز ان کی روانگی تھی۔ راحیلہ سامان پیک کر رہی تھی کہ بین آئزک نے دروازے پر دستک دی۔ ”میں آسکتا ہوں؟“

”آؤ بین آئزک۔“

بین آئزک خاکی جیکٹ اور خاکی نیکر پہنے تھے۔ وہ پہلے سے دبلا اور زیادہ عمر کا لگ رہا تھا۔ جینا کی موت کا اس نے بہت زیادہ اثر قبول کیا تھا۔ وہ ایک صندوق پر بیٹھ گیا اور راحیلہ کو دیکھتا رہا ”میں بہت اداس ہوں راحیلہ۔ تمہیں رخصت کرنا اداس کن مرحلہ ہے۔ کبھی واپس آؤ گی؟“

”مشکل ہی ہے بین!“

”کیا یہ سچ ہے کہ تم جوزف سے شادی کر رہی ہو؟“

”ہاں۔“

”اس کے ساتھ خوش رہ سکو گی؟“

”کچھ کہا نہیں جاسکتا لیکن سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ہم دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت ہے۔ ہم ایک دوسرے سے جدا نہیں رہ سکتے۔ یہ احساس بجائے خود ایک بہت بڑی خوشی ہے۔“

”ٹھیک کہہ رہی ہو۔ مجھے رشک آ رہا ہے اس پر۔“

”اور تم بین آئزک؟“

بین آئزک جواب دینے سے پہلے چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ ”انکل نتھانیل نے ڈان کے قریب مجھے ایک فارم خرید دیا ہے۔ ایڈ ایوری اور شلومو بھی وہیں قریب ہی رہتے ہیں۔ میں وہاں گندم اور مکئی کی کاشت کروں گا۔ میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گا، تم سے ہمیشہ محبت کروں گا.....“

راحیلہ اسے متجسس نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

”..... اور ایک روز وہ محبت میرے دل کے ایک گوشے میں منتقل ہو جائے گی۔“ بین آئزک کہتا رہا۔ ”میں یہاں کسی لڑکی سے ملوں گا..... وہ مجھے اچھی لگے گی۔“

”نہیں بچا جاسکتا۔ دیکھو، ایک طرف تمام مغربی طاقتیں ایک فریق کی پیٹھ تھپک رہی ہوں تو دوسرا فریق احساس کتری اور بے بسی میں ضرور مبتلا ہو کر رہے گا اور دوسری طرف عالمی طاقت بے بس فریق سے کہے کہ تم جنگ نہیں لڑ سکتے لہذا دہشت گردی کرو تو کیا ہوگا۔ یہ برا کھیل ہے۔ ایک طرف سے زیادتی ہوتی رہے تو عالمی ضمیر اسے کب تک برداشت کر سکے گا؟ لیکن دوسرا فریق دہشت گردی پر اتر آئے۔ معصوم لوگوں کو، عورتوں اور بچوں کو دہشت گردی کا ہدف بنایا جائے تو دنیا کی نظر میں ظالم مظلوم نہیں ہو جائے گا۔ یہ فعل ہمہ گیر نتائج کا حامل ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ دہشت گردی، مہادری اور شجاعت کو کھا جاتی ہے۔ پھر مظلومیت، مظلومیت نہیں رہتی۔ دہشت گردی کی وجہ سے رائے عامہ اس کے خلاف ہو جاتی ہے۔ ظالم مظلوم کی حیثیت سے سامنے آتا ہے۔ جو مظلوم کے ساتھی ہوتے ہیں، وہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ مظلوم غلطی پر ہے اور اگر وہ جانب داری برتیں تو ضمیر کے اعتبار سے خسارے میں رہتے ہیں۔ غرض ہر طرف کنفیوژن پھیل جاتا ہے اور جہاں کنفیوژن ہو، وہاں کوئی مثبت نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ یہ ہے مغرب کی نئی لائن آف ڈیپلومیسی، جس کا توڑ کرنے کے بجائے مشرق جس کا کھلونا بنا ہوا ہے۔ امریکا اور روس نے مل کر سب سے بڑا کام یہ کیا ہے کہ مشرق وسطیٰ کے اسلامی ملکوں کو اس کے مرکز یعنی اسلام سے ہٹا دیا ہے۔ خیر..... چھوڑو ان باتوں کو۔ یہ بتاؤ اب تم کیا کرو گے؟“

”وطن واپس جاؤں گا، کوئی کام تلاش کروں گا اور اس میں جت جاؤں گا۔“

”کبھی موقع ملے تو آنا۔ ہم تمہیں یاد رکھیں گے۔“

”آپ جانتے ہیں کہ یہ تقریباً ناممکن ہے.....“

”لیکن ایک بار ممکن ہو چکا ہے۔“ ڈاکٹر لیوی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے ہاتھ ملایا۔ ڈاکٹر لیوی نے کہا ”السلام علیکم۔“

○-----○-----○

جہاز روانہ ہو گیا تھا۔ یوسف اور راحیلہ ریٹنگ سے لگے کھڑے تھے۔ ڈاکٹر لیوی اور بین آنزک ڈوک پر کھڑے تھے۔ وہ ہاتھ ہلا رہے تھے۔ جہاز آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ یوسف اور راحیلہ بھی ہاتھ ہلا رہے تھے۔ منظر دور ہوتا رہا۔ اب وہ ننھے ننھے سیاہ نقطے سے لگ رہے تھے۔ لیکن یوسف اور راحیلہ سے ریٹنگ سے نہیں ہٹا گیا۔

میں اس سے محبت کروں گا۔ شادی کروں گا..... وہ اور میں..... مل کر کام کریں گے۔ زمین کی گود بھر دیں گے۔ میرے بچے.....“

○-----○-----○

یوسف کی ڈاکٹر لیوی سے آخری گفتگو ہوٹل میگیڈو کے ریسٹورنٹ میں ہوئی۔ بندرگاہ روانہ ہونے سے پہلے وہ وہاں کچا ہوئے تو انہوں نے کافی منگوائی۔ ”آپ اب کیا کریں گے..... کہاں جائیں گے؟“ یوسف نے پوچھا۔ ”وہی، جو پہلے کر رہا تھا۔ مینا جاؤں گا اور سبزیاں اگاؤں گا۔“ یوسف مسکرایا۔ ”تو یہ سچ ہے کہ ڈاکٹر نتھانیل لیوی کو اسرائیل میں ایک ہی حیثیت پسند ہے..... کسان کی؟“

”ہاں، یہ سچ ہے۔ اب کچھ اور کرنے کو جی ہی نہیں چاہتا۔“

یوسف اس سے تبدیلی مذہب پر گفتگو کرنا چاہتا تھا لیکن جانتا تھا کہ یہ مناسب نہیں ہے۔ یہ آدمی کا بے حد ذاتی معاملہ ہوتا ہے۔ وہ خود چاہے تو بتا دے، کسی کو پوچھنا نہیں چاہئے۔ ویسے بھی وہ وقت ایسی نازک گفتگو کے لئے مناسب نہیں تھا ”آپ کو توقع ہے کہ اس سرزمین پر امن قائم ہو سکے گا؟“ اس نے پوچھا۔

”دیکھو، امن اگر میرے، تمہارے، ہم جیسے عام لوگوں کے بس میں ہوتا تو دنیا میں امن ہی امن ہو۔“ ڈاکٹر لیوی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا ”لیکن عام انسان تو ہر دور میں کچھ پتلی بنے رہے ہیں۔ اس دور میں طریقہ استعمال بدل گیا ہے۔ اب جمہوریت کے نام پر اسے کچھ پتلی بنایا جاتا ہے۔ ہر جگہ سیاست کارفرما ہے۔ لیڈر دوسری جنگ عظیم کے بعد سے ڈرنے بھی لگے ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ جنگ کے بغیر وہ عالمی سطح کے لیڈر نہیں بن سکتے۔ یہ بات طے ہے کہ جنگ عظیم کے بعد مغرب نے فیصلہ کر لیا کہ اب جنگ کا میدان مغرب نہیں مشرق ہوگا۔ اس خوف کے تحت..... اور اس یقین کے تحت کہ تیسری عالمی جنگ بھی ہو کر رہے گی، انہوں نے مشرق میں مسائل تخلیق کئے۔ جس مسئلے کی طرف تم نے اشارہ کیا ہے، وہ مغرب ہی کا تخلیق کیا ہوا ہے۔ وہ چاہتے ہی نہیں کہ یہاں امن رہے اور ان کے پاس ہر طرح کی قوت ہے..... وسائل ہیں۔ سو یہاں امن قائم نہیں ہو سکتا دیکھ لیتے۔ تیسری عالمی جنگ کا آغاز یہیں سے ہو گا لیکن تباہی سے مغرب بھی نہیں بچ سکے گا۔“

”لیکن اس سے بچا تو جاسکتا ہے؟“ یوسف نے کہا۔

یوسف نے کن آنکھوں سے برابر کھڑی راحیلہ کو دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ کیا سوچ رہی ہے۔ شاید وہ دونوں ایک ہی بات سوچ رہے تھے۔..... مستقبل کے بارے میں۔ یہ کہ اب وہ زندگی کہاں سے شروع کریں گے۔..... کس طرح شروع کریں گے۔ ان کے پاس حوصلے، عزم اور اچھا بننے کی امنگ کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔

مگر انہیں ایک بات معلوم نہیں تھی۔ جینا نے آخری بار انتبیغہ سے..... اپنی موت سے چند روز پہلے جو خطوط براستہ امریکا وطن بھجوائے تھے، ان میں ایک اس کے وکیل کے نام تھا۔ اس خط میں جینا نے واضح کیا تھا کہ وہ راحیلہ کے ٹرسٹ کے سلسلے میں شادی والی شق سے دستبردار ہو رہی ہے۔ اب اگر راحیلہ شادی کر بھی لے تو ٹرسٹ نہیں ٹوٹے گا۔ اس کے علاوہ اس نے یوسف کو پانچ لاکھ روپے ادا کرنے کی ہدایت دی تھی۔ یہ بھی اچھا ہی تھا کہ انہوں نے ایک دوسرے کو مفلس اور فلاح کی حیثیت میں قبول کر لیا تھا۔ ورنہ وہ تمام عمر نہ ایک دوسرے پر اعتماد کر پاتے نہ خود پر۔ یہی سوچتے کہ اس قبولیت کے پیچھے دولت کی کشش تھی۔

جماز سان فرانسکو کی طرف بڑھتا رہا۔ وہاں سے انہیں فوراً ہی وطن روانہ ہونا تھا۔ تلاش ذات کے سفر کا ایک مرحلہ طے ہو چکا تھا۔



ختم شد